

اسلامی مذاہب

(المذاهب الإسلامية)

تصنیف

ابوزھرہ مصری

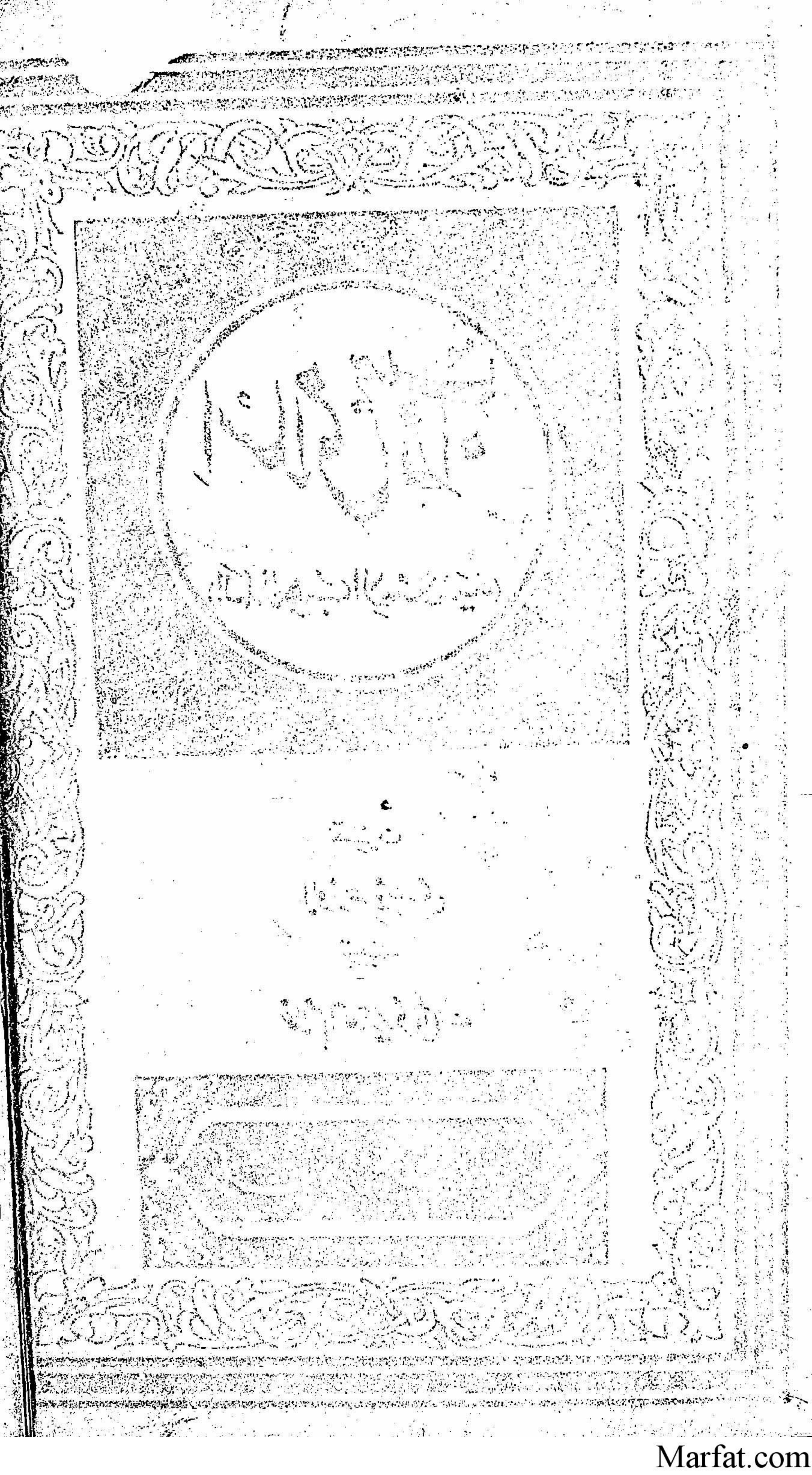
ترجمہ

غلام احمد حریری ایم اے

DATA ENTERED

ملک برادرز سٹیٹس لائٹ پور
پاکستان

فون: ۲۳۷۵



Illegible text within a circular emblem or seal.

Illegible text block consisting of several lines.

Illegible text within a rectangular box at the bottom of the page.

(جملہ حقوق دائمی بحق پبلشر محفوظ ہیں)

162

اسلامی مذاہب



تصنیف

ترجمہ و تفسیر

شیخ محمد ابو زہرہ

پروفیسر غلام احمد حریری ایم۔ اے

پروفیسر لاء کالج جامعۃ القاہرہ

صدر شعبۂ اسلامیات و عربی

مصر

اسلامیہ کالج لائل پور

ناشر:

ملک پبلشرز
اردو بازار لاہور
کارخانہ بازار لائل پور

پاکستان
فون ۴۳۷۵

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

اسلامی مذاہب

بانی و مؤسس • احوال و عقائد • طرز فکر و نظر • خصوصیات و تمیزات

تصنیف

۲۹۷۶۸۹
۱۵۵۲

ترجمہ و تخریج

شیخ محمد ابو زہرہ

۱۵۳۲۰

پروفیسر غلام احمد حریری

پروفیسر لاء کالج الجامعۃ القاہرہ

مصر

ایم۔ اے عربی (۱) ایم۔ اے علوم اسلامیہ (۱)

ایم۔ او۔ ایل (عربی) فاضل السنۃ شرقیہ

صدر شعبہ اسلامیات اسلامیہ کالج لائل پور

ناشر:

ملک برادرز
اُردو بازار لاہور
کارخانہ بازار لائل پور
پاکستان

تصنیف

پروفیسر شیخ محمد ابو زہرہ مصر

ترجمہ و تخریج

غلام احمد حریری ایم۔ اے پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور

طابع

ملک غلام رسول

مطبع

استقلال پریس لاہور

ناشر

ملک برادرز کارخانہ بازار لائل پور۔ اردو بازار لاہور

صفحات

۳۲۰

تعداد اشاعت

ایک ہزار

قیمت مجلد

نو روپے

تاریخ اشاعت

اگست ۱۹۴۷ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرض مہرجم

کردار احمد ابو بدال کا وارث
پروفیسر

الحمد لله وكفى وسلاوة على عبادة الذين اصطفى اما بعد
لله الحمد کہ قارئین کرام کو دور حاضر کے اویب لیبیب و فقیہ شہیر شیخ محمد ابو زہرہ پروفیسر شریعت
اسلامیہ لاء کالج جامعۃ القاہرہ کی زندہ جاوید کتاب "المداہب الاسلامیہ" سے روشناس کرانے
کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

پروفیسر موصوف مصر کے یگانہ روزگار فقیہ ہیں اور فقہ دانی میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ رتقہ
دلان پاکستان قبل ازیں آپ کی مندرجہ ذیل کتب کے اردو تراجم سے متعارف ہو چکے ہیں۔

(۱) حیات امام احمد بن حنبل (۲) حیات امام مالک (۳) حیات امام شافعی (۴) حیات امام ابو حنیفہ
(۵) حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ (۶) حیات امام ابن حزم (۷) حیات امام جعفر صادق (۸) حیات امام
محمد و ابو یوسف۔

پروفیسر محمد ابو زہرہ صرف اپنی گراں بہا تصانیف کی بناء پر ہی پاکستان میں ایک جانی پہچانی شخصیت نہیں
بلکہ پاکستان کے اصحاب علم و قلم ذاتی طور پر بھی ان سے آشنا ہیں۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں جب پنجاب یونیورسٹی نے
لاہور میں عالمی مجلس مذاکرہ اسلامیہ منعقد کی اور صاحب موصوف بنفس نفیس علماء مصر و شام کی معیت میں
یہاں تشریف لائے تو شائقین کو براہ راست ان سے ملنے اور ان کے ایمان پر درشادات سننے کا شرف حاصل
ہوا۔ مقالہ خوانی کے علاوہ آپ نے بحث و تمحیص کے دوران فی البدیہہ جو تقریریں کیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ
آپ نہ صرف ایک بلند پایہ فقیہ زبردست عالم دین اور ایک عظیم القیصر خطیب ہیں بلکہ اپنے اندر حرارت ایمانی اور
بے پناہ دینی غیرت و محبت بھی رکھتے ہیں۔

قاہرہ میں جامعہ ازہر کے ماتحت مجمع البحوث الاسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ کئی سال سے قائم ہے
جس کے ممبر مصر کے علماء و فضلاء کے علاوہ بعض اسلامی ممالک کے علماء بھی ہیں۔ اس سال اس اکاڈمی نے اپنی
پہلی عالمی موتمن منعقد کی جو ۶ مارچ کو شروع ہوئی اور ۲۳ کو ختم ہوئی۔ ہندوستان کے صاحب تصانیف
عالم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبہ اسلامیات مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم۔ اے مدیر برہان بھی اس
میں شریک ہوئے تھے۔ شیخ ابو زہرہ نے موتمن میں جو تقریر کی مولانا موصوف اس کے تاثرات ان الفاظ میں

تحریر کرتے ہیں۔

”دوسری نشست میں شیخ ابو زہرہ نمبر اکاڈمی نے ”العلاقات الدولیة فی الاسلام“ کے موضوع پر تقریر کی یہ تقریر ایک نہایت مبسوط اور ضخیم مقالہ کی صورت میں مرتب تھی جو ٹائپ شدہ شکل میں تمام لوگوں میں پہلے سے تقسیم بھی کر دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود شیخ نے مقالہ پڑھنے کے بجائے زبانی تقریر کرنا پسند فرمایا۔ قدرت نے عربوں کو عموماً اور مصریوں کو خصوصاً طلاق لسانی اور فصاحت و بلاغت اور ذور بیان و خطابت کا جو کمال عطا فرمایا ہے اور جس میں بلا مبالغہ آج بھی دنیا کی کوئی قوم ان کے حریف ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی شیخ ابو زہرہ کی تقریر اس کا بڑا حسین نمونہ تھی۔ سبحان اللہ! تقریر کیا تھی معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت و بلاغت اور ذور بیان کا ایک سمندر ہے جو ابل پڑا ہے۔ بجلیاں ہیں کہ بادلوں کے گھونگھٹ سے منہ نکال کر سامعین سے چٹمک زنی کر رہی ہیں بس جی یہ جانتا تھا کہ وہ بولتے نہیں اور ہم کیف و سرور کے بھر پور کے جام لٹا دھاتے ہیں۔ اس نشست میں شیخ ابو زہرہ نے مسلسل دو گھنٹہ تقریر کی۔ مگر پھر بھی مکمل نہیں ہوئی۔ وقت ختم ہو گیا تھا اس لئے نشست برخواست ہو گئی۔ دوسرے دن انہوں نے پھر تقریر شروع کی جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔“

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے یہ تاثرات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ مصر کے موجودہ علماء کے مابین شیخ ابو زہرہ کو کیا قدر و منزلت حاصل ہے۔

شیخ ابو زہرہ کی کتاب ”المداہب الاسلامیہ“ کا موضوع — جیسا کہ اس کے نام سے عیاں ہے — اسلامی فرق و مذاہب کا ذکر و بیان ہے۔ یہ کتاب انہوں نے مصری حکومت کی وزارت تعلیم کے ادارہ ثقافت عامہ کے حسب فرمائش تصنیف کی۔ اسلامی فرقوں کو وہ تین قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔

۱۔ اعتقادی فرقے

۲۔ سیاسی فرقے

۳۔ فقہی مذاہب و مسالک

مؤخر الذکر قسم کی تفصیلات ذکر کرنے کے لئے وہ ایک عید گانہ کتاب لکھنے کا وعدہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ انشاء اللہ العزیز یہ وعدہ جلد پورا کیا جائے گا۔ تا وقت تحریر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شیخ کا یہ وعدہ زیور ایفاء سے آراستہ ہوا یا نہیں۔ بہر کیف ”المداہب الاسلامیہ“ کو انہوں نے پہلی اور دوسری قسم کے فرقوں تک محدود رکھا۔

اعتقادی فرقے :- اعتقادی فرق و مذاہب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے انہوں نے فرقہ جبریہ

فدیہ - مرجئہ معتزلہ - اشاعرہ - ماتریدیہ اور سلفیہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ فرقے کیونکر معرض وجود میں آئے؟ ان کا بانی کون تھا؟ کون سے بلاد و امصار ان کی خصوصی آماجگاہ تھے؟ ان کے افکار و معتقدات کیا تھے ان کے وجود سے ملت اسلامیہ کو کیا نقصان پہنچا؟ سطح زمین پر پھرنے والے ان سوالات کا کافی و شافی جواب آپ کو مذاہب الاسلامیہ کے اوراق میں ملے گا۔

یہ قدیم اسلامی فرقے تھے جن میں سے بعض کا وجود آجکل عنقا کا حکم رکھتا ہے اور دیا پر پاکستان میں دو و بائش رکھنے والے اکثر لوگ ان کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ معتقدات کی اساس پر جو جدید فرقے نئے شہود پر آئے ان میں وہ تین فرقوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اتباع محمد بن عبد الوہاب

(۲) بہائی فرقہ

(۳) قادیانی

سیاسی فرقے۔ سیاسی فرقوں کے ضمن میں وہ دو مشہور فرقوں — شیعہ و خوارج — کا ذکر کرتے ہیں۔ اور پھر ان سے پیدا ہونے والے بیسیوں فرقوں کے واقعات و احوال و اوکار و معتقدات اور زمان کے سیاسی رجحانات و میلانات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

شیعہ :- شیعہ کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابو زہرہ نے ان اسباب و عوامل کی نشاندہی کی ہے جو عہد عثمان میں امت مسلمہ کے کشتت و افتراق کا موجب بنے اور وہ دین اسلام جو دنیا میں وحدت ادیان کا سبق سکھانے کے لئے آیا تھا مختلف مسالک و مذاہب میں بٹ گیا۔

وہ شیعہ کے مندرجہ ذیل فرقوں کا ذکر کرتے ہیں۔

سبتہ - نوابیہ - کیسانیہ - زیدیہ - امامیہ اثنا عشریہ - اسماعیلیہ - حاکمیہ - نصیریہ -

سیاسی فرقوں میں دوسرا اہم فرقہ خوارج کا تھا۔ خوارج حسب ذیل فرقہ جات میں منقسم ہو گئے تھے۔

ازاراقہ - نجدات - صفریہ - عجارودہ - اباضیہ - یزیدیہ - مہمونیہ

آغاز کتاب میں شیخ نے بڑے قاصدانہ انداز میں بتایا ہے کہ انسانوں میں نظری و فکری اختلافات کیونکر آجا کر موتے میں اور ان کے تحت کون سے اسباب و عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں مندرجہ ذیل امور فکری اختلاف کو جنم دیتے ہیں۔

۱- موضوع زیر بحث کا ابہام و غموض

۲- اختلاف رغبات و شہوات

۳۔ رجحان و میلان کا تباین و تخالف

۴۔ تقلیدِ آباؤ اجداد

۵۔ فہم و ادراک کا یکساں نہ ہونا۔

۶۔ حب جاہ و سلطنت

شیخ کی نگاہ میں یہ وہ امور ہیں جو عام سنی نوع انسان میں پیدا ہو کر ان کی وحدت فکر و نظر کو غارت کر دیتے ہیں اور ان میں انتشارِ خیال تباینِ فہم و ادراک اور تخالفِ جذبات و احساسات رونما ہو جاتا ہے ان عمومی اسباب کے علاوہ شیخ کے نزدیک کچھ خصوصی عوامل و محرکات بھی ہیں جو خاص طور سے مسلمانوں کی تفریقِ باہمی کا موجب بنے اور امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ وہ اسباب یہ ہیں۔

۱۔ عربوں کا قومی تعصب

۲۔ نزاعات دربارہٴ خلافت

۳۔ دیگر ادیان و مذاہب سے اختلاط

۴۔ خلافت عباسیہ میں فلسفیانہ کتب کے تراجم

۵۔ دقیق و عولیں مسائل پر نقد و نظر

۶۔ بے بنیاد افسانے

۷۔ قرآنی متشابہات

۸۔ قرآنِ کریم سے شرعی احکام کا استنباط

شیخ ابو زہرہ نے کم و بیش اپنی جملہ تصانیف میں اسلامی فرقہ جات کے احوال و معتقدات پر روشنی ڈالی ہے مگر مختلف فرق و مذاہب کے کوائف و احوال عقائد و افکار اور طرزِ فکر و نظر کی یہ تفصیلات دوسری کسی کتاب میں موجود نہیں۔ یہ کتاب فرقِ اسلامیہ سے متعلق معلومات کا گنجینہ ہے اور اپنے دامن میں ان کلامی دلائل و براہین کو سموئے ہوئے ہیں جو یہ فرقے اپنے اپنے مخصوص نظریات کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔

ان فرقہ جات کا حال و مقام معلوم کر کے طبعاً یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ دینِ حق میں آخر یہ اختلاف کیوں پیش آیا؟ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ اختلاف اساسی تقاضا اصولی۔ بلکہ اس کی حیثیت ائمہ اربعہ کے باہمی اختلافات کی طرح جزوی اور فرعی ہے۔ یہ اختلافات اس بات کی زندہ دلیل ہیں کہ تباینِ فکر و نظر اور تخالفِ فہم و ادراک کے علی الرغم یہ فرقہ جات دینِ اسلام کے وابستہ فرقہ جات ہیں اور ہرگز اس سے الگ نہیں۔

بلاشبہ شیعہ و خوارج کے بعض فرقوں میں حد درجہ کا غلو پایا جاتا ہے جس کی بناء پر وہ اسلامی عقائد سے

بہت دور نکل گئے۔ اسی طرح قادیانی اور بہائی فرقہ کے اختلافات کو بھی فروعی و جزوی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ شیخ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ فرقے اسلام کے مرکزی اصولوں سے دور ہٹ کر اسلامی حدود سے تجاوز کر گئے ہیں لہذا ان کو اسلامی فرقوں میں شمار کرنا صرف رسمی طور سے ہے حقیقتاً یہ اسلام سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔

بنا بریں ان فرقوں کی وجہ سے اسلام کو ہدفِ ملامت نہیں بنایا جاسکتا کما س میں اصولی اختلاف پایا جاتا ہے قادیانی فرقہ کے مرکز و محور سے دور رہنے کے باوجود شیخ کا تبصرہ اس فرقہ پر بڑی حقیقت پسندانہ ہے معلوم یہ ہوتا ہے کہ شیخ نے قادیانی لٹریچر کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے اور قادیانیت کے خلاف لکھی گئی کتب پر اکتفاء نہیں کیا۔ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف کے حوالے دیکر ان کی تصناد بیانی، مسلمان دشمنی اور انگریز نوازی کا بھانڈا چورا ہے میں بھوڑتے اور ان کے دلائل و سببوں کی دجھیاں بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔

”المنزہب الاسلامیہ“ کے مطالعہ سے شیخ ابو زہرہ کے علم و فضل کا ایک نیا گوشہ سامنے آتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح گواہ ہوتی ہے کہ آپ ایک عظیم نقیب ہونے کے ساتھ ساتھ مدلل و ادیبان کے بھی نیکائے روزگار عالم ہیں۔

اسلامی فرقہ جات کے کوائف و احوال اور عقائد و افکار معلوم کرنے کے لئے شیخ ابو زہرہ کی یہ کتاب ”الملل والنحل شہرستانی“ ”الفصل فی الملل والاصواء والنحل ابن حزم“ اور کتاب الفرق بین الفرق از عبدالقادر بغدادی کا نعم البدل ہے۔

مزید برآں شیخ ابو زہرہ کے طرزِ بحث و نظر اور ناقذانہ تحقیق و تدقیق نے اس کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز مذکورہ کتب میں موجود نہیں۔ نیز یہ کہ ان کتب کا دامن جدید فرقوں کے کوائف و احوال سے خالی ہے۔ کیونکہ یہ فرقے بعد کی پیداوار ہیں۔

بہر کیف شیخ ابو زہرہ کی یہ گراں بہا تصنیف لا تعداد اقاوی پہلو رکھتی اور اسلامی لٹریچر میں گراں قدر اضافے کا موجب ہے۔ میں ملک برادر ترکار خانہ بازار لائل پور کا خلوص دل سے سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے بکمال ذوق و شوق اس کتاب کی طباعت کا بیڑا اٹھایا اور اسے بے پناہ جذبۂ الفت و مودت اور بصرف زر کثیر زیور طبع سے آراستہ کیا۔

میں بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ جس اخلاص و حسن نیت کے ساتھ میں نے ترجمہ کا کام انجام دیا اس کے طفیل میری اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے اور کتاب ہذا کو مترجم طابع و ناشر اور

اور کتاب سب کے لئے موجب فلاح دارین بنائے۔
 وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

فارس مترجم

غلام احمد حریری عفی عنہ

ایم۔ اے (عربی)۔ ایم۔ اے (علوم اسلامیہ)
 ایم۔ او۔ ایل (عربی) فاضل السنہ شرقیہ
 صدر شعبہ اسلامیات و عربی
 اسلامیہ کالج لائل پور

۲۲ محرم ۱۳۸۲ھ

۲۷ جون ۱۹۶۲ء

۶۱۔ ڈی پیپلز کالونی

لائل پور

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
۲۸	فلسفیانہ کتب کے تراجم	۱۵	۱۴	۱- مقدمہ مصنف
۲۹	دقیق مسائل سے تعارض	۱۶	۱۴	اعتقادی فرقے
۲۹	افسانہ طرازی	۱۷	۱۸	سیاسی فرقے
۲۹	قرآن کریم میں متشابہات کا ورود	۱۸	۱۸	فقہی مذاہب
۳۰	شرعی احکام کا استنباط	۱۹	۱۹	۲- تمہید
۳۱	مسلمانوں کے اختلاف کی حدود	۱۹	۱۹	تمہید کے مندرجات
۳۱	اختلاف کی حدود	۲۰	۱۹	لوگوں میں فکری اختلاف کا شاخسانہ
۳۲	محمد سلف کے اختلاف کی اہمیت	۲۱	۱۹	موضوع بحث کا غرض و عمق
۳۲	فکری و نظری اختلاف	۲۲	۲۰	تزییب و تشوین اور مزاج کا اختلاف
۳۳	اصول اساسی میں اختلاف ہمیں	۲۳	۲۱	اختلاف میلان و رجحان
۳۴	نتیجہ ابحاث سابقہ	۲۴	۲۱	سابق علماء کی تقلید
۳۵	۵- سیاسی مذاہب	۲۴	۲۲	فہم و ادراک کا مختلف ہونا
۳۶	مسئلہ خلافت کی اہمیت	۲۴	۲۳	حبت جاہ و ریاست
۳۷	ابن خلدون کا نظریہ تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں	۲	۲۳	تلفیض مطالب
۳۸	امارت کی اہمیت و ضرورت	۳	۲۴	۳- مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب
۳۸	سیاست میں اختلافی امور	۴	۲۴	مسلمانوں کا باہمی اختلاف اور اس کے اسباب
۳۹	فرقہ واری کا نقطہ آغاز	۵	۲۵	ایک اہم سوال
۴۰	۶- مسئلہ خلافت میں اختلاف	۴	۲۶	عربی عصبيت
	کے مراحل و ادوار		۲۶	خلافت میں نزاع
۴۰	نبی کریم نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں فرمایا	۶	۲۷	قدیم اہل مذاہب سے مسلمانوں کے روابط
۴۱	کتاب و سنت میں اصول خلافت	۷		اور ان کا مشرف یا سلام ہونا۔

۵۹	۲۸	۲۱	۸	آنجنور کے بعد انتخابِ خلیفہ میں اختلاف
۶۰	۲۹	۲۲	۹	عہد ابوبکر و عمر میں عدم اختلاف
۶۱	۳۰	۲۳	۱۰	خلفاء ثلاثہ کا طریق انتخاب
۶۲	۳۱	۲۳	۱۱	عہد عثمان کی فتنہ سامانی
۶۳	۳۲	۲۳	۱۲	خلافت عثمانی میں فتنہ پروری کے اسباب
۶۴	۳۳	۲۲	۱۳	حضرت عثمان کا اپنے اقارب سے حسن سلوک
۶۵	۳۴	۲۶	۱۴	حضرت عثمان کی اقربا نوازی
۶۶	۳۵	۲۶	۱۵	حضرت عثمان کی نرم خوئی
۶۷	۳۶	۲۶	۱۶	عبداللہ بن سبا کی فتنہ پروری
۶۸	۳۷	۲۸	۱۷	حضرت علی کے عہد خلافت میں اختلافات
۶۹	۳۸	۲۶	۱۸	کی شدت وحدت سے سیاسی فرقوں کا دین ربط و تعلق
۷۰	۳۹	۵۰	۱۹	مذہب و سیاست کا ربط و تعلق
۷۱	۴۰	۵۱	۲۰	سیاسی فرقے
۷۲	۴۱	۵۲	۲۱	شیعہ کی اجمالی تعریف
۷۳	۴۲	۵۲	۲۲	فرقہ شیعہ اور ابن خلدون
۷۴	۴۳	۵۳	۲۳	فرقہ شیعہ میں اختلاف مدارج
۷۵	۴۴	۵۴	۲۴	وہ زمان و مکان جہاں شیعہ مذہب پران چڑھا
۷۶	۴۵	۵۵	۲۵	سرزمین عراق شیعہ کا گہوارہ
۷۷	۴۶	۵۶	۲۶	۹ شیعہ مذہب میں قدیم فلسفہ اثنا عشریہ
۷۸	۴۷	۵۷	۲۷	شیعہ مذہب کے مصادر و ماخذ
۷۹	۴۸	۵۸	۲۸	شیعہ مذہب اور یہودیت
۸۰	۴۹	۵۹	۲۹	۱۰ شیعہ کے فرقے
۸۱	۵۰	۵۹	۳۰	غالی شیعہ ان کے فرقہ جات
۸۲	۵۱	۵۹	۳۱	۱۱ زیدیہ
۸۳	۵۲	۵۹	۳۲	۱۲ زیدیہ کا ظہور و شیوع
۸۴	۵۳	۵۹	۳۳	۱۳ امام زید کا علم و فضل
۸۵	۵۴	۵۹	۳۴	۱۴ فرقہ زیدیہ کے افکار و معتقدات
۸۶	۵۵	۵۹	۳۵	۱۵ امام زید کے جانشین
۸۷	۵۶	۵۹	۳۶	۱۶ زیدیہ کے عقائد میں تبدیلی
۸۸	۵۷	۵۹	۳۷	۱۷ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ
۸۹	۵۸	۵۹	۳۸	۱۸ امامیہ کی تعریف
۹۰	۵۹	۵۹	۳۹	۱۹ امامیہ کے معتقدات اور ان کے دلائل
۹۱	۶۰	۵۹	۴۰	۲۰ امامیہ میں ظہور اختلاف
۹۲	۶۱	۵۹	۴۱	۲۱ اثنا عشریہ
۹۳	۶۲	۵۹	۴۲	۲۲ فرقہ اثنا عشریہ اور ایران و عراق
۹۴	۶۳	۵۹	۴۳	۲۳ امامیہ کی نگاہ میں امام کا مقام
۹۵	۶۴	۵۹	۴۴	۲۴ امام کے منصب عالی کے وجوہات
۹۶	۶۵	۵۹	۴۵	۲۵ ائمہ سے معجزات کا ظہور
۹۷	۶۶	۵۹	۴۶	۲۶ ائمہ کا علم کئی سے پہرہ و رہنما
۹۸	۶۷	۵۹	۴۷	۲۷ تحفظ شریعت کیلئے امام کی ضرورت
۹۹	۶۸	۵۹	۴۸	۲۸ امامیہ کے دعاوی کا ابطال

۹۶	خوارج کے خصوصی اوصاف	۷۳	۷۸	۱۳۰۔ امامیہ اسماعیلیہ	۵۰
۱۰۲	۱۵۔ خوارج کے فرقے		۷۸	فرقہ اسماعیلیہ	۵۱
۱۰۲	خوارج کے مختلف فرقوں میں نقطہ اختلاف	۷۴	۷۸	اسماعیلیہ کا تعارف	۵۲
۱۰۲	۱۔ انارقہ	۷۵	۷۸	اسماعیلیہ کی مختصر تاریخ	۵۳
۱۰۲	انارقہ کے افکار و معتقدات	۷۶	۷۹	اسماعیلیہ کو باطنیہ کے نام سے موسوم کرنے کے وجوہات	۵۴
۱۰۳	۲۔ نجدات	۷۷		باطنیہ کے اصول اساسی	۵۵
۱۰۵	۳۔ فرقہ صفریہ	۷۸	۸۰	فرقہ حاکمیت و دروز	۵۶
۱۰۵	۴۔ فرقہ عجاروہ	۷۹	۸۱	فرقہ نصیریہ	۵۷
۱۰۷	فرقہ اباضیہ	۸۰	۸۱	حسن بن صباح اور اس کے اتباع	۵۸
۱۰۹	خوارج کے وہ فرقے جو مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتے	۸۱	۸۲	تخصیص مطالب	۵۹
۱۱۰	۱۶۔ خلافت کے مسئلہ میں مسلک جمہور	۸۱	۸۳	۱۳۱۔ خوارج	
۱۱۰	مسئلہ خلافت میں اختلافات آراء	۸۲	۸۴	خارجی تحریک کا پس منظر	۶۰
۱۱۰	مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کا اجماعی طرز عمل	۸۳	۸۴	خارجی مذہب کی اساس	۶۱
۱۱۱	۱۔ قریشیت	۸۴	۸۴	فرائض کے انقلابی اور خوارج	۶۲
۱۱۳	۲۔ بیعت	۸۵	۸۵	اندلس کے فدائی مسیحی اور خارجی	۶۳
۱۱۵	دین اسلام میں حاکم و محکوم کے فرائض	۸۶	۸۵	خوارج کا گراہانہ خلوص و تقویٰ	۶۴
۱۱۵	۳۔ شوریٰ	۸۷	۸۶	خوارج کا تشدد	۶۵
۱۱۷	انتخاب خلیفہ کے تین طریقے	۸۸	۸۸	تشدد کے اثرات و نتائج	۶۶
۱۱۹	دواہم سوال اور ان کا جواب	۸۹	۸۹	خوارج اور موالی	۶۷
۱۲۰	دوسرا سوال اور اس کا جواب	۹۰	۸۹	عجمی افکار کا اثر خوارج پر	۶۸
۱۲۱	متغلب کی خلافت کے شرائط	۹۱	۹۰	خوارج کے عقائد و افکار	۶۹
۱۲۲	۴۔ عدالت	۹۲	۹۰	خوارج کے دلائل و براہین	۷۰
۱۲۵	مکتوب حسن بصری بنام عمر بن عبدالعزیز	۹۳	۹۱	ردِ خوارج میں حضرت علی کی تقریر	۷۱
۱۲۸	مکتوب حسن بصری پر تبصرہ	۹۴	۹۳	خوارج کا باہمی اختلاف	۷۲
			۹۴		

۱۹۲	۵۸	۱۷۲	۳۵	معتزلہ کی وجہ تسمیہ
۱۹۳	۶۱	۱۷۵	۳۶	معتزلہ کے اصول خمسہ
		۱۷۵	۳۷	۱- توحید
۱۹۳	۵۹	۱۷۶	۳۸	عقیدہ توحید کے نتائج
۱۹۵	۶۰	۱۷۷	۳۹	۲- عدل
۱۹۵	۶۱	۱۷۷	۴۰	۳- وعد و وعید
۱۹۸		۱۷۸	۴۱	کفر و اسلام میں درمیانہ درجہ
۱۹۸	۶۲	۱۷۹	۴۲	امر بالمعروف و نہی عن المنکر
۱۹۹	۶۳	۱۷۹	۴۳	معتزلہ کا طرز استدلال
۲۰۵		۱۷۹	۴۴	معتزلہ کی عقل پرستی
۲۰۵	۶۴	۱۸۰	۴۵	یونانی افکار سے اخذ و استفادہ
۲۰۵	۶۵	۱۸۱	۴۶	معتزلہ کا دفاع اسلام
۲۰۶	۶۶	۱۸۲	۴۷	خلفاء بنی عباس کی تائید معتزلہ
۲۰۸	۶۷	۱۸۳	۴۸	۱- معاصرین کی نگاہ میں معتزلہ کا مقام
۲۰۹	۶۸	۱۸۴	۴۹	۲- معتزلہ کی افکار زنادقہ سے تاثر پذیری
۲۱۰	۶۹	۱۸۵	۵۰	۳- معتزلہ کا عقلی طریق استدلال
۲۱۰	۷۰	۱۸۶	۵۱	۴- معتزلہ کی شدت و حدت
۲۱۱	۷۱	۱۸۶	۵۲	۵- فرقہ معتزلہ میں ملحدین کی شمولیت
۲۱۳		۱۸۷	۵۳	۶- محدثین و فقہاء و پیر خلفاء بنی عباس کے نظام
۲۱۳	۷۲	۱۸۸	۵۴	۲۳- معتزلہ پر محدثین و فقہاء و قضاویہ کا
۲۱۵	۷۳	۱۸۸	۵۵	معتزلہ کے اوصاف خصوصی
۲۱۶	۷۴	۱۹۰	۵۶	۲۵- معتزلہ کے مناظرات
۲۱۷	۷۵	۱۹۰	۵۷	۱- معتزلہ کا طریق جدل و بحث اور انکساف
		۱۹۱	۵۸	۲- عقلی علوم سے استفادہ
۲۱۸	۷۶	۱۹۲	۵۹	۳- معتزلہ کی فصاحت و بلاغت

۱۹۲- مجادلات میں معتزلہ کے حریف
 ۲۶- کفار اور اہل بدعت سے
 معتزلہ کے مناظرات
 ۱۹۳- معتزلہ کے مناظرات کی خصوصیات
 ۱۹۵- معتزلہ کے مجادلات نادقہ اور مرتدین کے ساتھ
 خلیفہ ماموں کا ایک مرتد خراسانی سے مناظرہ
 ۲۷- افسین کا مقدمہ
 دیار مشرق میں الحاد و زندقہ
 مقدمہ کی تفصیلات
 ۲۸- مسئلہ خلق قرآن
 مسئلہ خلق قرآن کی مختصر تاریخ
 صفت کلام کی نفی اور معتزلہ
 ماموں کی معتزلہ نوازی
 خلق قرآن کے مسئلہ میں ماموں کا جوہر و تشدد
 ماموں کی موت اور معتزم کا عہد خلافت
 امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی استفتائیں
 عہد وثاق کی فتنہ سامانی
 فتنہ خلق قرآن کا اختتام
 ۲۹- مسئلہ خلق قرآن میں نقطہ اختلاف
 مسئلہ خلق قرآن میں محال نزاع کی تعیین
 معتزلہ کے جوہر و تشدد کے اسباب
 معتزلہ کے افکار ایمانی غیرت کے آئینہ دار تھے
 معتزلہ کی نگاہ میں جمہور اہل اسلام کے
 عقائد مسیحی ذہن کی پیداوار تھے
 قرآن سے تعدد الہ کا لزوم

۲۱۸	۲۱۸	۷۷	معتزلہ کے ظلم و جور کے ثمرات
۲۱۹	۹۶	۷۸	افکار معتزلہ کا خلاصہ
۲۲۰	۹۸	-	۳۰۔ اشاعرہ
۲۲۰	۹۹	۷۹	اشعری مکتب خیال کا پس منظر
۲۲۰	۱۰۰	۸۰	امام اشعری کی ولادت و وفات
۲۲۱	۱۰۱	۸۱	امام اشعری کی تقریر
۲۲۲	-	۸۲	حنبلی و اشعری افکار و عقائد میں یگانگت
۲۲۴	۱۰۲	۸۳	افکار اشعری کی تہذیب و تلخیص
۲۲۴	-	۸۴	مسک اشعری میں اعتدال
۲۲۵	۱۰۳	۸۵	مسک اشعری میں عقل و نقل کی ہم آہنگی
۲۲۵	۱۰۳	۸۶	امام اشعری کی خدمات جلیلہ
۲۳۱	۱۰۵	۸۷	اشعری کے مخالفین
۲۳۲	۱۰۶	۸۸	۳۱۔ اشعری مسک امام اشعری کے بعد
۲۳۳	۱۰۷	۸۸	مسک اشعری کا قبول عام
۲۳۳	۱۰۸	۸۹	ابوبکر باقلانی المتوفی ۳۰۰ھ
۲۳۴	۱۰۹	۹۰	امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ
۲۳۴	۱۱۰	۹۱	اشعری مسک کے علماء و متاخرین
۲۳۷	۱۱۱	۹۲	۳۲۔ امام اشعری و جہانی کے مابین مناظرہ
۲۳۸	۱۱۲	۹۳	مناظرہ کی تفصیلات
۲۳۸	-	۹۳	۳۳۔ ماثریدیہ
۲۳۸	۱۱۳	۹۴	امام ماثریدی کے سیر و سوانح
۲۳۸	۱۱۳	۹۴	امام ماثریدی کا علم و فضل
۲۳۸	۱۱۳	۹۵	امام ابوحنیفہ اور ماثریدی کے افکار
۲۳۸	۱۱۳	-	کی یگانگت
۲۳۸	۱۱۳	۹۶	ماثریدی کی تصانیف
۲۳۸	۱۱۳	-	۳۳۔ امام ماثریدی کا عقائد اسلامیہ کے فہم و ادراک کے چار طریقے
۲۳۸	۱۱۳	-	سلفیہ کی نگاہ میں عقل کا مقام
۲۳۸	۱۱۳	-	۳۴۔ مسئلہ توحید
۲۳۸	۱۱۳	-	سلفیہ کے منفرد مسائل
۲۳۸	۱۱۳	-	۳۳۔ امام ماثریدی کی طرز فکر و نظر
۲۳۸	۹۶	-	تفکیک ماثریدی کا طرز و انداز
۲۳۸	۹۸	-	امام ماثریدی کی عقلیت پسندی
۲۳۸	۹۹	-	عقل و نقل کی موافقت و مطابقت
۲۳۸	۱۰۰	-	ماثریدی کے افکار و آراء
۲۳۸	۱۰۱	-	بنا بر عقل معرفت خداوندی کے وجود کا ادراک ممکن ہے۔
۲۳۸	۱۰۲	-	عقل اشیاء کے حسن و قبح کا ادراک کر سکتی ہے۔
۲۳۸	۱۰۳	-	کیا افعال خداوندی عقل میں یا نہیں؟
۲۳۸	۱۰۳	-	عدم تکلیف احکام کا مسئلہ
۲۳۸	۱۰۵	-	جبر و اختیار کے مسئلہ میں اختلاف
۲۳۸	۱۰۶	-	مسئلہ صفات باری تعالیٰ
۲۳۸	۱۰۷	-	کلام باری میں اختلاف
۲۳۸	۱۰۸	-	تاویل آیات اور ماثریدیہ
۲۳۸	۱۰۹	-	روایت باری تعالیٰ
۲۳۸	۱۱۰	-	ترکیب کیا ہے؟ مسئلہ
۲۳۸	۱۱۱	-	نتیجہ بحث
۲۳۸	۱۱۲	-	۳۵۔ اپیل صلف و صالحین
۲۳۸	۱۱۲	-	سلفیہ کون تھے؟
۲۳۸	۱۱۳	-	۳۶۔ اپیل صلف کا مسک و منہاج
۲۳۸	۱۱۳	-	عقائد اسلامیہ کے فہم و ادراک کے چار طریقے
۲۳۸	۱۱۳	-	سلفیہ کی نگاہ میں عقل کا مقام
۲۳۸	۱۱۳	-	۳۷۔ مسئلہ توحید
۲۳۸	۱۱۳	-	سلفیہ کے منفرد مسائل

۲۸۶	باب جہاد بند کرنے کے نقصانات	۱	۲۶۱	۳۸ - وحدت ذات و صفات	
۲۸۷	تقلید ائمہ سے ظہور کفر و شرک	۲	۲۶۱	وحدت ذات و صفات میں اختلاف	۱۱
۲۸۸	۴۳ - واپس		۲۶۲	سلفیہ و اشاعرہ	۱۱
۲۸۸	وہابیت کا ظہور و شروع شرک و بدعت کا رد عمل تھا۔	۳	۲۶۲	سلفیہ کے یہاں صفات باری میں عدم تاویل	۱۱
۲۹۲	۴۴ - بہائی فرقہ		۲۶۲	شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصریحات پر نقد و نظر	۱۱
۲۹۲	بہائی فرقہ کیونکر عالم وجود میں آیا	۳	۲۶۶	لغوی اعتبار سے مجاز ہی مفہوم کا جواز	۱۲
۲۹۳	بانی بہابیت کے عقائد و اعمال	۵	۲۶۶	تاویل و تفسیر میں	۱۲
۲۹۴	علی محمد باب کے اتباع و تلامذہ	۶	۲۶۱	۳۹ - سلفیہ اور مسئلہ تعلق قرآن	۱۲
۲۹۵	بہاء اللہ کے افکار و عقائد	۷	۲۶۱	خلق قرآن کے مسئلہ میں سلفیہ کا نقطہ نگاہ	۱۲
۲۹۷	بہاء اللہ کی دعوت کے خصوصی خدوخال	۸	۲۶۲	تلخیص مطالب	۱۲
۲۹۹	بہاء اللہ کا جانشین عباس آفندی	۹	۲۶۳	۲۰ - وحدت تکوین	
۲۹۹	یہود و نصاریٰ میں بہابیت کی اشاعت	۱۰	۲۶۳	چروا اختیار کا مسئلہ اور سلفیہ	۱۲
۳۰۰	یورپی ممالک میں شروع بہابیت کا راز	۱۱	۲۶۳	سلفی عقائد کی تفصیلات اور امام ابن تیمیہ	۱۲
۳۰۱	بہائی مذہب کے متعلق مصری حکومت کا فیصلہ	۱۲	۲۶۳	ثواب و عقاب کی وجہ جواز	۱۲
۳۰۳	بہائی مذہب کی عظیم خاصیت	۱۳	۲۶۴	تحلیل افعال	۱۲
۳۰۴	۴۵ - قادیانیت		۲۶۴	ابن تیمیہ کی صحابہ و تابعین سے عقیدت	۱۲
۳۰۴	قادیانیت کا پس منظر	۱۲	۲۶۸	۴۱ - توحید فی العبادت	
۳۰۵	مرزا غلام احمد قادیانی کے مختصر سوانح	۱۵	۲۶۸	توحید فی العبادت کے منقذیات	۱۲
۳۰۶	مرزا صاحب کے دعویٰ	۱۶	۲۶۸	مسک سلفیت کی خصوصیات	۱۲
۳۰۹	مرزا صاحب کے عقائد و افکار	۱۷	۲۶۹	صلحاء کے توسط سے تحصیل قرب کی حمت	۱۲
۳۱۳	مولوی نور الدین خلیفہ اول	۱۸	۲۸۰	غیر اللہ سے فریادرسی چاہنا شرک ہے	۱۳
۳۱۳	قادیانی فرقہ میں اختلاف	۱۹	۲۸۲	رومنہ نبوی اور قبور صلحاء کی زیارت	۱۳
۳۱۴	کیا قادیانی مسلمان ہیں؟	۲۰	۲۸۴	مسک ابن تیمیہ تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں	۱۳
			۲۸۵	جلد سوم	
				۲۲ - جدید فرقہ	

Handwritten text in Urdu script along the left margin, including the word "تو" (to) and "س" (s).

مقدمہ مصنف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - مُحَمَّدٌ وَعَلَى رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَحْمَدًا وَسَلْتَعِیْنُهُ وَنَسْتَعْفِرُهُ وَنَتُوْبُ اِلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ
مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَسَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَلَآ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ
ضَلَّ فَلَآ هَادِیَ لَهٗ وَالصَّلٰوَةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ الَّذِیْ
بَعَثَ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَعَلٰی اَصْحَابِہِ الدِّیْنِ کَاثُوْرًا اَعْلَامُ الْہُدٰی
یَّهْدٰی بِہُمْ وَیُقْتَدٰی بِہُمْ کَمَا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ
” اَصْحَابِیْ کَالنَّجُوْمِ بِاَیِّہُمْ اِشْتَدِیْتُمْ اِہْتَدِیْتُمْ “

آما بعد - یہ حقیقت ہے کہ مصر کی وزارتِ تعلیم کے ادارہ ثقافت عامہ نے تحصیل
میں سہولت پیدا کرنے اس کی توسیع و اشاعت اور ازالہ مشکلات کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں
یا۔ اس ادارہ کا مقصد وحید یہ ہے کہ ہر علم سہولت حاصل کیا جاسکے اور عقل و فکر کے
ناج و ثمرات کو ایسے آسان پیرایہ بیان میں ذکر کیا جائے جو نہ تو عوام کے لئے بالائے ادراک ہو اور نہ
واص کے ذوق کے منافی۔ چنانچہ ادارہ مذکور نے اسی مقصد کے پیش نظر مختلف علوم و فنون مثلاً
لسفہ تاریخ اور دینی موضوعات پر ہزار ہا کتب زیور طبع سے آراستہ کر کے شائع کر دیں۔ خداوند
حالی کے لطف و عنایت سے یہ ادارہ اپنے کام کا کافی حصہ انجام دے چکا ہے اور بایں ہمہ سبوز
س اہم کام کی تکمیل و تنظیم کے لئے سرگرم عمل ہے۔

اس باہمت ادارہ نے مطالبہ کیا کہ اسلامی فرقوں کے احوال و عقائد کے ضمن میں میں ایک ایسی کتاب
تیار کروں جس میں سہولت و سلاست کے پیش نظر دقیق مسائل کی عقدہ کشائی کی گئی ہو اور ان کو واضح
رکے عام قارئین کے لئے پسندیدہ بنا لیا گیا ہو کہ اس کے فہم و ادراک میں انہیں کوئی وقت قطعی طور سے
پیش نہ آئے اور وہ اسلامی فرق و مذاہب کے مختلف مراحل و ادوار کو آسانی سے ذہن نشین
ریکیں۔

۱۔ اعتقادی فرقے | اسلامی فرقوں کو کئی طرح سے تقسیم کیا جاسکتا ہے مثلاً

اعتقادی فرقے :- ان فرقوں کے مابین اعتقادی اعتبار سے کوئی جوہری فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ فرق صرف اصل عقائد سے متعلقہ فروعات تک محدود ہے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ اور دیگر کلامی مسائل جن میں متکلمین مختلف الحیال ہیں حالانکہ سب فرقے مسئلہ توحید میں یک زبان ہیں یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ عقیدہ توحید ہی عقائد اسلامی کا مغز و خلاصہ ہے اور اس میں سب اہل قید و حید الحیال ہیں۔

۲۔ سیاسی فرقے | دوسری قسم سیاسی فرقوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً انتخابِ خلیفہ کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہم سیاسی فرقوں کا ذکر کر کے ان کے مختلف مناہج و مسالک کا ذکر کریں گے۔

۳۔ فقہی مذاہب | تیسری قسم فقہی مکتبہ ہائے فکر کو شامل ہے۔ انہی کے ذریعہ لوگوں میں باہم نظم و ضبط پایا جاتا ہے اور عباد و معبود کے مابین اس رابطہ کی نشان دہی ہوتی ہے جو کتاب و سنت میں بیان کردہ عبادات کے ذریعہ استوار ہوتا ہے۔ یہ امر واضح ہے کہ ان موضوعات پر کھل کر گفتگو کرنے کے لئے متعدد کتب درکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہولت پسندی کے باوصف ایجاد و اختصار کو اپنا شیوہ بنایا۔ تاہم بایں ہمہ اختصار ہم ایک کتاب میں فرقہ مختلفہ کی تفصیلات کو نہ سمو سکے اور یہ مناسب سمجھا کہ اس جلد میں صرف اعتقادی و سیاسی فرقوں کا ذکر کیا جائے۔ فقہی مذاہب کا تذکرہ ہم ایک علیحدہ جلد میں کریں گے ہم بارگاہِ ایزدی سے امید رکھتے ہیں کہ بتوفیق ربانی قارئین کرام سے یہ وعدہ جلد از جلد پورا کیا جائے گا۔

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ وَتَعَالٰی هُوَ الْمَوْفِقُ وَهُوَ الْهَادِي اِلَى سَوَاءِ السَّبِيْلِ
اِنَّهُ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔

محمد ابو زہرہ
پروفیسر شریعت اسلامیہ

لاکھ ج قاہرہ یونیورسٹی

محمد ابو زہرہ

402
450
3

۲۔ تمہید

تمہید کے مندرجات | تمہید میں ہم یہ بیان کریں گے کہ حقائق شرعیہ میں لوگوں کے مابین اختلاف کیونکر رونما ہوا پھر بتائیں گے کہ ایسے حقائق مسلمہ میں

ایک زبان ہونے کے باوجود جن میں افکار و اختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں مسلمان اپنے ونگری نتائج و مسالک میں ایک دوسرے سے کیونکر الگ ہو گئے۔

۲۔ لوگوں میں ونگری اور اختلاف کا شاخسانہ | لوگوں کے فکر و نظر کا اختلاف ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ علماء کا قول ہے کہ انسان اپنے آغازِ ظہور سے

اس کائناتِ عالم کو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے دیکھتا رہا ہے اس قول کا مقتضایہ ہے کہ جس طرح اس کائناتِ عالم کو دیکھنے اور پرکھنے میں تمام بنی نوع انسان کا زاویہ نگاہ یکساں نہیں اسی طرح ان نظریات سے پیدا ہونے والے صورت و خیالات بھی باہم ہم آہنگ اور یکساں نوعیت کے نہیں ہو سکتے۔ اس طرف پر طرہ یہ ہے کہ جو نہی تہذیب و تمدن میں ترقی کی راہیں کھلتی جاتی ہیں اس اختلاف کی خلیج بھی وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اسی اختلاف نے فلسفی اجتماعی اور اقتصادی مذاہب و مسالک کو جنم دیا۔

اختلاف کے اسباب و وجوہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا ہمارے بس کا ہو گا نہیں چنانچہ ہم بعض اسباب ذکر کریں گے۔ ان کا استیعاب و احاطہ ہمارے پیش نظر نہیں۔ اختلاف کے چند اسباب یہ ہیں۔

۳۔ موضوع بحث کا مجموعہ و عمق | اختلاف کی ایک وجہ متنازع فیہا مسئلہ کی وقت و

موضوعیت ہے۔ فلاسفہ قدیم زمانہ سے نازک ترین و اوج موصوعیات کی گروہ کشائی کے ذریعہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مسائل کو حل کرنے کی راہ ایسی آسان نہیں کہ ہر سالک اس وادی میں چل سکے۔ ان کا طرزِ فہم و ادراک بھی یکساں انداز کا نہیں۔ ہر شخص اپنی اختیار کردہ راہ کو ہی قرین صدق و صواب تصور کرتا ہے۔

✓ کس نگوید کہ دو رخ من ترش است

دو رخانی دایگان از کجاری بس پائے سے نہ سلا نہی است

حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ان میں سے کوئی رائے بھی درست نہ ہو بلکہ بحیثیت مجموعی حتیٰ و صدق اس میں دائرہ و ساثر ہو۔ افلاطون اس ضمن میں کہتا ہے۔

”یہ مفروضہ درست نہیں کہ انسان حتیٰ و صدق کو اس کی اصلی اور کامل شکل و صورت میں جہاں بھی ہو پاسکتا ہے، یہ بھی درست نہیں کہ وہ حتیٰ کو کہیں بھی نہیں پاسکتا۔“

اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان حتیٰ کی ایک جہت و جانب کو ہی پاسکتا ہے۔ کامل حتیٰ کو نہیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ فرض کیجئے چند نابینا اشخاص ایک ہاتھی کی طرف گئے۔ ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی کا ایک ایک عضو پکڑ لیا۔ اسے ہاتھوں سے ٹٹولنے لگا اور پھر دل ہی دل میں قیاس آرائی شروع کر دی۔ جس کے ہاتھ ہاتھی کا پاؤں لگا تھا وہ کہنے لگا ہاتھی درخت کی جڑ کی طرح لمبی اور گول شکل کا ہوتا ہے۔ جس نے پیٹھ پر ہاتھ رکھا تھا وہ بولا ہاتھی ایک بلند ٹیلہ کی طرح ہوتا ہے جس کے ہاتھ ہاتھی کا کان لگا تھا۔ وہ کہنے لگا ہاتھی چوڑا چکلا اور دبلا پتلا ہوتا ہے کہ پھیل جاتا ہے اور سکڑ بھی جاتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہے کہ ان میں سے ہر شخص نے ہاتھی کو اس عضو کی طرح تصور کیا جو اس کی گرفت میں تھا وہ دوسرے کو غلط قرار دیتا ہے اور ہاتھی کی شکل و صورت کے بارے میں اس کے بیان کو صحیح تصور نہیں کرتا۔ ذرا غور کیجئے بحیثیت مجموعی ان کا بیان کس قدر قرین صدق و صواب ہے۔ اس پر بھی ایک نظر ڈالئے کہ کذب و خطا نے ان کے شیرازہ کو کس حد تک منتشر کر دیا ہے۔“

بعض اوقات ظہور اختلاف کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ بحث دقیق و عویص ہے۔ بلکہ اختلاف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھ نہیں پاتے اور ایک ہی موضوع کے بارے میں ان کے یہاں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مشہور یونانی فلسفی سقراط کا قول ہے۔

”جب متنازع فیہا مسئلہ کا پتہ چل جائے اس وقت نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔“

۳۔ ترغیب و تشویق اور مزاج کا اختلاف

لوگوں میں ترغیب و تشویق کا اختلاف بھی نظریاتی اختلاف کے موجبات میں سے ایک ہے جس طرح نئی نوع انسان کے جذبات و خواہشات میں فرق و امتیاز پایا جاتا ہے اسی طرح ان کے افکار و نظریات بھی جدا گانہ نوعیت کے ہوتے ہیں، اور ہر شخص اپنے نفسانی جذبات کے دائرہ میں محدود رہ کر غور و فکر کرتا ہے۔ مشہور فلسفی اسپینزا کہتا ہے :-

”یہ شوق و رغبت ہی کی کار فرمائی ہے جس کی بناء پر ہمیں چیزیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں بصیرت

انسانی اس حسن و جمال کی موجب نہیں۔ رغبت و شوق کا یہ جذبہ اشیاء و افکار کے حسن و قبح کے معیار و مدار پر چھا جاتا ہے اور وہ چیز اسی جذبہ کے تحت اچھی یا بُری دکھائی دیتی ہے۔
ولیم جیمس کہتا ہے:- ✓

” فلسفہ کی تاریخ دراصل بنی نوع انسان کے مزاج ہائے مختلفہ کے باہمی تصادم و کش مکش کی تاریخ ہے۔ مزاج انسانی کا یہ اختلاف و تصادم ادب و فن اور حکومت کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“

۵۔ اختلاف میلان و رجحان | رجحان و میلان کا اختلاف بھی اسباب اختلاف میں سے ایک ہے۔ انسانی زندگی کے بارے میں لوگوں کے یہاں جو مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں ان کی بنا پر ہر شخص کا طرزِ فکر و نظر اسی رجحان کے تابع ہوتا ہے۔ اور اس کے افکار و آراء اسی جانب جاری و ساری رہتے ہیں۔ رسائل انخوان الصفا کی تیسری جلد میں رقم ہے:-

” قیاسات کئی طرح کے ہوتے ہیں اور مختلف صنائع اور قوانین و علوم کے اصولوں کے اعتبار سے ان میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً فقہاء کے قیاسات اطباء سے مختلف انواع ہوتے ہیں۔ اہل نجوم اور نحویوں کے قیاسات میں فرق ہوتا ہے متکلمین کے قیاسات کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ فلاسفہ و مناطقہ کے قیاسات اہل جدل اور ماہرینِ طبیعیات و الہیات کے قیاسات سے جدا گانہ نوعیت کے ہوتے ہیں۔“

جب تمام علوم کے ماہرین میں علمی رجحانات کی اساس پر فکری رجحانات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے تو موضوعِ فکر و نظر کے متحد ہونے کی صورت میں بھی ایک قیاس کے ماننے والے دوسری طرز کے صحابِ قیاس سے مختلف الخیال ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص اپنے مخصوص علمی مسالک و منہاج کا علمبردار ہوتا ہے۔ اس کی مثال متکلمین و فقہاء کا وہ اختلاف ہے۔ جو خلقِ قرآن کے مسئلہ میں رونما ہوا۔ ان کا یہ اختلاف جدا گانہ مسلک و منہج پر مبنی ہے۔ کیونکہ فقہاء اپنے قیاسات میں کتاب و سنت پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جب کہ متکلمین صرف عقلی قیاسات پر گامزن ہیں۔

۶۔ سابق علماء کی تقلید | سابق علماء کی تقلید اور ان کی نقالی کا جذبہ بھی اسبابِ اختلاف میں سے ایک ہے۔ تقلید کا لبادہ اوڑھتے والے اس بات کی طرف مطلقاً دھیان نہیں دیتے کہ عقل و نظر کا تقاضا کیا ہے۔ تقلید کا جذبہ غیر شعوری طور پر ان کے رگ و پے میں

سماجاتا ہے اور وہ (انکھیں بند کئے) اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ دراصل مردِ زمان سے بعض افکارِ تقدیر کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح انسانی قلوب و اذہان پر چھا جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقلِ انسانی حسن و قبح کے نیٹے نیٹے پیمانے گھڑنا شروع کر دیتی ہے جس سے اختلاف و مجادلہ کی زد پیدا ہوتی ہے جو کہیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ اس غیر متناسبی بدل و بحث کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کہ شخص بدل و مناظرہ میں اس وقت حصہ لیتا ہے جب وہ نادانستہ طور پر اسلاف کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ تقلید سے تعصب کی بیماری جنم لیتی ہے۔ کیونکہ مخصوص افکار و نظریات کو تقدیر کا درجہ دینے سے طبعاً تعصب کا جذبہ ابھرتا ہے اور جہاں شدید قسم کا تعصب پیدا ہو جاتا ہے وہاں اختلاف بھی شدید نوعیت کا ہوتا ہے۔

تعصب جس طرح تقلید سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات اس کا موجب عصبی ضعف بھی ہوتا ہے۔ موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کرنے کا نتیجہ بھی تعصب کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ کیونکہ مقلد ہمیشہ ایک ہی پہلو کو دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ ایمانی قوت شاذ و نادر ہی تعصب کی موجب ہوتی ہے۔

فہم و ادراک کا مختلف ہونا | فہم و ادراک کے درجات کا تفاوت بھی بعض اوقات اختلاف کا موجب بنتا ہے بعض لوگ بجز حقیقت کی غواصی کرتے ہیں

بعض اس کے ایک حصہ تک پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں۔ بعض پروہم کا غلبہ ہو جاتا ہے بعض موروثی خیالات کے چکر ہی میں پھنسے رہتے ہیں اور اس سے نکل نہیں پاتے۔

عجیب بات یہ ہے کہ صرف عوام ہی اویام پرستی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات علماء پر ایسے توہمات کا غلبہ ہوتا ہے جس سے ان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۱۵۳۲۰

رسائل انخوان الصفاء میں لکھتے ہیں۔

”بہت سے لوگ بڑے بلند خیال و دقیقہ رس قوی الحافظہ اور سریع الفہم ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس بعض لوگ بڑے کند ذہن و دل کے اندھے اور سہو و نسیان کے عادی ہوتے

ہیں۔ قوتِ فہم و ادراک کا یہ تفاوت بھی علماء کے فکری اختلاف کا ایک سبب ہے۔ کیونکہ جب

ان کی قوتِ فہم و ادراک یکساں نوعیت کی نہیں تو لامحالہ ان کے افکار و عقائد میں بھی فرق ہوگا۔“

بلاشبہ یہ ایک حق بات ہے۔ قوتِ فہم و ادراک کا فرق مراتبِ عقل کے مراتب و نتائج میں بھی اختلاف

موجب ہوگا۔ آخر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک شاعر مزاج شخص جس پر عشق و محبت کا بہت سوار ہے، ایک علمی مسئلہ پر شور و فکر کرتے وقت ایک منطقی اور ناہیر ریاضیات کا ہم خیال ہوگا جو اسباب و نتائج میں زبردست ربط و اتحاد پیدا کرنے کا عادی ہے۔

۸۔ حب ریاست و جاہ بھی اسباب اختلاف میں شامل ہے خصوصاً سیاسیات میں حکومت و سلطنت کے بہت سے خواہشمند بعض ایسے آراء و افکار کی جانب رجوع کرتے ہیں جن کا منظر فقط ان کی ذاتی خواہشات ہوتی ہیں۔ پھر وہ (خیالات باطلہ) کی تائید و توثیق میں مصروف کار رہتے ہیں یہاں تک کہ انہیں محسوس ہوتا ہے وہ اپنی دعوت میں مخلص ہیں اور حق و صواب صرف اسی میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ بعض اوقات قومی عصری تعصب بھی اختلاف کا موجب بنتا ہے۔ یہ بھی حب جاہ و ریاست میں شامل ہے۔

بعض اوقات حاکمانِ بلائ کے ایسے اعوان و انصار ہوتے ہیں جو اس کی تائید و نصرت کے لئے سرگرم رہتے اور اس کے افکار و آراء کی تشہیر و اشاعت کا فریضہ بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ وہ بعض اوقات یہ کہہ کر اپنے آپ کو مبتلائے فریب کرتے ہیں کہ ان کی دعوت حق و صداقت کی ترجمان ہے۔ اس ہم کے لوگ دراصل نوع انسانی کے لئے بڑے خطرے کا موجب ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

✓ مجھے اپنی امت کے بارے میں جس شخص سے زیادہ خطرہ لاحق ہے وہ ایک منافق آدمی ہے جس کی زبان بڑی حکمتی چٹری مگر اس کا دل نور حکمت سے خالی ہے وہ اپنی فصاحت و بلاغت سے لوگوں میں انقلاب پیدا کرتا اور اپنی جہالت کے باعث ان کی گمراہی کا موجب بنتا ہے۔

۹۔ یہ ہیں لوگوں کے باہمی اختلاف کے بعض اسباب جو علمی موضوعات و مباحث میں رونما ہوئے۔ اختلاف کے یہ اسباب یکساں طور پر تمام ممالک و درجہ موضوعات و مطالب میں پائے جاتے ہیں اور کسی خاص ملک و موضوع کے ساتھ مخصوص نہیں۔ زید برآں یہ اسباب لوگوں کے تمام اختلافی مباحث میں نمایاں ہیں مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے اسباب کچھ اور بھی ہیں۔ چنانچہ اب ہم وہ مخصوص اسباب ذکر کرتے ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے اختلاف کے اسباب

مسلمانوں کا باہمی اختلاف | ۱۰۔ مسلمانوں کے یہاں اعتقادی سیاسی اور فقہی مسائل اور اس کے اسباب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسباب اختلاف کی نشان دہی کرنے سے قبل ہم دو باتیں واضح کر دیتا چاہتے ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہاں دین کے اصولی و اساسی مسائل میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ مثلاً مندرجہ ذیل مسائل میں مسلمان ہمیشہ یک زبان رہے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

(۳) قرآن کا منزل من اللہ ہونا

(۴) قرآن آنحضور کا عظیم ترین معجزہ ہے۔

(۵) قرآن کا نسلاً بعد نسل بطریق متواتر نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچنا۔

(۶) ارکان و فرائض مثلاً نماز پنجگانہ، زکوٰۃ، حج، روزہ اور ان عبادات کی ادائیگی کا طریق

بالحفاظ صحیح تریوں کہئے کہ ارکان اسلامی اور ایسے امور میں مسلمانوں کے یہاں کبھی اختلاف

رو نما نہیں ہوا جو ضروریات دین میں شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً خمر و خمرزیر اور مردار کی حرمت اور

میراث کے قواعد عامہ۔ اختلاف ان مسائل میں رو نما ہوا جو نہ تو ارکان میں شمار ہوتے ہیں اور

نہ دین کے اصول عامہ میں داخل ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ اختلاف بعض اعتقادی و سیاسی مسائل کے اختلاف سے بلاشبہ

مذموم تر ہے۔

○ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو کالہ الا اللہ کے کلمات و روزبان تھے۔ چہرہ مبارک لال

پیلا ہو رہا تھا۔ فرمایا عربوں کے لئے اس شرکی و جہ سے بڑی خرابی درپیش ہے جو قریب آچکی

ہے۔ اس سے آپ کا اشارہ مسلمانوں میں پیدا ہونے والے اختلافات کی جانب تھا۔

○ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا یہود اکثر فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ نصاریٰ بہتر

گروہوں میں منقسم ہوئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ روایت متعدد طرق سے منقول ہے اور محدثین نے اس کی صحت کے بارے میں گفتگو کی ہے۔

علامہ المقبلی اپنی کتاب العلم الشاخ میں لکھتے ہیں:

”ستر فرقوں میں بٹ جانے والی حدیث متعدد طرق سے منقول ہے۔ ایک روایت سے دوسری روایات کی تائید ہوتی ہے اور اس طرح اس کے معنی و مفہوم میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔“

اگرچہ امتقادی اختلاف بحیثیت مجموعی مذہبوم ہے۔ مگر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کتاب و سنت کے اساسی مسائل کے علاوہ فروعی فقہیہ میں جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس حد تک قابل مذمت نہیں بلکہ کتاب و سنت کے مطالب و معانی پر نظر غائر ڈالنے اور ان سے قیاسات استنباط کرنے کا ایک قوی ذریعہ ہے۔ یہ ایک نظری و فکری قسم کا اختلاف ہے۔ جیسے اقراق و تشتت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہر فقہیہ کا مصدر و ماخذ وہی ہوتا تھا جو دوسرے فقہیہ کا۔ بعض اوقات اس کے خیالات دیگر فقہاء کے نظریات سے ہم آہنگ ہوتے اور کبھی مخالف ہوتے۔

عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام کے فروعی اختلاف سے مسرت محسوس کرتے تھے ان کا ارشاد گرامی ہے۔

”میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اگر (فروعی مسائل) میں صحابہ کا ایک قول ہوتا تو لوگوں کو اس سے بڑی تکلیف ہوتی صحابہ کرام امہ دین تھے جن کی پیروی کی جاتی ہے اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے قول پر عمل کرے گا تو اسے سنت تصور کیا جائے گا۔“

ایک اہم سوال | ۱۱۔ ایک سائل یہ دریافت کر سکتا ہے کہ آنحضرت کے بعد لوگوں میں اختلاف تھا جس میں شب و روز کی کوئی تفریق نہیں مزید براں آپ ان میں کتاب و سنت کی مشعل فروزاں چھوڑ گئے تھے جس کی موجودگی میں گمراہ ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دور میں اختلاف کے متعدد اسباب تھے۔ اختلاف بھی ایک قسم کا نہیں ہوتا بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک قسم کا اختلاف وہ ہے جس سے امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہوتا اور نہ خانہ جنگی کی فضا ہوتی ہے۔

(۲) دوسری قسم کا اختلاف وحدت امت کو زائل کر کے گروہ بندی اور تحزب و تفرق کو جنم دے ہے ایسا اختلاف سیاسیات اور حکومت و سلطنت کے معاملات میں آجا کر ہوتا ہے۔

اب ہم ہر دو صنف اختلاف کے اسباب ذکر کرتے ہیں :-

۱۔ عربی عصبیت | ۱۲۔ عربی عصبیت بھی اسباب اختلاف میں سے ایک ہے بلکہ یہ ان کے

وجہ و جہہ ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ لغویں کتاب و سنت عصبیت کے خلاف اعلان حرب و پیکار کر رہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور پھر شاخیں اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تم پہچان سکو۔

”يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا“

نبی کریم نے فرمایا:

جو عصبیت کی طرف دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں

”لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَىٰ عَصَبِيَّةٍ“

دوسری جگہ فرمایا:

تمام انسان اولاد آدم ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے کسی عربی کو عجمی پر تقویٰ کے بغیر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

”كُلُّكُمْ لَادِمٌ قَادِمٌ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَىٰ آعَجَبِيٍّ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ“

آنحضرت کے عہد سعادت میں براہین کتاب و سنت کے زیر اثر عصبیت خلیفہ شہید حضرت عثمان

کے عہد خلافت تک پوشیدہ رہی۔ آپ کے عہد خلافت کے اواخر میں عصبیت بڑے زور شور

اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اولاً امویوں اور ہاشمیوں میں اختلافات نے سر نکالا۔ پھر خوا

اور غیر خواج کے مابین تنازعات پیدا ہوئے۔ خارجی مذہب زیادہ تر قبائل ربیعہ میں پھیلا پھو

مضرب قبائل اس سے بہت کم متاثر ہوئے۔ ربیعہ و مضر کے قبائل کا اختلاف دور جاہلیت

معروف چلا آتا ہے۔ ظہور اسلام کے زمانہ میں یہ نزاع دھوڑی دیر کے لئے چھپ گیا اور

خارجی مذہب کی صورت میں منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو گیا۔

۲۔ خلافت میں نزاع | ۱۳۔ سیاسی اختلافات کا جوہری و بنیادی سبب یہ نزاع تھا

۴۔ مسلمانوں کے اختلاف کی حدود

۲۰۔ یہ ہیں اختلاف کے بعض اسباب! اختلاف کے مظاہر ہمیشہ رونما ہوتے ہیں مگر اس کے عوامل و اسباب پس پردہ رہتے ہیں۔ کبھی بعض اسباب نظر کے سامنے ہوتے ہیں اور بعض تاریخ کے بھنور میں چھپے رہنے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ بعض اوقات اختلاف کا قریبی سبب ایک جزئی واقعہ ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے اصولی و بنیادی اختلافات کی ایک دنیا پوشیدہ ہوتی ہے جو اسے وجود میں لاتی ہے۔ نفوس طبائع اور فہم انسانی میں غور و فکر کرنے اور تحقیق و تفحص سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے قابل ذکر مظہر دو ہیں۔ (۱) ایک عملی (۲) اور دوسرا علمی۔ عملی اختلاف کی مثال وہ اختلاف ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور باغیوں کے درمیان رونما ہوا۔ یا جو اختلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ اور خوارج کے مابین وقوع پذیر ہوا حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور امویوں کا اختلاف بھی اسی نوع کا تھا۔ خوارج کا امویوں اور قبل ازیں حضرت علی سے جو اختلاف ہوا وہ بھی عملی اختلاف میں داخل ہے۔ یہ تاریخ اسلام کے سیاسی حوادث ہیں جنہیں تاریخ نے ہمیشہ کے لئے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا اس کے علمی اسباب کی نشان دہی کی اور اسباب و نتائج کا باہمی ربط و تعلق واضح کیا۔

جو شخص علوم و مذاہب کی تاریخ قلمبند کرنا چاہتا ہے اور صرف واقعات و حوادث کو جمع کرنا اس کے پیش نظر نہیں۔ اس کے نزدیک اہمیت کی حامل صرف یہ بات ہے کہ یہ واقعات کس حد تک فکری مذاہب پر اثر انداز ہوئے اور فکری مذاہب نے ان پر کیا اثر ڈالا۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنو امیہ کے مابین جو اختلاف پیدا ہوا اس کا باعث و محرک صرف یہ نزاع تھا کہ انتخاب خلیفہ کا حق کسے حاصل ہے؟ کیا صرف اہل مدینہ یہ استحقاق رکھتے ہیں اور لوگ ان کے تابع ہیں یا اس کے برعکس انعقادِ خلافت میں جمیع بلاد و اقصاء کے مسلمانوں کا شرکت کرنا ضروری ہے؟

حضرت علی اور بنو امیہ کے شدید اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ خوارج اور دیگر مختلف قسم کے

فرقے منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو گئے۔ خوارج پہلے پہل حضرت علی کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور پھر بنو امیہ کے خلاف ڈٹ گئے شیعہ کے معرض ظہور میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ و جدل کا بے پیمانہ سلسلہ شروع ہوا جو عباسی خلافت کے قائم ہونے پر انجام کو پہنچا۔ عباسیہ آغاز دعوت میں شیعہ مذہب رکھتے تھے سیاسی مذاہب اور واقعات و حوادث کی یہ کش مکش جاری رہی۔ جس نے آگے چل کر شدید خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔

۲۱۔ یہ اس دور میں عملی و نظری اختلاف کے فعال عہد سلف کے اختلاف کی اہمیت | انفعال کا تذکرہ ہے جب نظر و فکر کی اساسات

مسلمانوں میں خلافت کا انعقاد ہو رہا تھا اور ابھی حصول اقتدار کی خاطر ملوک و سلاطین کی باہر آویزش کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ یہ اختلاف سلاطین و ملوک کی خانہ جنگی کے لئے نقطہ آغاز کی حیثیت رکھتا ہے اور شاہان عالم اسی راہ سے داخل ہو کر مسلمانوں حکومت چلانے لگے اور ان کی گردنوں کے مالک بن بیٹھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ضمن میں ارشاد فرمایا: "خلافت (نبیابت رسول) میرے بعد صرف تیس سال تک ہوگی۔ پھر استبداد کا دور دورہ ہوگا۔" یہ حقیقت ہے کہ اگر حضرت عثمان و علی کے عہد خلافت میں اختلاف رونما نہ ہوتے تو اموی خلافت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوتا۔ آگے چل کر اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ خلافت کی جگہ ملوک نے لے لی۔ کبھی کوئی عادل شخص بھی تخت حکومت پر فائز ہو جاتا مگر زیادہ تر اس منصب عالی پر ظلم پیشہ لوگ مسلط رہتے۔

۲۲۔ دوسری قسم کا اختلاف علمی و نظری انداز کا تھا جو متنازعہ فکری و اعتقادی کے مابین بعض اعتقادی و فروعی مسائل میں پیدا ہوا۔ یہ حقیقت ہے

کہ فقہی و اعتقادی نوعیت کا اختلاف فکر و نظر کی حد تک محدود رہا۔ جو علماء ان مباحث میں حصہ لیتے تھے ان کے یہاں کبھی ایسا اختلاف پیدا نہیں ہوا جب تلوار استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ علمی زندگی اس بات کے حق میں تھی کہ اختلاف کو نظری و فکری حدود سے نکال کر میدان حرب و پیکار تک پہنچادیں۔ نظری اختلاف میں یہ حدت و شدت بھی نہیں تھی جو اسے عملی اختلاف میں بدل دیتی۔ حدت و شدت کا مظہر زیادہ سے زیادہ یہ امر تھا کہ وہ دوسرے کو خطا کار یا بدعتی کہنے پر اکتفا کرتے۔ اس سے بڑھ کر فقہی اختلاف نظر و فکر کے اختلاف سے تجاوز نہ کر سکا۔ فرقہ بندی ایک دوسرے کے حق میں کہا کرتے تھے :-

”ہماری رائے درست ہے مگر اس میں خطا کا احتمال موجود ہے۔ فریق مخالف کا نقطہ نظر غلط ہے مگر صحت کے احتمال سے خالی نہیں“

فکری و نظری اختلاف میں عملی اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ البتہ بعض سلاطین و خلفاء کی وقت بعض علماء کو سزا دینے پر تکل جاتے تھے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی تھی کہ وہ عالم علمی تیار سے ایک ایسی راہ پر گامزن ہوتا جسے وہ اپنے لئے خطرناک تصور کرتے تھے اور انہیں خطرہ لاحق ہوتا تھا کہ عوام الناس ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ گویا سزا دینے کا موجب بات سے روکنا ہوتا تھا نہ کہ کوئی مخصوص علمی مسئلہ۔ یا وہ اس عالم کے خیالات کو فتنہ پرور کا موجب سمجھتے تھے۔ یا خروج عن الاسلام اور الحاد و زندقہ پر محمول کرتے۔ مگر اس کے پس پردہ سیاسی مقاصد کارفرما ہوتے تھے۔ کیونکہ بعض اوقات الحاد و زندقہ بھی سیاسی دعوت کا شیخمہ ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً وہ زندقہ جو خلافت عباسیہ میں خلیفہ مہدی کے عہد اقتدار میں دارہو جس سے مہدی بڑا مشتعل ہوا اور اس نے زندقہ کا استیصال کر دینا چاہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ الحاد و زندقہ دراصل خراسانی دعوت کی تمہید تھا جس کا مقصد اسلامی خلافت کو تاج کرنا تھا۔ اس کی طرح انہوں نے یوں ڈالنا چاہی کہ اسلامی افکار کو کمزور کر دیا جائے۔ ان کا اثر باقی نہ رہے۔ خلیفہ مہدی دو میدانوں میں زندقہ کے خلاف صف آراء ہوا۔ پہلے ہیں فکری میدان میں شکست دی اور ایسے علماء کو ان کے خلاف جدل و مناظرہ کے لئے کھڑا کیا۔ ان کے افکار باطلہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر دیں۔ پھر میدان جنگ میں ان سے لڑا اور مقتع خراسانی کو ٹھکانے لگایا جو ان مذاہب باطلہ کا حامی و موید تھا

اصول اساسی میں اختلاف نہیں | ۲۳۔ بہر کیفیت نظری اختلاف کسی درجہ کا بھی ہو۔ اس کا تعلق سیاسیات سے ہو، اعتقادات

یا فقہی فروعات سے اس کا اسلام کے معزز و جوہر سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اختلاف ایسے امور میں واقع نہیں ہوا جس کا ضروریات دین میں سے ہونا قطعی و حتمی ہو۔ یہ اختلاف ایسے اصول و قواعد میں بھی نہیں جو ناقابل انکار ہو اور نہ ان ارکان میں جن پر دین اسلام کی عمارت کھڑی ہے۔

جب کوئی شخص اساسی عقائد میں مسلمانوں سے اختلاف رکھتا ہو تو ایسا شخص علماء کی زمرہ اہل اسلام سے خارج ہے مثلاً حضرت علی کے عہد خلافت میں ایک فرقہ رونما ہوا

جس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت علی میں حلول کر آئے ہیں اس فرقے کو بہائیہ کہتے تھے۔ ایک دوسرے فرقے کا اعتقاد تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب پیغام رسالت لے آئے۔ ان کو غرابیہ کہا جاتا ہے۔ ان بات پر جمہور اہل اسلام کا اجماع ہے کہ یہ دونوں فرقے دائرہ اسلام سے خارج ہیں، خوارج میں ایک ایسا فرقہ بھی پایا جاتا ہے۔ جو سورہ یوسف کا منکر ہے۔ یہ بھی زمرہ اہل اسلام سے خارج ہے۔

نتیجہٴ ابحاثِ سابقہ | ۲۴ - بیاناتِ سابقہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اسلامی فرقوں کی تین اقسام ہیں :-

(۱) سیاسی فرقے جن کے اختلاف نے عملی صورت اختیار کر لی اور جن میں بعض اوقات جنگ کے شعلے بھی بھڑک اٹھتے تھے۔

(۲) اعتقادی فرقے جن کا اختلاف فکر و نظر تک محدود تھا۔

(۳) فقہی مکتبہ ہائے خیال جو خیر و برکت کا موجب ہیں۔

اب ہم ایک ایک کر کے ان کی تفصیلات بیان کریں گے۔

سیاسی مذاہب

قسم اول

۵۔ سیاسی مذاہب

مسئلہ خلافت کی اہمیت | ۱۔ تمام سیاسی فرق و مذاہب کا محور و مرکز مسئلہ خلافت ہے۔ خلافت دراصل امامت کبریٰ کو کہتے ہیں۔ اسے خلافت

سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ مسلمانوں کا حاکم اعظم ہوتا ہے اور مسلمانوں سے متعلق امور میں اس کی نیابت و قائم مقامی کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ خلافت کو امامت سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ امام بھی کہا جاتا تھا۔ نیز اس لئے کہ خلیفہ واجب الاطاعت ہوتا ہے اور لوگ اس طرح اس کی پیروی کا دم بھرتے ہیں جیسے امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جاتی ہے۔

نبی کریم کی نیابت کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں میں ایک خلیفہ موجود ہو جو ان کے دنیوی مصالح کا نگران ہو، دین اسلام کے تحفظ کا فریضہ ادا کرتا ہو، مسلمانوں کی آزادی عقیدہ و مذہب اور حریت نفس و مال بھی اسی سے وابستہ ہو۔

تفسیر تاریخ کا بانی اور مورخ شہیرا بن خلدون رقمطراز ہے کہ حکومت کی تین قسمیں ہیں (۱) ملک طبعی (۲) ملک سیاسی (۳) ملک نبوی۔ وہ لکھتے ہیں :-

۱۔ ملک طبعی حکومت مراد یہ ہے کہ سب لوگ کو انوائس مفاد و شہوات و جذبات کے تقاضے پورے پر آمادہ کیا جائے۔

۲۔ سیاسی حکومت وہ ہے جو عقل و فکر کی روشنی میں جلب مصالح اور دفع مضرات پر آمادہ کرے۔

۳۔ خلافت سے مراد ایسی حکومت ہے جو دنیوی و اخروی مصالح کو شرع اسلامی کی روشنی میں انجام

دینے کی تلقین کرتی ہو۔ شارع کی نگاہ میں تمام دنیوی احوال اپنے دامن میں اخروی مصلحت رکھتے

ہیں۔ گویا خلیفہ تحفظ دین اور دنیوی سیاست کی دیکھ بھال کرنے میں شارع کا نائب و قائم مقام ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا یہ بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ ان اقسام ثلاثہ میں حد قاصد حکومت

کی اساس و بنیاد ہے۔ اگر حکومت کی بنیاد صرف سیاسی غلبہ و تسلط پر رکھی گئی ہو تو اسے طبعی حکومت

کہتے ہیں کیونکہ انسان کی طبیعت میں سلطنت و حکومت کا طبعیہ پایا جاتا ہے۔ جب حکومت کی اساس

سیاسی غلبہ پر رکھی گئی ہو تو یہ حکومت بادشاہ کی شخصی خواہش و رغبت پر مبنی ہوگی۔ جس

کے دل میں کھوٹ ہے وہ اس کے لئے کس قدر خوش آئند نام تجویز کریں مگر

اس کی حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے۔ اگر حکومت کی اساس عقلی احکام پر رکھی گئی ہو تو اسے

سیاسی حکومت کے نام سے موسوم کریں گے۔ اور اگر حکومت کی اصل و اساس دین ہو تو اس کا نام خلافت ہوگا۔

۲۔ ابن خلدون کی یہ تقسیم قابل تحسین ہے۔ مگر ہم
ابن خلدون کا نظریہ تنقید و تبصرہ کی نگاہ میں | یہ تبادلیا چاہتے ہیں کہ اسلام میں خلافت نبوت

عقلی احکام اور لوگوں کی مصلحت کو بھی پیش نظر رکھتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت چلانے کے بارے میں بہت کم شرعی نصوص وارد ہوئی ہیں جن سے احکام کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ لہذا عقل کی روشنی میں مگر شریعت کے زیر سایہ حکومت کے معاملات کو حل کرنا ازس ناگزیر ہے۔ جس طرح احکام صادر کرتے وقت مصالح کو پیش نظر رکھا جاتا ہے مگر اس کی اساس شریعت اسلامیہ پر رکھی جاتی ہے۔ تاکہ یہ احکام دین حق سے ہم آہنگ ہوں اور اس کے اصولِ مسلمہ میں سے کسی سے بھی متصادم نہ ہوں۔

ابن خلدون نے جس خلافت کا تذکرہ کیا ہے جس میں بقول ان کے دینی اوامر کے پہلو بہ پہلو مصلحت پر مشتمل احکام بھی جمع ہو گئے تھے خلفاء راشدین کے عہد میں متحقق ہوئی تھی۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین شرعی حدود کو نافذ کرتے دینی احکام کا اجراء کرتے اور ان پر عامل ہونے میں لوگوں کی نگرانی کرتے۔ دین اسلام کی طرف دعوت دیتے اور جو مسائل محمل و مبہم ہوتے تھے ان کی توضیح کیا کرتے تھے اس کے دوش بدوش لوگوں کی بہبود و مصلحت کو بھی نظر انداز نہ کرتے اس لئے کہ حقیقی مصلحت بلاشبہ شرعی مصلحت ہوتی ہے۔ محرکات اشیاء میں سے جن کو مصلحت تصور کیا جاتا ہے وہ باطل میں اور ان میں مصلحت کا پہلو سرف ظاہری ہے حقیقی نہیں۔

ایک ایسی دینی خلافت کا قیام جو عدل کو قائم رکھتی اور ظلم کو روکتی ہو تمام اسلامی فرقوں کے

نزدیک ازس ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں محدث ابن حزم فرماتے ہیں: O

”و جوب امامت پر تمام اہل سنت مرجعہ اور جمیع خوارج کا اتفاق ہے۔ ان سب فرقوں

کی رائے میں ایک امام عادل کی اطاعت ضروری ہے جو خدا کے احکام کو جاری کرتا اور لوگوں

کو ان احکام پر چلاتا ہو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے۔ البتہ خوارج کا فرقہ التجرات

پر عقدرہ رکھتا ہے کہ قیام خلافت ضروری نہیں صرف حق پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ہمارا

خیال ہے کہ یہ فرقہ تفریباً مٹ چکا ہے اور اب ان میں سے کوئی فرد کمرہ ارضی پر باقی نہیں۔ یہ

فرقہ نجدہ بن عوف حنفی کی جانب منسوب ہے جو یامہ میں سکونت پذیر تھا۔ اس فرقے کا قول

ساقط عن الاحتجاج ہے۔ ان کی تردید اور بطلان کے لئے ان لوگوں کا اجماع ہی کافی

ہے جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ کتاب و سنت میں امام کے وجود کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

”أَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَ
أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ“ | اللہ تعالیٰ رسول علیہ السلام اور اوصی الامر
کی اطاعت کیجئے۔

بیشتر احادیث صحیحہ سے بھی وجوب امامت ثابت ہے۔

امارت کی اہمیت و ضرورت | ۳۔ اجماع صرف اسی بات پر منعقد نہیں ہوا کہ خلافتِ نبوت کا قیام واجب ہے بلکہ اس بات پر بھی سب علماء کا

اتفاق ہے کہ جب ایسی خلافت کا انعقاد ممکن نہ ہو جو نیا بت نبوت کا فریضہ انجام دیتی ہو تو ایسے حالات میں ایک دینی حاکم کا وجود بے حد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوارج نے جب ”لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ“

(حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے) کہہ کر حضرت علی کی مخالفت کی تو آپ نے فرمایا ”خوارج کی یہ بات درست ہے مگر اس سے غلط مفہوم مراد لیا جا رہا ہے۔“ یہ درست ہے کہ حکومت کی سزاوار صرف

ذاتِ خداوندی ہے۔ مگر خوارج کہتے ہیں کہ امیر بھی خدا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ امیر کا وجود ضروری ہے نیک ہو یا بد۔ مومن اس کے عہدِ امارت میں خداوندی احکام پر عمل کرے اور کافر

بھی اس سے فائدہ اٹھائے۔ امیر کی بدولت مالِ غنیمت جمع کیا جائے گا۔ اعداء دین سے لڑیں گے راستے پر امن ہوں گے۔ طاقتور سے کمزور کا حق وصول کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نیکو کار امن و

چین کی زندگی بسر کریں گے اور بدکاروں سے نجات حاصل ہوگی۔“

حضرت علی کا ارشاد گرامی اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ امارت سے چارہ نہیں۔ بعض علماء امامت کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔

(۱) وہ امامت جو نیا بت نبوت کا فریضہ ادا کرتی ہو۔ اس کے شرائط ہم آگے چل کر بیان کریں گے اور اس میں علماء کا اختلاف بھی ذکر کریں گے۔

(۲) جب خلافت نبوت کے شرائط موجود نہ ہوں تو وہ خلافت قائم کی جائے گی جو نبوت کی قائم مقام نہیں اور اس کے اقوال کی پیروی کی جائے گی مگر یہ کوشش جاری رہے گی کہ خلافت علی منہاج النبوت قائم کی جائے جیسا کہ آگے چل کر اس پر روشنی ڈالی جائے گی۔

سیاست میں اختلافی امور | ۴۔ علماء کے یہاں سیاسیات میں اختلاف رونما ہوا ہے۔ اس اختلاف کا محور و مرکز چار امور تھے :-

(۱) کیا ایک ہی خلیفہ کا ہونا ضروری ہے یا بہ یک وقت دو خلیفے بھی ہو سکتے ہیں۔



(۲) کیا خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

(۳) کیا خلیفہ گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے یا نہیں؟

(۴) کیا خلافت کا کسی قریشی خالوادہ میں ہونا ضروری ہے یا نہیں؟

یہ ہیں اہم اختلافی امور سیاسی فرقوں کا حال بیان کرتے وقت ہم بتائیں گے کہ وہ ان امور میں کیا رائے رکھتے تھے اور دیگر مسائل میں ان کا زاویہ نگاہ کیا تھا۔ متذکرۃ الصداق امور کے علاوہ ایک اور مسئلہ بھی یہاں قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ انتخاب خلیفہ کا طریق کیا ہے؟ آگے چل کر ہم اس پر بھی تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

۵۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ مسئلہ خلافت میں جو اختلاف رونما ہوا تھا وہ ان مذاہب کے عالم وجود میں آنے کے لئے

فرقہ واری کا نقطہ آغاز

نقطہ آغاز کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کسی فرقہ کے منصفہ شہود پر جلوہ گر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل فکر و نظر کی ایک جماعت اپنے مخصوص طرز و منہاج کے پیش نظر چند واضح قسم کے اصول وضع کریں۔ پھر اس منہج و مسلک کی پشت پناہی اور تائید و توثیق کے لئے ایک خاص مکتب خیال ہو جو جدل و بحث اور تبلیغ و تدریس کے ذریعہ اس کی اشاعت کا فریضہ ادا کرتا رہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ فرق و مذاہب آغاز اختلاف ہی میں پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ ہوتا یوں ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے پھر اختلافی اقوال میں بچنگی اور نکھار پیدا ہوتا جاتا ہے اور ہر فرقہ کے پیرو اپنے مخصوص افکار و نظریات سے آشنا ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح فرقہ واری کی بنیاد پڑتی ہے۔ بنا بریں دو امور کا واضح کرنا ہم پر ضروری ہے۔

(۱) اختلاف کے مراحل و ادوار

(۲) اس دور میں کونسے مسائل اتفاقی تھے اور کونسے اختلافی۔ یہ خلفاء راشدین کے عہد خلافت کا

ذکر ہے۔ اس کے بعد تو ائمہ کے عہد خلافت میں سیاسی فرق و مذاہب کی بنیاد پڑی۔

۶۔ مسئلہ خلافت میں اختلاف کے مراحل و ادوار

نبی کریم نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں فرمایا | ۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصراحتاً یا اشارتاً یہ نہیں فرمایا تھا کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہو۔ زیادہ

سے زیادہ حدیث نبوی میں یہ وارد ہوا ہے کہ آپ نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لئے مامور فرمایا تھا۔ جس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ حضرت ابوبکر کی امامت عامہ کی جانب ایک اشارہ تھا۔ علماء کا قول ہے :-

”جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا تھا (حضرت ابوبکر) کیلئے ہم انہیں اپنے دنیوی امور کے لئے منتخب نہ کریں“

مگر آنحضرت کے متذکرۃ الصدراشاد سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی، اس لئے کہ دنیوی سیاست کا امور عبادت سے کوئی تعلق نہیں۔ لہذا یہ اشارہ واضح نہیں ہے۔ مزید برآں سقیفہ بنی ساعدہ میں جب ہاجرین و انصار کے مابین تنازع پیدا ہوا کہ خلیفہ کس قبیلہ سے ہونا چاہئے تو کسی نے بھی یہ دلیل پیش نہ کی معلوم یہ ہوتا ہے کہ صحابہ امامت صلوٰۃ اور خلافت و امارت کو یکساں تصور نہیں کرتے تھے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر آپ کا اشارہ حضرت ابوبکر کی جانب ہوتا تو اس مسئلہ میں قطعی طور پر اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی۔

کتاب و سنت میں اصول خلافت کا عدم ذکر | ۷۔ یہاں پہنچ کر قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے اصول خلافت پر

کیونکر روشنی نہ ڈالی؟ نہ ہی حدیث نبوی نے بشرط خلافت کو واضح طور سے بیان کیا نہ یہ بتایا کہ خلیفہ کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے اس کی وجہ کیا ہے؟

ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ قرآن کریم نے اسلامی حکومت کے اصول سہ گانہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور وہ یہ ہیں (۱) عدالت (۲) شوریٰ (۳) اصحاب الامر کی اطاعت ضروری ہے البتہ اگر وہ احکام و ندی کی نافرمانی کا حکم صادر کریں تو ان کا حکم واجب التعمیل نہیں۔ ان الامر باذبالعول

یہ ثبوت عدل کے بارے میں قرآنی آیات اس قدر واضح ہیں کہ ان میں سے کسی شک و شبہ کی گنجائش (۱) کہ ان تک ”شوریٰ“ کی اہمیت و ضرورت کا تعلق ہے۔ آنحضرت نے بذات خود اس کا حکم صادر فرمایا تھا

اور یہ امر محتاج بیان نہیں کہ آپ کا حکم وحی الہی کا ترجمان تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے
 مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (آپ اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وحی کی ترجمانی فرماتے ہیں)
 اللہ تعالیٰ آنحضرت کو مشورہ کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

✓

وَسَاوِرْهُمْ فِي الْآخِرِ (آپ پیش آمدہ امور میں صحابہ سے مشورہ کیجئے۔

جس عاوشہ کے بارے میں کوئی نص وارد نہ ہوتی ہو اس کے بارے میں شوریٰ کو ایک عام اصول
 قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" روہ اپنی امور مشورہ سے طے کرتے ہیں)
 اولوالامر کی اطاعت نص قرآنی سے ثابت ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأَطِيعُوا الَّذِينَ آمَنُوا
 لایے ایمان والو! اللہ تعالیٰ رسول علیہ السلام اور اصحاب الامر کی اطاعت کیجئے۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:-

” ہر مومن پر اطاعتِ امیر واجب ہے مگر جب وہ خدا کی نافرمانی کا حکم دے تو اس وقت
 نہ سنا ضروری ہے اور نہ اس کی اطاعت کرنا۔“

دین اسلام نے یہ اصول ثلاثہ بیان کر کے ان ستونوں کی نشان دہی کر دی جس پر اسلامی
 حکومت کی عمارت کھڑی ہے۔ انتخابِ خلیفہ اس کی حکومت کی نگرانی اور اس کے حقوق کی حدود
 قیادت کی اساس شوریٰ پر رکھی گئی ہے ظاہر ہے کہ شوریٰ میں اقوام و قبائل ماحول اور گروہ پیش
 کے اعتبار سے تسمیٹی پیدا ہوتی رہتی ہے لہذا اگر شریعت اسلام میں اس کا ایک خاص طریقہ مقرر کر
 دیتی تو وہ ناقابل قبول ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام و قبائل کے اختلاف کے پیش نظر آپ نے شوریٰ
 کا کوئی خاص طریقہ و نظام متعین نہ فرمایا بلکہ اسے لوگوں کی رائے پر کھلا رہنے دیا۔

جو امیر شوریٰ کی بنا پر انتخاب کیا جاتا ہے۔ وہ مطلق العنان حاکم نہیں ہوتا بلکہ اولادہ
 دینی احکام کا پابند ہوتا ہے کیونکہ شرعی احکام کی اطاعت حکومت کا اولین اور بنیادی مقصد ہے۔
 ثانیاً وہ شوریٰ کا پابند ہوتا ہے۔ لہذا ایسے لوگوں کا وجود اس کے لئے ازسرنو ضروری ہے۔
 جو اسے مشورہ دے سکیں اور راہِ راست پر گامزن رکھیں۔

آنحضرت کے بعد انتخابِ خلیفہ میں اختلاف | ان تہیدی سطور کے بعد ہم یہ بیان کرنا
 چاہتے ہیں کہ آنحضرت کے وصال کے بعد کسی
 صحابہ میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا کہ آنحضرت کی عدم موجودگی میں مسلمانوں کے امور کا نگران کون رہے گا۔

انصار کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ خلیفہ ان میں سے ہونا چاہئے۔ وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ان کو آنحضرت کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا اور اس طرح وہ دین کے اولین اعوان و انصار قرار پائے وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ آنحضرت نے خلافت و امامت کو کسی قبیلہ یا خاندان کے ساتھ مختص کر دیا ہے۔

فریق ثانی جس کے سربراہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے یہ نظریہ رکھتے تھے کہ خلافت ہاجورین کا حق ہے کیونکہ انہیں اسلام میں سبقت و تقدیم کا فخر حاصل ہوا۔ ہاجورین اس لئے بھی خلافت کے اہل ہیں کہ عرب کی گردنیں قریش کے سوا اور کسی کے آگے نہیں جھک سکتیں۔ تیسرا فریق خلافت کو بنی ہاشم میں اس لئے محدود تصور کرتا تھا کہ بنی ہاشم دومان نبوی سے وابستہ تھے۔ ان کے خیال میں حضرت علی خلافت کا اولین استحقاق رکھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی سبقت اسلام جذبہ جہاد اور دینی علم و فضل کے بل بوتے پر تمام بنی ہاشم میں ممتاز تھے۔

انتخاب خلیفہ میں یہ اختلاف تادیب یا قی نہ رہ سکا حضرت ابوبکر و عمر نے اپنی رائے سبقتی ساعدہ کے جمع کے سامنے پیش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ابوبکر کی بیعت خلافت کر لی گئی۔ اور اگر سعد بن عبادہ انصاری رضی اللہ عنہ کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو برطانیہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ آپ کی خلافت پر اجماع قائم ہو گیا۔ انصار کی رائے تاریخ کے اوراق میں دفن ہو کر رہ گئی اور اس کا کوئی داعی باقی نہ رہا۔ تیسری رائے خلیفہ ثالث کے عہد خلافت کے آخر تک باقی رہی۔

عہد ابوبکر و عمر میں عدم اختلاف | ۹۔ حضرت ابوبکر و عمر کے عہد خلافت اور عثمانی خلافت کے اواخر تک اختلاف بڑی حد تک ماند

پڑ گیا اور اس کی گرم بازاری باقی نہ رہی۔ اس کی وجہ وجہ یہ تھی کہ حضرت ابوبکر کی جاذب شخصیت اور حضرت عمر فاروق کی عدل پروری اور حزم و احتیاط نے اختلاف کو پھلتے پھولنے سے باز رکھا اور فتنہ سامانی پروان نہ چڑھ سکی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان جہاد میں مشغول تھے اور ان مسائل میں غور و فکر کر رہے تھے جو فتوحات اسلامی کا دائرہ وسیع ہونے سے مسلمانوں میں ابھر آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان کے تقریباً نصف عہد خلافت تک - بح اسلام مسلمانوں کے اختلافات کا تذکرہ کرنے سے یکسر خاموش ہے جب حضرت عثمان (۱) فت کا آخری دور آیا تو فتنہ و فساد نے پر پورے نکالنا شروع کر دیئے۔

۱۰۔ اختلاف کے اسباب ذکر کرتے سے پیشتر ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ خلفاء ثلاثہ کو خلیفہ منتخب کرنے کا

طریق کار کیا تھا۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ صحابہ انتخاب خلیفہ میں تین مختلف راستوں پر چلے تھے اور ہر خلیفہ کا طریق انتخاب دوسرے سے مختلف انداز کا تھا۔

پہلا طریقہ :- انتخاب کا طریق اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا طریقہ انتخاب تھا۔ یہ انتخاب نہایت قلیل وقت میں سقیفہ بنی ساعدہ میں انجام پایا۔

دوسرا طریقہ :- انتخاب کا طریق ثانی یہ تھا کہ حضرت ابو بکر نے حضرت عمر کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور تمام مسلمانوں سے آپ کی بیعت لی۔

تیسرا طریقہ :- تیسرا طریق انتخاب یہ ہے کہ خلیفہ سابق چند اشخاص کو منتخب کرے تاکہ

وہ اپنے میں سے ایک کو خلیفہ بنالیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب زخمی ہو گئے تھے تو اپنے آخری

وقت میں اسی طرح کیا تھا، آپ نے چھ اشخاص کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اپنے میں سے ایک کو

خلیفہ بن لیں اور اسے بیعت کے لئے جمہور مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ چنانچہ ان سب نے

حضرت عثمان کو منتخب کیا اور بیعت کے لئے پیش کیا اور سب لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ بعض

نے بادل نخواستہ بیعت کی مثلاً حضرت مقداد بن اسود نے بخوشی بیعت نہیں کی تھی بلکہ رفع نزاع

کے لئے بیعت کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

۱۱۔ اس طرح حضرت عثمان ذوالنورین کا انتخاب عمل میں آیا

عہد عثمان کی فتنہ سامانی آپ کے عہد خلافت میں شدید اختلاف رونما ہوا۔ ان اختلافات

کی بدولت ایسے فتنے معرض ظہور میں آئے جو بجز خدا کی طرح ہو جسے مارتے تھے بشرور و فتن کا یہ ظہور و

صدر و مسلمانوں کے سیاسی اقتراق کی جانب اولین قدم تھا جس سے آگے چل کر سیاسی مذاہب کی

داعیہ پٹی پڑی۔

عہد عثمان کے شرور و فتن اور شدید اختلافات کے متعدد اسباب تھے۔

۱۲۔ فتنہ پروری کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آپ نے

خلافت عثمانی میں فتنہ پروری کے اسباب ہاجرین اور اولین مجاہدین کبار کو مدینہ سے باہر

جانے کی اجازت دے دی اور وہ جا کر مفتوحہ ممالک میں آباد ہو گئے۔ حالانکہ حضرت عمر نے ان کو

مدینہ کی سکونت ترک کرنے سے منع کیا تھا اور صرف اسی صورت میں اجازت دیتے تھے جب کسی

صحابی کو کسی علاقہ کا والی مقرر کریں یا کسی لشکر کا سپہ سالار بنائیں۔ اس سے حضرت عمر کا مقصد یہ تھا کہ ان صحابہ کبار کے مشورہ سے مستفید ہوتے رہیں۔ آپ یہ خطرہ بھی محسوس کرتے تھے کہ حجاز پر اولین کے مدینہ سے باہر سکونت پذیر ہونے میں خطرات درپیش ہیں۔ ممکن ہے یہ صحابہ وہاں کے حکام پر تنقید کریں جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو۔ لہذا آپ نے ان کو مدینہ قیام پذیر رہنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ آپ پر تنقید کریں اور اس طرح آپ ان کے نقد و جرح سے مستفید ہوتے رہیں۔

جب حضرت عثمان نے حجاز پر اولین کو بیرون مدینہ سکونت گزینی کی اجازت دے دی تو وہ خلیفہ اور حکام دونوں کو اپنی تنقید کے تیروں سے چھلنی کرنے لگے۔ اس ضمن میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی تنقید ملاحظہ فرمائیے۔ وہ شام میں رہتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:-

”بجدا کچھ ایسے اعمال معرض ظہور میں آئے ہیں جن سے میں آشنا بھی نہیں نہ ان کا ذکر کتاب خداوندی میں ہے اور نہ سنت رسول میں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ حق کو مٹایا جا رہا ہے۔ ہال کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ سچے لوگوں کو جھٹلایا جا رہا ہے۔ لوگوں کو تقویٰ و طہارت کے بغیر مالی امور میں ترجیح دی جا رہی ہے۔“

آپ دیکھتے ہیں کہ ابوذر غفاری ایسے جلیل القدر صحابی کتنی زوردار عبارت میں حکام و وقت پر تنقید کر رہے ہیں۔ بلاشبہ عوام الناس اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خصوصاً وہ لوگ جو حکام سے پہلے ہی بیزار ہوں اور ایسے نظام حکومت کے عادی نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ حبیب فہری نے حضرت معاویہؓ کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ابوذر غفاری شام میں بغاوت پیدا کر دیں گے اگر تم امن قائم رکھنا چاہتے ہو تو اس کی فکر کرو۔ چنانچہ حضرت معاویہ نے حضرت عثمان کو شکایت لکھ بھیجی۔ آپ نے حضرت ابوذر کو مدینہ بلایا اور بندہ نقل مکانی کا حکم دیا۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ ابوذر ایسے مقتدر صحابی کو شہر بدر کرنا بلاتا نہیں ہو سکتا جب حضرت ابوذر کا تدارک ملک شام میں اس طرح کیا گیا تھا تو اس سے واضح ہے کہ دوسرے حضرات نے دیگر ممالک میں بھی اسی قسم کے اثرات پیدا کئے ہونگے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ سامعین میں وہ لوگ بھی تھے جو نئے نئے مشرق باسلام ہوئے تھے اور اسلام ابھی تک ان کی دگ و پے میں نہیں سمایا تھا۔ ان میں کچھ لوگ فتنہ پرور بھی تھے اور بعض وہ بھی جو اس سے متاثر ہونے لگے۔

حضرت عثمان کا اپنے اقارب سے حسن سلوک | ۱۳۱ فتنہ پردی کی دوسری وجہ حضرت عثمان کی اپنے اقارب و اعزہ سے محبت تھی بیشک

قارب سے انس و محبت کرتا نہ موجب گناہ ہے اور نہ باعثِ ملامت۔ مگر بات یہ تھی کہ آپ نے جو امیہ کو اپنا مقرب خصوصی بنا لیا تھا اور امورِ سلطنت میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔ حالانکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو لائقِ اعتماد نہ تھے۔ مزید برآں حضرت عثمان صحابہ کبار مثلاً حضرت علیؓ بعد ان وقاص اور طلحہ سے بھی اس قدر مشورہ نہیں لیا کرتے تھے۔ حالانکہ یہ حضرت عمر فاروق کے خاص مشیر تھے۔

حضرت عثمان کے یہ اموی اقارب امورِ سلطنت پر قابض ہو جانا چاہتے تھے۔ وہ حضرت عثمان کو اکساتے رہتے تھے کہ اس ضمن میں لوگوں کی ملامت اور تنقید کی کچھ پرواہ نہ کریں۔ روایات میں مذکور ہے کہ جب مصر، کوفہ اور بصرہ سے آنے والے بلوایمیں نے آپ کے مکان کو گھیر لیا تو آپ نے مصریوں کو واپس لوٹانے میں حضرت علیؓ سے امداد طلب کی۔ چنانچہ آپ نے ان کو واپس لوٹا دیا اور حضرت عثمان سے کہا کہ حملہ آوروں کو مخاطب کر کے اپنے خلوص و انابت کا یقین دلائیں۔ حضرت نے سے مخاطب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نرم پڑ گئے۔ ان میں سے اکثر زاری و قطار روتے لگے لوں کی نفرت دور ہو گئی۔ تلواریں واپس نیام میں چلی گئیں اور شرارت پر آمادہ لوگ اپنا ارادہ ترک بیٹھے۔ اتنے میں مروان بن حکم آکر آپ سے یوں مخاطب ہوا۔

”میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں چاہتا ہوں کہ یہ باتیں آپ لوگوں سے اس وقت فرماتے جب آپ کو کسی کا ڈرتا ہوتا اس وقت میں اولین شخص ہوتا جو آپ کی باتوں کو پسند کرتا اور آپ کی مدد کرتا۔ مگر آپ یہ باتیں اس وقت فرمادیں جس میں معاملہ شدت اختیار کر چکا اور پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ایسے وقت میں ایک ذلیل شخص ہی ذلت قبول کر سکتا ہے۔ بخدا ایک غلطی پر مقرر رہنا جس سے خدا کی مشغرت طلب کر لی جائے اس تو بہ سے کہیں بہتر ہے جس سے خوف لاحق ہو۔ اگر آپ چاہتے تو تو بہ سے تقریب حاصل کر لیتے اور غلطی کا اعتراف نہ کرتے۔ ذرا اپنے گھر کے دروازہ کی جانب دیکھئے پہاڑ کی طرح لوگ جمع کھڑے ہیں۔“

حضرت عثمان نے مروان کی یہ باتیں سن کر کہا کہ آپ جا کر لوگوں سے خطاب کیجئے۔ مجھے ان سے بات کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مروان دروازہ کی طرف آیا۔ دروازہ پر لوگوں کی بھڑکتی مروان ان سے یوں مخاطب ہوا:

”کیا بات ہے تم تو آپ کے دروازہ پر یوں جمع ہوئے ہو جیسے گھر کو اڑنا چاہتے ہو۔ خدا تمہارا بھرا کرے تم تو ایک دوسرے کے کان پکڑے ہوئے ہو۔ کیا تم ہماری حکومت چھیننے آئے ہو یہاں تک

چلے جاؤ۔ اگر تم نے ادھر کا رخ کیا تو ہم تم سے وہ سلوک کریں گے جو تمہیں گوارا نہ ہوگا۔ اور تم اپنی رائے کو معیوب سمجھنے لگو گے۔ اپنے گھروں کو چلے جاؤ۔ ہم اپنی حفاظت کرنے سے عاجز نہیں ہیں۔

(تاریخ طبری ج ۵ ص ۲۲۱)

حضرت عثمان کی اقربا نوازی

۱۴۔ حضرت عثمان کے اپنے اقارب کو والی مقرر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو کتبہ پروردی اور اقربا نوازی کے اہتمامات

سے مہتمم کیا جانے لگا حالانکہ ان اقدار میں سے بعض سابق الاسلام بھی تھے بعض کونبی کریم ﷺ مرتد ہونے کی بنا پر مباح الدم قرار دیا تھا۔ یہ عبداللہ بن سعد بن ابی السرح تھا جسے حضرت عثمان نے حضرت عمرو بن العاص کے بعد والی مقرر کیا تھا۔ اس نے لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف شروع کیا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ میں ایک گڈریے کو ملتا تو اسے بھی آپ کے خلاف اکساتا۔ عبداللہ والی مقرر کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئیں۔ عبداللہ ہی تھا جو ایمان لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور پھر نبی کریم ﷺ کے خلاف بہتان طراندی میں حصہ لینے لگا۔

عبداللہ امور حکومت انجام دینے میں راجد ہی نہ تھا بلکہ بڑا سنگدل تھا اور حضرت عثمان کی مخالفت کرنے میں بڑا جدوجہد کا واقعہ ہوا تھا۔ کتاب الامامة والسياسة میں لکھا ہے۔

”اہل مصر نے حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر عبداللہ کی شکایت کی آپ نے اسے ایک تہدید آمیز خط لکھا اور ان باتوں سے متنع کیا۔ عبداللہ نے ان احکام کو ماننے سے انکار کر دیا اور مصری قاصد کو اس قدر مارا کہ وہ جان بچی ہو گیا۔“

بلاشبہ ایسے والی کا وجود ہی لوگوں کو حضرت عثمان کے خلاف اکسانے کے لئے کافی ہے اور یہی ہوا اہل مصر اولین اشخاص تھے جو بہت خلقت کو لوٹ کر مدینہ گئے اور حضرت عثمان

گھر کا محاصرہ کر لیا۔ عبداللہ کی کر تو لوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ قیام عدل سے مایوس ہو گئے اور اہل حرمان و یاس کے عالم میں شرم و غمت اور قتل و قتال کا دروازہ کھل گیا۔ اس لئے کہ اب تک قیام عدل کا شعور و احساس ہی لوگوں کو ایک مضبوط طلعہ کی طرح مشہور و فتن سے روکنے کا موجب

حضرت عثمان کی نرم خوئی

۱۵۔ حضرت عثمان کی نرمی طبع بھی اسباب اختلاف

تھی۔ آپ کے حلم و تحمل سے خصوصاً ان والیوں کے ساتھ جو عادل نہ تھے۔ لوگ قیام عدل سے مایوس ہو گئے۔ حضرت عثمان عمال و حکام کے ان معاملات میں جو رعایا سے متعلق ہوتے ہیں حضرت عمر کی طرح محتاط بھی نہ تھے۔ حضرت

خصوصی لشکار یہ تھا:

”اگر میں ہر روز کسی والی کو معزول کرتا رہوں تو یہ اس سے بہتر ہے کہ میں ظالم حاکم کو

ایک لمحہ کے لئے بھی مستبد اقتدار پر قابض رہنے دوں“

جو لوگ حضرت عثمان کے خلاف حملہ آور ہوئے۔ آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور پھر اس سے

بھاگ کر آپ پر پتھر پھینکے جب کہ آپ منبر پر کھڑے تھے ان سے بھی آپ کا برتاؤ عینی برحترم و احتیاط نہ

ہوا۔ اگر آپ فتنہ کے آغاز ظہور کے وقت ان باغیوں کی سرکوبی کرتے تو انہیں تپہ چل جاتا کہ فتنہ

ماتنی سے اس مرض کا ازالہ ممکن نہیں۔ پھر آپ حمایت حق کا فریضہ ادا کرتے اور ظالم والیوں

معزول کر دیتے۔ اس سے آپ کو بھی نجات ملتی امن قائم رہتا اور اختلاف کا قلع و قمع

ہو جاتا۔ مزید برآں اس دور کے صحابہ کبار آپ کی امداد کے لئے تیار تھے جب وہ ہتھیار

ٹھا کر جنگ کے لئے آمادہ ہوتے تو آپ انہیں روک دیتے۔ راویوں کا بیان ہے کہ اکٹھ صد

خاص آپ کی پشت پناہی کے لئے ہتھیار اٹھانے کے لئے تیار تھے۔ یہ سب بقیۃ السیف

تھے اور ایسے لوگ ہی حمایت و مدافعت کا فریضہ بطریق احسن ادا کر سکتے ہیں۔ مگر حضرت عثمان

کی قیام امن و عافیت کے پیش نظر ان کو لڑائی سے روک دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت

عثمان خود ہی اس فتنہ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ آپ کی شہادت مسلمانوں کے لئے اولین آزمائش

تھی جس سے ایسے فتنہ کا دروازہ کھلا جو سمندر کی طرح موجیں مارتا رہا۔

عبداللہ بن سبا کی فتنہ پوری | ۱۶۔ اختلاف کا سب سے بڑا سبب اعداء دین کا

وجود تھا۔ یہ لوگ اسلام کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے

راہل اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ انہوں نے دینی غیرت کا لبادہ اوڑھ

لکھا تھا۔ بظاہر دین اسلام کے دعویٰ دار تھے مگر بیاطن کفر کی پشت پناہی کرتے تھے۔ ان کی

فتنہ مسلمانوں کا آغاز حضرت عثمان کی مذمت اور حضرت علی کی تفسیرہ خوانی سے ہوا۔ بلاد و امصار

میں بغاوت کی روح بھونکتی اور ولایت و حکام کی کمر توڑوں کو اپنی دعوت کا ذریعہ بناتے تھے

ان کا سرغنہ عبداللہ بن سبا تھا۔ مورخ طبری اس کے متعلق لکھتے ہیں۔

عبداللہ بن سبا مین کے شہر صنعاء کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ اس کی ماں ایک

سیاہ قام کثیر بختی وہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں اسلام لایا اور مختلف بلاد و امصار

میں گھوم پھر کر مسلمانوں کو گمراہ کرتا رہا۔ بلاد حجاز سے آغاز کر کے یسوا اور شام پہنچا اور

اس کی آرزو یہ نہ آئی۔ اہل شام نے جب اسے نکال دیا تو مصر پہنچا کہنے لگا یہ بات
 بڑی تعجب چیز ہے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ کے آسمان سے نازل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں
 مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن آپ کے بارے میں
 کہتا ہے "إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَأْدًا لِّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ"
 محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ کر آنے کا حضرت عیسیٰ سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ پھر کہتا
 دنیا میں ہزار ہا انبیاء آئے ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے حضرت علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 کے وصی تھے پھر کہتا نبی کریم خاتم الانبیاء تھے اور حضرت علی خاتم الاوصیاء۔ وہ
 یہ بھی کہا کرتا تھا کہ حضرت عثمان نے خلافت کا حق غصب کر رکھا ہے حضرت علی اس

شیعوں کا یہی
 عقیدہ ہے کہ
 حضرت علی
 کے وصی تھے

کے اصلی حقدار ہیں۔ ایسے حالات میں تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ حضرت
 علی کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہو جس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ولایت و حکام کے
 نقائص و معائب بیان کیجئے اور اس طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا
 کیے کہ لوگوں کی ہمدردی حاصل کیجئے۔ چنانچہ اس نے ہر طرف اپنے داعی بھیج دیئے
 لوگوں کو اور غلامان شروع کیا جس سے شہروں میں فتنہ و فساد کا دور دورہ ہوا یہ داعی بذریعہ تحسیر
 اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کرتے اور اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مصداق
 قرار دیتے تھے۔ وہ ولایت و حکام کے معائب سے لبریز خطوط مختلف بلاد و اموار
 میں بھیجتے۔ ان کے رفقاء کا بھی اسی طرح کے خط لکھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکام وقت
 کے معائب کی بڑی تشہیر ہوئی۔ اس سے ان کا مقصد ہرگز وہ نہ تھا جس کا وہ اظہار
 کرتے تھے اور جو باتیں وہ پر بلا کہتے تھے۔ ان کے دل میں ہرگز نہ تھیں۔

شیخ المورخین طبری کا یہ بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ عبداللہ بن سبا کے
 ساتھیوں نے کس طرح امت میں فساد پھیلانا شروع کیا حضرت عثمان کے بعض ولایت و حکام
 کی شکایات کو نقص بیعت کے لئے حیلہ بنا کر اور امت میں افکار باطلہ کی تشہیر کر کے اس
 کے شیرازہ کو منتشر کر دیا۔

۱۷۔ سوء اتفاق سے عثمانی خلافت میں یہ اسباب
 جمع ہو گئے پھر بعض اسباب کو دیگر اسباب سے تقویت
 حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان ذوالنورین کی

حضرت علی کے عہد خلافت میں
 اختلافات کی شدت و حدت

شہادت کا حادثہ فاجعہ پیش آیا حضرت علیؑ کے زمانہ میں بھی فتنہ فساد کی گرم بازو کی رہی۔ اسلامی
 سیاسیات میں ایسے شدید اختلافات نے سر نکالے جو مختلف مذاہب کے ظہور و شیوع کے لئے
 قطعاً آغاز قرار پائے۔

ابھی شرور و فتن کے زیر سایہ شیعہ مذہب پر وان چڑھا۔ اگرچہ شیعہ اور ان کے احوال و انصار
 کا کہنا یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی داغ بیل آنحضرتؐ کی وفات کے وقت ہی ڈال دی گئی تھی۔
 خوارج کا فرقہ بھی اسی دور فساد کی یادگار ہے جو حضرت علیؑ کے پورے عہد خلافت تک باقی رہا۔
 یہ حقیقت ہے کہ خلیفہ ثالث کا عہد خلافت شیعہ و خوارج کے فرقوں پر جا کر اختتام
 پذیر ہوا۔ یہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ان دونوں انتہاء پسند فرقوں کے علاوہ
 اس دور میں ایک تیسرا اعتدال پسند فرقہ بھی پایا جاتا تھا جسے تاریخ اہل سنت و الجماعت
 کے نام سے یاد کرتی ہے۔

انہی فرقوں کے فتنے علیؑ کے زمانہ میں سر اٹھنے لگے۔

۱۰

سیاسی فرقوں کا دین سے ربط و تعلق

مذہب سیاست کا ربط و تعلق | ۱۸۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونا ضروری ہے کہ سیاسی اختلاف یا بالفاظ دیگر سیاسی فرقوں کا آغاز اگرچہ سیاسی امور سے ہوا۔ مگر اسلامی سیاست دین سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ دین کا منفر و قوام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی مذاہب کے اصول و مبادی کا مرکز و محور ہمیشہ اسلام ہی رہا۔ یہ فرقے کبھی دین سے قریب آجاتے اور کبھی ایسی فروعیات و تخریجات کی جو دین سے الگ تھلگ ہوتیں۔ مذہب سے دُور نکل جاتے۔ ان فرقوں نے براہ راست میلانات و رجحانات کے اعتبار سے اصول دین سے متعلقہ مباحث مثلاً ایمانیات و معتقدات میں لیا اور اس ضمن میں اپنے افکار و آراء پر روشنی ڈالی۔

سیاسی مذاہب کے ارباب بست و کشاد نے صرف اسلامی معتقدات ہی کو اپنی خیال آرائی کی نہیں بنایا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر فروعیات کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ یہ مباحث فروعیات میں کسی سے بھی تشنہ تکمیل نہیں۔ جب سیاسی مذاہب والوں نے اعتقادات و فروعیات پر گفتگو کی تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انہوں نے تاریخ اسلام میں سیاسی مذاہب کے آثار باقی چھوڑے۔ مثلاً فرقہ شیعہ ہی کو دیکھئے انہوں نے سیاسیات کے دوش بدوش مذاہب سے بھی رابطہ قائم رکھا۔ بعض مسائل میں شریعت سے چمٹے رہے اور بعض میں اس سے دُور نکل گئے۔ بعض مسائل میں ان کا ایک خاص انداز ہے جس میں وہ بعض اعتقادی فرقوں کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہیں یا ان سے بالکل ہی ہم آہنگ ہیں (جیسا کہ آگے چل کر ہم بتائیں گے)۔ اسی طرح خوارج سیاسی آراء سے قطع نظر ایمانیات و معتقدات میں بھی اپنے خاص نظریے رکھتے ہیں شاید دونوں قسم کے اذکار و آراء کا امتزاج ہی ان فرقوں کی شدت و جدت کا موجب بنا۔ فکر و نظر کی ان دونوں قسموں کے علاوہ ان فرقوں کی بدولت اسلامی فقہ نے بھی بڑی ترقی پائی۔ چنانچہ سیاسی مذاہب والوں سے نقل ہو کر علم فقہ کے ایسے نادر مفید توتے ہم تک پہنچے ہیں جو فقہ مذاہب اربعہ کے بالخصوص اور فقہاء اہل صاکی فقہ کے بالعموم ہم لپے ہیں۔ چنانچہ فقہ طالب علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ فقہ جعفری اور فقہ زیدی کے نام سے فقہ کا ایک عظیم ذمہ

تک موجود ہے فقہ اول کے بانی امام جعفر صادق بن محمد باقرؑ اور دوسری فقہ امام
 صادقؑ کے چچا زید بن علی زین العابدین کی یادگار ہے۔
 اسی طرح خوارج سے فقہ اباضیہ منقول ہے جو ایک دقیق و عمیق قسم کی فقہ ہے اور اکثر حالات
 ائمہ اربعہ کی فقہ کے ساتھ منسلک کھاتی ہے۔ فقہی مذاہب کا حال بیان کرتے وقت ہم اس
 روشنی ڈالیں گے۔

۱۹۔ اب اس کے بعد سیاسی مذاہب پر گفتگو کی جائے گی جو اصل حقیقت
 کے اعتبار سے تین ہیں۔ (۱) شیعہ (۲) خوارج (۳) اہل سنت
 کو محدثین و فقہاء بھی کہتے ہیں۔

۸۔ شیعہ

۲۰۔ شیعہ مسلمانوں کے سیاسی فرقوں میں سے قدیم ترین فرقہ ہے۔
 (ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ فرقہ شیعہ کا ظہور حضرت عثمان کے

عہد خلافت کے آخری دور میں ہوا اور حضرت علی کے عہد خلافت میں پھیلا پھولا۔ حضرت علی جب لوگوں سے ملتے تو وہ آپ کی خداداد صلاحیتوں اور قوت دین و علم سے متاثر ہوتے۔ شیعہ مذہب کے داعیوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا اور لوگوں میں آپ کے فضائل و مناقب بیان کرنے شروع کئے۔ ان کی بعض باتیں مبالغہ آمیز ہوئیں اور بعض مبنی بر اعتدال۔

۷۔ جب اموی دور میں اولاد علی کو ظلم و ستم کی آماجگاہ بنایا گیا اور لوگوں نے یہ مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تو لوگ اولاد رسول کی مظلومی دیکھنے کی تاب نہ لاسکے۔ اس سے شیعہ مذہب کا دائرہ وسیع ہوا اور اس کے اعوان و انصار میں اصناف ہونے لگا۔

۲۱۔ فلسفہ تاریخ کے بانی ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں شیعہ مذہب کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں

” شیعہ کی نگاہ میں امامت کا مسئلہ اس نوع کا نہیں کہ اس کا تعلق امت کی فلاح و ہیبت سے ہو اور وہ جسے چاہیں خلیفہ بنالیں۔ بلکہ یہ مسئلہ دین اسلام کا رکن رکین اور اصل الاصول ہے جس سے بے اعتنائی برتنا اور اسے امت کی جانب تقویٰ نہیں کرنا کسی نبی کے لئے بھی جائز نہیں۔ نبی پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ امام کی رائے و عنایت سے معصوم ہوتا ہے تمام شیعہ اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت علی بنی کریم کے خلیفہ مختار اور افضل الصحابہ تھے۔“

روایات میں آتا ہے کہ بعض صحابہ حضرت علی کو افضل الصحابہ قرار دینے میں شیعہ کے ہمنوا تھے۔ ابن ابی الحدید جو ایک اعتدال پسند شیعہ عالم تھا لکھتا ہے کہ صحابہ میں مندرجہ ذیل حضرات حضرت علی کو افضل الصحابہ تسلیم کرتے تھے۔ عمار بن یاسر۔ مقداد بن الاسود۔ ابوذر غفاری۔ سلمان فارسی۔ جابر بن عبد اللہ۔ ابی بن کعب۔ حذیفہ۔ بربیدہ۔ ابو ایوب انصاری۔ سہل بن حنیف۔ عثمان بن حنیف۔ ابوالکثیر بن تیہان۔ ابوالطفیل عامر بن واثلہ۔ عباس بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے۔ نیز تمام بنی ہاشم حضرت علی کو افضل سمجھتے تھے۔ ابن ابی الحدید یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت زبیرؓ سے تفضیل علی کے قائل تھے۔ پھر اس سے رجوع کر لیا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بعض تو امیہ بھی حضرت علی کو

افضل تسلیم کرتے تھے۔ سعید ابن العاص بھی انہی میں سے تھے۔

شیعہ میں اختلاف و راجح

۲۲۔ سید شیعہ ایک ہی قسم کے نہ تھے بعض مغالی تھے جو حضرت علی اور ان کی اولاد کی تعریف میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے بعض اعتدال پسند تھے جو تفضیل علی کے باوصف کسی صحابی کو کا قر نہ کہتے۔ نہ حضرت علی کو تقدس کا وہ درجہ دیتے جس سے آپ کا فوق البشر ہونا لازم آئے۔

ابن ابی الحدید اعتدال پسند شیعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”مسئلہ امامت و خلافت میں ہمارے اصحاب (شیعہ) ہی فلاح و نجات کی راہ پر گامزن تھے کیونکہ وہ اعتدال پسند تھے اور مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ کہتے تھے حضرت علیؑ آخرت میں افضل الخلق ہونگے اور آپ کا مقام حجت میں سب سے بلند ہوگا۔ آپ دنیا میں بھی افضل الخلق ہیں اور کوئی شخص فضائل و مناقب میں آپ کا ہم پلہ نہیں ہے۔ آپ سے لڑنے والا اور بغض و عداوت رکھنے والا خدا کا دشمن ہے۔ اگر ایسا شخص تو یہ کہے بغیر مر جائے تو کفار و منافقین کے ساتھ ابدی جہنمی ہوگا۔ جہاں تک ان افضل ترین صحابہ کا تعلق ہے جو حضرت علیؑ سے قبل مسند خلافت پر فائز ہوئے اگر حضرت علیؑ ان کی خلافت سے انکار کرتے ان پر اظہار بغض و غضب کرتے علاوہ اس کے کہ آپ ان کے خلاف تلوار اٹھاتے یا ان کو اپنی خلافت کی طرف دعوت دیتے تو ہم کہتے کہ یہ صحابہ تباہی و بربادی سے ہمکنار ہوئے اور یوں سمجھئے کہ گویا یہ نبی کریم کے غیظ و غضب کا مورد بنے۔ کیونکہ آپ ہی نے فرمایا تھا کہ اے علیؑ تجھ سے لڑنا مجھ سے لڑنے کے مترادف ہے اور تجھ سے صلح کرنا میرے ساتھ مصالحت کرنا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اے اللہ جو علیؑ سے دوستی رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو علیؑ کا دشمن ہو اسے دشمن تصور کر۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

”اے علیؑ تجھے مومن ہی چاہتا ہے اور تجھ سے بغض وہی رکھتا ہے جس کے دل میں تقاضا ہوتا ہے“ مگر ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی بلکہ حضرت علیؑ نے (بزرگان ثلاثہ) کی امامت کو پسند فرمایا۔ ان کی بیعت کی۔ ان کی اقتداء میں نماز پڑھی۔ نکاح کے لئے ان کو رشتہ دینے اور ان کا حاصل کردہ مال غنیمت استعمال کیا۔

آپ کے فعل سے تجاوز کرنا ہمارا شیوہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ اس بات سے آگے بڑھنا مناسب ہے جو آپ کے متعلق مشہور ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب آپ (حضرت علیؑ) نے

حضرت معاویہؓ سے اظہار بیزاری کیا تو ہم بھی ان سے بیزاری ہو گئے اور جب آپ نے حضرت معاویہؓ پر لعنت بھیجی تو ہم نے بھی انہیں ملعون (العیاذ باللہ) قرار دیا۔ جب آپ نے شام میں رہنے والے باقی ماندہ صحابہ مثلاً عمرو ابن العاصؓ اور ان کے بیٹے عبداللہؓ اور دیگر صحابہ کو گمراہ قرار دیا تو ہم بھی ان کو گمراہ تصور کرنے لگے۔

ہمارے مسلک کا حاصل یہ ہے کہ نبی کریمؐ اور حضرت علیؑ کے مابین صرف رسالت و نبوت کا فرق تھا۔ اس کے علاوہ دیگر فضائل و فوائد ان دونوں میں مشترک طور پر پائے جاتے تھے لہذا ہم ان کا بوجہ ان کے بارے میں طعن نہیں کرتے جن پر حضرت علیؑ نے طعن نہیں کیا۔

(شرح بیح البلاغہ لابن ابی الحدید جلد سوم)

وہ زمان و مکان جہاں شیعہ مذہب پروان چڑھا

اور حضرت علیؑ کے عہد میں پروان چڑھا بغیر اس کے کہ آپ نے اس کی نشو و ارتقاء میں کوئی حصہ لیا ہو۔ البتہ آپ کی خداداد صلاحیتیں از خود شیعہ مذہب کی جانب دعوت دیتی تھیں۔ جب آپ اپنے آپ سے جاملے تو شیعہ مذہب کئی فرقوں میں بٹ گیا۔ بعض غالی تھے اور بعض اعتدال پسند مگر دونوں قسم کے شیعہ اہل بیت سے شدید نفرت رکھتے اور ان کی طرفداری میں ایک دوسرے کے ہمتوائے تھے۔ اموی دورِ خلافت حضرت علیؑ کے اعزاز و احترام میں مزید اصناف کا موجب ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خلافت معاویہؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں ایک بدترین سنت کو ایجاد کیا جو ان کے بیٹے یزید اور ان کے بعد آنے والے خلفاء میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ تک پائی رہی۔ وہ سنت بقیہ یہ تھی کہ خطبہ پڑھنے کے بعد حضرت علیؑ پر لعنت بھیجی جاتی تھی جو صحابہ اس وقت بقیہ حیات تھے انہوں نے اسے نفرت و حقارت کا نگاہ سے دیکھا اور حضرت معاویہؓ اور اموی خلفاء کو اس سے منع کیا۔ اہم المؤمنین حضرت علیؑ رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہؓ کو اس ضمنوں پر مشتمل ایک خط لکھا۔

”جب تم منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؑ اور ان کے اصحاب پر لعنت بھیجتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ و رسول کو ملعون قرار دیتے ہو۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ نبی کریمؐ حضرت علیؑ کو چاہتے تھے“

اس سے بڑھ کر یزید کے عہدِ خلافت میں حضرت حسین بن علیؑ شہید کر دیئے گئے جن کے بارے میں

میں اللہ کی عبادت
 آنحضرت نے فرمایا تھا کہ حسن و حسینؑ کو جو انانِ حُبِّت کے سردار ہیں۔ آپ کا خون ضائع کیا۔ اور
 قصاص بھی نہ لیا گیا۔ نہ دینِ متین کی حرمت کا کچھ خیال رکھا گیا۔ حضرت حسینؑ کی بیٹیاں قید کی
 ہو کر دربارِ شہید میں پہنچائی گئیں۔ حالانکہ یہ آپ کی نواسیاں ہونے کے اعتبار سے خالوادہ
 نبوت میں داخل تھیں۔

لوگوں نے یہ منظم اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیے مگر محبوباً خا موشن ہو رہے۔ اور
 اہل بیت کی امداد کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ تاہم ان کے غم و رنج کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ
 ان لوگوں کو مزید اکرام و احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے جن پر موی یہ منظم ڈھانپے تھے
 جو دواستبداد کا نتیجہ ہمیشہ ہی ہوا کرتا ہے۔ جب مظلوم کی حمایت کے لئے لطف و کرم کے
 جذبات حرکت میں آتے ہیں تو طبعاً اس سے مظلوم کی عزت و عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

سمرزین عراق شیعہ کا گہوارہ

سمرزین عراق شیعہ مذہب نے شروع میں سمرزین مصر میں پر پورے
 نکلنے شیعہ داعیوں نے اس علاقہ کو شروع میں اپنے
 لئے بڑا سازگار پایا۔ پھر عراق میں جا ڈیرہ لگایا۔ شیعہ مذہب کے لئے عراق کی سمرزین بڑی
 راس آئی۔ مکہ مدینہ اور دیگر بلاد و جازان دنوں حدیث نبوی کا مورد و مسکن تھے۔ ملک شام
 یوآئیمہ کے احباب و انصار کا مستقر تھا۔ لہذا عراق سے بہتر شیعہ کے لئے اور کوئی جگہ نہ تھی۔
 سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عراق شیعہ فرقہ کا گہوارہ کیونکر قرار پایا ؟

اس کے متعدد وجوہات تھے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ اپنی مدتِ خلافت میں
 کوفہ میں مقیم رہے، وہاں لوگوں سے ملے جملے، لوگوں نے بچشمِ خود آپ کے وہ اوصاف جلیلہ
 مشاہدہ کیے جو موجب اعزاز و احترام تھے۔ اہل عراق نے یوآئیمہ کو ابھی الفتن و محبت کی نگاہ
 سے نہیں دیکھا۔ اسی کے زیراثر حضرت معاویہؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں زیاد جلیلہ جابر شخص کو
 عراق کا والی مقرر کیا۔ زیاد نے اہل عراق کی مخالفت کو ظاہر نہ ہوتے دیا تاہم وہ لوگوں کے
 دلوں سے نفرت و حقارت کے جذبات کا استیصال نہ کر سکا۔ نیز معاویہ کے عہدِ تعلق میں
 زیاد کا بیٹا عبید اللہ اپنے والد کا قائم مقام قرار پایا جس کے دورِ ولایت میں اہل عراق نے امویوں
 کی اطاعت کا جو اتار پھینکا۔ عبید اللہ بن مروان نے اپنے عہدِ خلافت میں حجاج بن یوسف ایسے
 سفاک کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ حجاج نے ظلم و جور کے سابقہ تمام ریکارڈ مٹا کر دیئے۔ اس کے
 تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ مذہب کو مزید ترقی نصیب ہوئی۔

مزید برآں ارض عراق قدیم تہذیب کا گہوارہ تھی۔ عراق میں ایران و فارس اور کلدانیوں کے علوم و فنون کا عام چرچا تھا۔ ان قوموں کی حضارت و تہذیب بھی عام طور سے رائج تھی۔ یونانی فلسفہ اور ہندی افکار اس پر مزید تھے۔ سرزمین عراق میں یہ افکار و آراء اور تہذیب ہائے تمدن کے اثرات گہل مل گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عراق کا ملک اکثر اسلامی فرقوں کی جنم بھومی بن گیا۔ جہاں اکثر فرقے پھیلے پھولے خصوصاً وہ فرقے جن کا تعلق فلسفہ سے تھا۔ اسی بنا پر شیعہ مذہب میں کثرت سے فلسفیانہ نظریات گھس آئے۔ جہاں عراق کے نظری و فکری ماحول سے سازگار تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سرزمین عراق علمی وراثت کا گہوارہ تھی۔ وہاں کے رہنے والے بڑے ذہین و فطین اور عتیق فکر و نظر میں ممتاز تھے۔ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں۔

”عراقی اقوام اور ان عربوں میں جو نبی کریم کے زمانہ میں موجود تھے یہی فرق نظر آتا ہے کہ یہ قومیں کوفہ و عراق میں سکونت پذیر تھیں۔ ارض عراق کی یہ عجیب و غریب طبیعت ہے کہ اس کی مٹی سے گراہ فرقے اور عجیب و غریب مذاہب کے لوگ اٹھتے رہے ہیں۔ اس ملک کے رہنے والے بڑے نکتہ سنج و دقیقہ رس اور عقائد و افکار سے بحث کرنے والے ہوتے ہیں۔ شاہان کسریٰ کے ایام میں یہاں مانی۔ دیہان اور مزدک جیسے مشاہیر ہو گئے ہیں۔ سرزمین حجاز کا خمیر ایسا نہیں اور نہ اہل حجاز ایسا ذہین رکھتے ہیں۔“

یہ بیان اس حقیقت کی تقاضی کرتا ہے کہ عراق قدیم زمانہ ہی سے افکار و عقائد کا مرکز و محور رہا ہے۔ لہذا سیاسی و اعتقادی مذاہب کا ظہور و نشیون اس میں ناگزیر تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عراق میں شیعہ مذہب کا نشو و نما و ارتقاء چنداں حیرت انگیز نہیں۔

Tahira Zaid

۷۵۰
۳۱۵
۱۰۰۰

صدا

۱۸۵
۵۵
۱۵۰
۶۶
۲۹۶

یہ بات بات پر آتا ہے رو کفناح
بجس ہی دھند کا گدو ذرا امانت کا

best

۱۰۵
۱۰۵
۱۰۵
۱۰۵
۱۰۵
۱۰۵

۱۔ شیعہ مذہب میں قدیم فلسفہ کے اثرات

شیعہ مذہب کے مصادر و مآخذ | ۲۵ (یہ بلاشبہ شیعہ ایک اسلامی فرقہ ہے۔ مگر
عبداللہ بن سبا کے متبعین جو حضرت علی کی الوہیت
کے قائل تھے اسلام سے بہت دور نکل گئے۔ یہ بھی درست ہے کہ شیعہ اپنے تمام افکار و عقائد
میں قرآنی نصوص اور احادیث نبویہ سے احتجاج کرتے ہیں۔ مگر بائیں ہمہ ان کے نظریات کچھ
فلسفیانہ آراء پر بھی مشتمل تھے جن کا مصدر و مآخذ علماء مشرق و غرب کی نگاہ میں وہ
فلسفی و دینی مذاہب تھے جو ظہور اسلام سے قبل پائے جاتے تھے۔ مزید برآں شیعہ
مذہب اس فارسی تہذیب سے بھی متاثر ہوا تھا جو ظہور اسلام سے ختم ہو گئی۔
بعض یورپین مستشرقین جن میں سے پروفیسر ڈوزی بھی ہیں یہ خیال رکھتے ہیں کہ شیعہ
مذہب ایران و فارس کی پیداوار ہے۔ ان کے نزدیک اس کی دلیل یہ ہے کہ عربوں کا
ایمان انسانی حریت و آزادی پر ہے۔ اس کے برعکس اہل فارس خاندانی بادشاہت و
حکومت کے معتقد تھے۔ ان کی نگاہ میں انتخابِ خلیفہ کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ جب
نبی کریم کا انتقال ہوا تو آپ کی کوئی نرینہ اولاد موجود نہ تھی (اہل فارس کے نزدیک)
نبی کریم کے بعد آپ کی نیابت کا حق سب سے زیادہ آپ کے چچا زاد بھائی حضرت علی
کو پہنچتا تھا۔ لہذا جو لوگ بھی آپ کے بعد خلیفہ قرار پائے مثلاً حضرت ابوبکر و عمر و
عثمان غصبِ خلافت کے مرتکب ہوئے تھے۔

(اہل فارس سلاطین کو تقدس و طہارت کی نگاہ سے دیکھنے کے بھی عادی تھے۔ چنانچہ
وہ حضرت علی اور ان کی اولاد کو بھی مقدس مانتے تھے اور کہتے تھے کہ امام کی اطاعت
فرض اولین ہے اور بائیں کی اطاعت منہ خدا کی اطاعت ہے۔

بعض یورپین مستشرقین کا خیال ہے کہ شیعہ نے فارسی تہذیب کے بجائے یہودیت
سے زیادہ استفادہ کیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن سبا جو حضرت علی کی تقدیس کے
عقیدہ کا بانی تھا پہلے یہودی تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودی آثار کے علاوہ شیعہ

۱۔ فجر اسلام از ڈاکٹر احمد امین

مذہب میں بعض ایشیائی مذاہب مثلاً بدھ مت کے عقائد بھی شامل ہیں۔

۲۶۔ غالباً شیعہ مذہب کے یہودیت سے ماخوذ ہو
شیعہ مذہب اور یہودیت کا مستشرقین نے امام شعبی اور محدث ابن حزم کے

اقوال سے اخذ کیا۔ امام شعبی شیعہ سے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ شیعہ اس امت کے یہود ہیں۔ امام ابن حزم اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں۔

”شیعہ بھی یہود کی راہ پر چلے جن کا خیال ہے کہ حضرت الیاس اور قحاس بن عازو
ابن ہارون علیہما السلام اب تک بقید حیات ہیں۔ اسی طرح بعض صوفیہ حضرت
نضر اور الیاس علیہما السلام کو تا حال زندہ تصور کرتے ہیں۔“

(حق بات یہ ہے اور ہمارا اس پر ایمان ہے کہ شیعہ حکومت و سلطنت کے
موروثی ہونے کے بارے میں فارسی افکار سے متاثر ہوئے تھے۔ جیسا کہ شیعہ مذہب
اور فارسی نظم مملکت کی یاہمی مماثلت سے واضح ہوتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر
اہل فارس اب تک شیعہ چلے آتے ہیں۔ اولین شیعہ بھی فارس کے رہنے والے تھے۔

یہودیت شیعہ مذہب سے اس لئے قریبی مماثلت رکھتی ہے کہ شیعہ فلسفہ مخالف
مذہب سے ماخوذ ہے شیعہ پر فارسی تحیلات کی چھاپ صاف نمایاں ہے۔ اگرچہ وہ اسلامی
اسلامی افکار کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

آج کل اعتدال پسند شیعہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ عبداللہ بن سبا شیعہ تھا۔
اسے شیعہ تو کیا مسلمان بھی نہیں مانتے۔ ہم اس بات میں شیعہ کے ہمنوا ہیں اور ان کے اس
دعویٰ کی تائید کرتے ہیں۔)

~~یہودی عقائد کے ساتھ شیعہ مذہب کی قریبی مماثلت کے بارے میں امام ابن حزم نے فرمایا ہے کہ شیعہ اس امت کے یہود ہیں۔ امام ابن حزم اپنی کتاب الفصل میں لکھتے ہیں۔~~

۱۰۔ شیعہ کے فرقے

غالی شیعہ اور ان کے فرقہ جات | کلمہ شیعہ کی اجمالی تعریف بیان کرتے وقت یہ بتا چکے ہیں کہ بعض شیعہ غالی تھے بعض

اعتدال پسند اور بعض ان دونوں کے درمیان۔

غالی شیعہ نے حضرت علی کو الوہیت کے مرتبہ پر فائز کر دیا تھا۔ بعض ان کو نبی مانتے تھے اور آنحضرت سے بھی افضل قرار دیتے تھے۔ اب ہم ان غالی شیعہ کا حال بیان کریں گے جو اس مبالغہ آمیزی کی بدولت دائرہ اسلام سے نکل گئے تھے اور موجودہ شیعہ ان کو اپنے میں شمار نہیں کرتے۔ ہم بھی ان کو خارج از اسلام تصور کرتے ہیں۔

۲۸۔ یہ عبداللہ بن سبا کے متعلق تھے۔ عبداللہ بن سبا کے رہنے والے یہود میں سے تھا۔ اس کی ماں ایک سیاہ قام باندھی تھی۔ اسی لئے اسے ابن السوداء (سیاہ قام عورت کا بیٹا) کہہ کر پکارتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ حضرت عثمان اور ان کے حکام کے شدید مخالفین میں سے تھا۔

عبداللہ بن سبا نے حضرت علی کے متعلق مسلمانوں میں اپنے شرارت آمیز اور گمراہ کن خیالات پھیلانا شروع کر دیئے۔ وہ کہا کرتا تھا میں نے تورات میں دیکھا ہے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے جس طرح نبی کریم افضل الانبیاء تھے اسی طرح حضرت علی افضل الاوصیاء تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم دو بارہ زندہ ہو کر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ وہ کہا کرتا تھا میں حیران ہوں کہ لوگ نزول عیسیٰ کا عقیدہ رکھتے ہیں مگر آنحضرت کی رجعت کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر رفتہ رفتہ الوہیت علی کا پرچار کرنے لگا۔ حضرت علی کو علم ہوا تو اسے قتل کرنے کے درپے ہوئے مگر حضرت عبداللہ بن عباس نے روک دیا۔ فرمایا اگر آپ نے اسے قتل کر دیا تو آپ کے متبعین میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ حالاں کہ آپ اس شام سے جنگ لڑتے جا رہے ہیں۔ حضرت علی نے اسے بلائیں کی طرف ٹک بید کر دیا۔ جب حضرت علی نے شہادت پائی تو ابن سبا نے لوگوں کی حُب علی سے ناجائز قائدہ اٹھایا اور آپ کی عدم موجودگی کو نہایت الم ناک انداز میں پیش کرنے لگا۔ آپ کی موت

کے پاسے میں طرح طرح کی افسانہ طرازیوں شروع کیں۔ کہنے لگا حضرت علی قتل نہیں ہوئے بلکہ مقتول ایک شیطان تھا جو آپ کی صورت میں منسکل تھا۔ حضرت علی حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان پر چڑھ گئے ہیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے جھوٹ موت حضرت عیسیٰ کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا تھا اسی طرح خوارج نے قتل علی کا ڈھونگ لے جایا۔ یہود و نصاریٰ نے ایک شخص کو مصلوب ہوتے دیکھا تھا اور اسے حضرت عیسیٰ سمجھے۔ حضرت علی کے قتل کے دعویٰ داروں نے بھی ایک شخص کو قتل ہوتے دیکھا جو حضرت علی کا ہم شکل تھا تو انہوں نے خیال کیا یہ حضرت علی ہیں۔ حالانکہ آپ آسمان پر تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہ کہا کرتا تھا بادل سے جو کڑک کی آواز آتی ہے یہ حضرت علی کی آواز ہے اور بجلی آپ کی مسکراہٹ ہے۔ اس فرقہ کے لوگ جب بادل کی آواز سنتے تو کہتے "السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ"۔

عمر بن شرجیل راوی ہیں کہ ابن سبأ سے کہا گیا حضرت علی شہادت پاگئے۔ وہ بولا اگر تم آپ کے سر کے منقر کو بھی کسی تھیلی میں بند کر کے لاؤ تو میں آپ کی موت کو تسلیم نہیں کروں گا۔ جب تک کہ آپ آسمان سے نازل ہو کر سب دنیا کے مالک نہ بن جائیں۔

الفرق بین الفرق از عبد القاہر بغدادی

اس فرقہ کے بعض لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ذات باری تعالیٰ حضرت علی میں حلول کر آئی ہے۔ دیگر ائمہ کے پاسے میں بھی وہ یہی اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ عقیدہ بعض قدیم مذاہب سے ہم آہنگ ہے جو کہتے تھے کہ خداوند تعالیٰ بعض انسانوں میں حلول کرتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ روح خداوندی باری باری اماموں میں داخل ہوتی ہے۔ قدیم مصری بھی فراسخہ کے پاسے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے۔

فرقہ سبئیہ کے بعض لوگ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجسم ہو کر حضرت علی کی شکل میں نازل ہو گیا ہے۔ وہ حضرت علی کو خدا تصور کرتے تھے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت علی نے ان کو تندر آتش کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

۲۔ غرابیہ | ۲۹۔ یہ بھی شیعہ کا ایک غالی فرقہ ہے۔ یہ سابق الذکر فرقہ کی طرح حضرت علی کی الوہیت کے قائل نہیں تھے مگر حضرت علی کو تقریباً آنحضور سے افضل قرار دیتے تھے۔ یہ اس زعم باطل کا شکار تھے کہ نبی دراصل حضرت علی تھے۔ مگر حبریل غلطی سے محمد

صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو گیا۔ ان کو غرابیہ (غراب کوئے کو کہتے ہیں) ان کے اس قول کی

وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی نبی کریم کے اس طرح مشابہتیں جیسے ایک کدو دوسرے کوٹے کا ہم شکل ہوتا ہے۔

علماء نے ان کے اس لغو عقیدہ کی تردید کا کوئی دقیقہ اٹھانا رکھا۔ محدث ابن حزم نے اپنی کتاب الفصل میں اس بے بنیاد عقیدہ کی دھجیاں خضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دیں۔ دراصل یہ عقیدہ تاریخی جہالت اور حقائق سے بے خبری کا عجیب نمونہ ہے۔ آنحضرت کی بعثت کے وقت حضرت علیؑ صرف نو سال کے بچے تھے اور نبوت و رسالت کی ذمہ داریوں سے عہدہ بھاری ہونے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ اس عمر میں تو یہ شرعی احکام سے تکلف بھی نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس پر تبلیغ احکام کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ واقعات سے ناپید ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ جب پڑھے ہوئے تو اس وقت بھی آپ کی شکل و صورت آنحضرت جیسی نہ تھی بلکہ دونوں کے خدو و خال ایک دوسرے سے ممتاز تھے جیسا کہ کتب میں مذکور ہے۔

آنحضرت اور حضرت علیؑ کے پوری عمر کو پہنچ جانے کے بعد اگر ان کی جسمانی مماثلت کو تسلیم ہی کر لیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بعثت کے وقت بھی یہ مشابہت موجود ہوگی۔ ایک ~~مختارین~~ اور نو سال کے بچے کی مشابہت و یکسانیت بڑی لغوبات سے بھر چیرا کیونکہ ایک پورے مرد (نبی کریم) اور نو سال کے بچے (حضرت علیؑ) میں امتیاز نہ کر سکے۔ پھر یہ معاملہ ایک کوٹے کے دوسرے کوٹے سے مشابہ ہونے کی طرح کیونکر ہوا۔

شیعہ سے خارج فرقے

۳۰۔ متذکرۃ الصدق فرقے اور ان کے شاہ و امثال اب شیعہ میں شمار نہیں کئے جلتے موجودہ شیعہ ان کو عالی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اہل قبلہ میں بھی شمار کئے جانے کے لائق نہیں چہ جائیکہ ان کو شیعہ تصور کیا جائے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ تاریخ اسلام میں ان فرقوں کو شیعہ میں شمار کیا گیا ہے مگر اکثر شیعہ مصنفین نے ان سے اظہار برأت کیا ہے۔ بہر کیف یہ فرقے خارج از اسلام تھے اور آج کل شیعہ میں سے کوئی بھی اماموں کی الوہیت کا قائل نہیں اور نہ یہ کہتا ہے کہ رسالت کے بارے میں جبریل ابن سے غلطی سرزد ہوئی۔

۳۱۔ فرقہ کیسانیت

یہ مختارین عقیدہ ثعلبی کے پیروکار تھے۔ مختار پہلے خارجی تھا پھر شیعہ کا باوا اور بعد لیا جو حضرت علیؑ کے حامی تھے۔ کیسانیت کی نسبت کیسان کی طرف سے ہے یعنی کہتے ہیں مختار ہی کا نام کیسان تھا بعض کی رائے میں کیسان حضرت علیؑ

کا آزاد کردہ غلام تھا۔ بعض کے نزدیک آپ کے بیٹے محمد بن حنفیہ کے شاگرد کا نام ہے۔ یہ کوفہ میں اس وقت آیا جب مسلم بن عقیل حضرت حسین کی طرف سے کوفہ آئے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ عراق کے حالات معلوم کر کے حضرت حسین کو لکھے کہ لوگوں میں ان کی محبت کہاں تک پائی جاتی ہے۔ جب کوفہ کے امیر عبید اللہ بن زیاد کو مختار کی آمد کا علم ہوا تو اس نے بلا کر مختار کو بیٹھا اور حضرت حسین کی شہادت تک اسے مجبوس رکھا۔ پھر ان زیاد کے بہنوئی عبداللہ بن عمر کی سفارش پر اسے اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ کوفہ سے نکل جائے۔ مختار سے منقول ہے کہ اس نے کوفہ سے جاتے وقت کہا تھا:

”میں شہید مظلوم مسلمانوں کے سردار نبیرہ رسول حضرت حسین کا انتقام لے کر رہوں گا اور ان کے بدلہ میں اس قدر آدمیوں کو قتل کروں گا جتنے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کے خون کے عوض مارے گئے تھے۔“

مختار پھر ابن زبیر سے مل گیا جو ان دنوں حجاز اور دیگر بلاد اسلام پر قابض ہو جانا چاہتے تھے اور اس شرط پر بیعت کی کہ خلیفہ ہونے پر اسے کوئی عہدہ دیں گے چنانچہ اس نے عبداللہ بن زبیر سے مل کر اہل شام سے لڑائی کی اور زبیر کی موت کے بعد کوفہ لوٹ آیا۔ اس وقت مسلمان انتشار کا شکار تھے۔ مختار لوگوں سے کہنے لگا میں حضرت حسین کے بھائی محمد بن حنفیہ کی طرف سے آیا ہوں اور حضرت حسین کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔ محمد بن حنفیہ ہمدی اور وصی ہیں۔ وہ لوگوں سے یوں مخاطب ہوا:

”مجھے وصی و ہمدی نے تمہاری طرف امین اور وزیر بنا کر بھیجا ہے اور محمد بن زبیر کو قتل کرنے اہل بیت کے خون کا بدلہ لینے اور کمزوروں سے مدافعت کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔“

مختار محمد بن حنفیہ کے نام کی دعوت دینے لگا کیونکہ وہی حضرت حسین کے خون کے وارث تھے۔ محمد بن حنفیہ بڑے جلیل القدر تھے۔ لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے اور آپ کے علم و فضل کے مداح تھے۔ آپ بہت اچھے عالم دین صاحب فکر و نظر اور تاج و عواقب میں بڑے صاحب الرائے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت علی نے آپ کو ہونے والی جنگوں کے حالات بتا دیئے تھے۔

مختار ثقفی ۳۲ - محمد بن حنفیہ کو جب مختار کی بدلتی اور اس کے اولاد کا ذیوب کا

پتہ چلا تو کلمہ کھلا مختار سے اظہار بیزاری کیا۔ لیکن برأت کے باوجود بھی بعض شیعہ مختار کی اطاعت کا دم بھرتے تھے کیونکہ ان میں حضرت حسین کا انتقام لینے کا جذبہ کار فرما تھا مختار عربی کا ہنوں کا پارٹ بھی ادا کیا کرتا تھا اور ان کی طرح مسجع و مقفی اعبادت بولتا۔ وہ آئندہ زمانہ کی باتیں جاننے کا بھی دعویٰ دار تھا۔

چنانچہ اس سے یہ فقرے منقول ہیں۔

۱۰۰۰ اما وریب البعار والنخيل
والاشجار والمهام والقفار
والملائكة الابتر لا فتن كل
جبار بگل لذن نعطار ومهتد
يقنطار۔

حتیٰ اذا اقمتم عمود الدین
وزايلت شعب صدع المسلیت
فشفیت صدور المؤمنین لمر
یکبر علی زوال المتیاء لمر
آخفل بالموت اذا آتی

اس ذات کی قسم جو سمندروں، کھجور کے
درختوں عام درختوں جنگلوں اور فرشتوں
کی مالک ہے میں لچکدار نیزے اور شمشیر خارا شکار
سے تمام بغاوت پیشہ لوگوں کو موت کی
نیند سلا دوں گا۔

جب میں دین کو درست کر لوں گا مسلمانوں
کی خامیوں کی اصلاح ہو جائے گی اور میں
مومنوں کے سینوں کی پیاس بجھا لوں تو دنیا
کے زوال کی میرے نزدیک کوئی قیمت نہ ہوگی نہ
مجھے موت کی پرواہ ہوگی وہ جب چاہے
آجائے۔

۳۳۔ مختار قاتلان حسین سے نبرد آزما ہوا اور انہیں بے دریغ قتل

کرتا رہا۔ شہادت حسین میں شرکت کرنے والوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر موت
کے گھاٹ اتارا۔ شیعہ اسے بہت چاہنے لگے انہوں نے مالہ کی طرح مختار کو گھیر لیا اور ہر جگہ اس
کا ساتھ دینے لگے۔ لیکن عبداللہ بن زبیر کے بھائی مصعب کی لڑائی میں مختار مارا گیا۔

۳۴۔ کیا نیہ فرقہ سبیئہ کی طرح الوہیتِ ائمہ کا عقیدہ نہیں
رکھتے بلکہ ان کے عقیدہ کی اساس یہ ہے کہ

- ۱۔ امام ایک مقدس انسان ہوتا ہے جس کی وہ اطاعت کرتے اس کے علم و فضل پر پورا
بھروسہ کرتے ہیں اور علم الہی کا نشان ہونے کے اعتبار سے اسے گناہوں سے معصوم سمجھتے ہیں۔
- ۲۔ کیا نیہ بھی سبیئہ شیعوں کی طرح رجعت امام کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ امام ان کے خیال

میں حضرت علی حسن اور حسین کے بعد محمد بن حنفیہ میں بعض کہتے ہیں کہ وہ فوت ہو چکے ہیں اور پھر واپس آئیں گے لیکن اکثر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ فوت نہیں ہوئے بلکہ رضوی نامی نپال پر رہتے ہیں۔ ان کے پاس شہد اور پانی رکھا ہے۔ مشہور شاعر کثیر عزمہ انہی میں سے تھا وہ کہتا ہے۔

آلَا إِنَّ الْأُمَّةَ مِنْ قُرَيْشٍ وَلَا أَلَا الْحَقُّ أَسْرَجَةٌ سَوَاءٌ

بلاشبہ قریش کے نام اور حق و صداقت کے وارث صرف چار بزرگ ہیں۔
عَلَى وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ دِينِهِ هَذِهِ الْأَسْبَادُ الْبَيْسُ بِهَا مُمْخَفَاءٌ

حضرت علی اور آپ کے تین صاحبزادے شریکان رسول ہیں ان میں کوئی پوشیدگی نہیں۔

فَسَبْطُ سَبْطِ إِيْمَانٍ وَبِرٍّ وَسَبْطُ عَمِيَّةٍ كَرِيْمَةٍ

ان میں سے ایک تو ایمان و نیکی والے تھے (سن) دوسرے کو کربلا نے غائب کر دیا۔

وَسَبْطٌ لَا يَذُوقُ الْمَوْتَ حَتَّى يَلْمُودَ الْخَيْلُ يَدْعُهُ اللَّوَاءُ

ان میں سے سیرے اس وقت تک موت سے ہمکنار نہ ہونگے جب تک کہ فرج کی سپہ سالاری کے لئے انہی پر زور نہیں

لَتَغِيْبُ لَا يَرَى حَكْمٌ زَمَانًا بِرَضْوَى عِنْدَ مَحْمَلٍ وَمَاءٍ

وہ (محمد بن حنفیہ) رضوی نپال پر دنیا کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور ان کی پانچ شہد اور پانی رکھا ہے۔

۳۔ کیا نیا بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہے اور پھر بداء ہے

اس لئے وہ ہیں بات کو چاہتا ہے بدل دیتا ہے۔ وہ ایک بات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن پھر اس کے برعکس حکم صادر کر دیتا ہے۔

علامہ شہرستانی لکھتے ہیں مختار نے بداء کا عقیدہ اس لئے اختیار کیا کہ وہ اپنے والد

واقعات کا دعویٰ کرتا تھا یا تو اس لئے کہ اس پر وہی نازل ہوتی تھی یا امام کا بیان کی وجہ

سے۔ وہ اپنے رفقاء سے جب کسی واقعہ کے حدوث و ظہور کا وعدہ کرتا اور وہ اسی طرح

ظہور پذیر ہو جاتا تو اسے وہ اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا خدا

نے اپنا ادا وہ بدل لیا۔

۴۔ کیا نیا تناسخ ارواح کے قائل ہیں یعنی روح کا ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں بول کرنا

یہ عقیدہ ہندی فلسفہ سے ماخوذ ہے اہل ہنود کا قول ہے کہ انسان کو عذاب دینے کے

لئے اس کی روح گھٹیا حیوان میں منتقل کر دی جاتی ہے اور اجر و ثواب کے لئے اعلیٰ حیوان

ہیں۔ وہ تثنیخ ارواح کے عقیدہ کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا اطلاق صرف
اللہ پر کرتے تھے کسی اور پر نہیں۔

۵۔ کیسائیہ کا خیال ہے کہ ہر چیز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے۔ ہر شخص کی ایک روح اور
ہر نازل شدہ آیت کی ایک تفسیر و تاویل ہوتی ہے۔ اس کائناتِ ارضی کی ہر مثال ایک
حقیقت رکھتی ہے۔ آفاقِ ارضی میں جو اسرار و حکم پھیلے ہوئے ہیں وہ انسان کے وجود
میں جمع ہیں۔ یہی وہ علم ہے جو حضرت علیؑ نے اپنے تحتِ جگر محمد بن حنفیہ کو سکھایا اور
جس ہستی میں یہ سب علوم جمع ہوں وہی سچا امام ہے۔ (الملل والنحل شہرستانی)
کیسائیہ کے عقائد اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ وہ رسالتِ آپ کے متعلق ایسے
خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کا منصب رسالت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اولادِ علیؑ کی تعریف
میں اس حد تک اغراق و مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ انہیں نبوت کے مرتبہ پر فائز کر دیتے ہیں
خداوند تعالیٰ کی تنزیہ و تقدس اور صفات کے بارے میں ان سے کوئی ایسا قول منقول نہیں جو
ذاتِ باری کے شایانِ شان نہ ہو البتہ وہ بداء کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کے بعض عقائد میں فلسفیانہ
وکار کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آفاقِ ارضی میں جو اسرار و حکم پھیلے ہوئے
ہیں وہ انسان کے وجود میں جمع ہیں۔ یہی وہ علم ہے جو حضرت علیؑ نے اپنے تحتِ جگر محمد بن حنفیہ کو
سکھایا۔ وہی حضرت علیؑ کے بعد ان علوم کے وارث قرار پائے اور حضرت علیؑ کی شخصیت ان میں حلول
کرائی۔

یلا و اسلامیہ میں کیسائیہ کے پیروکار کہیں بھی موجود نہیں جن کا ذکر کیا جائے۔

۱۱۔ زید یہ

۳۔ زید یہ کا ظہور و شیوع | ۳۵۔ (یہ شیعہ کے تمام فرقوں میں سے اہل سنت کے زیادہ قریب اور مہینے براعتدال ہے۔ یہ ائمہ کو منصب نبوت پر فائز نہیں کرتے اور نہ انبیاء کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں ائمہ عام لوگوں کی طرح انسان تھے مگر آنحضرت کے بعد سب سے افضل تھے۔ یہ اصحاب رسول کی تکفیر بھی نہیں کرتے خصوصاً وہ صحابہ جن کی امامت کو حضرت علی نے تسلیم کیا تھا اور ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ ان کے امام زید بن علی بن حسین تھے جنہوں نے ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج کیا لیکن مقتول ہو کر کوثر میں سولی پر لٹکائے گئے) مورخ مسعودی زید بن علی کے خروج کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

” زید بن علی ایک مرتبہ خلیفہ ہشام اموی کے دربار میں گئے۔ بیٹھنے کے لئے جگہ نہ تھی۔ چنانچہ مجلس کے آخر میں جا کر بیٹھ گئے۔ ہشام کو مخاطب کر کے فرمایا امیر المؤمنین کوئی شخص بڑا آدمی بن کر تقویٰ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور نہ تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے اس میں چھوٹا پن پیدا ہوتا ہے۔

ہشام بولا: ”چپ رہ تیری ماں مرے تو لونڈی زادہ ہونے کے باوجود خلافت کا امیدوار ہے۔“

زید کہنے لگے:

”امیر المؤمنین! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی بات کا جواب دوں ورنہ خاموش رہوں۔“

ہشام بولا۔ ”جواب دیجئے“

حضرت زید نے کہا:

”عورتیں مردوں کو غایات و مقاصد سے باز نہیں رکھ سکتیں حضرت اسماعیل کی

ماں حضرت اسحاق کی ماں کی لونڈی تھیں۔ اس کے باوصف حضرت اسماعیل مقبرم

نبوت پر فائز ہوئے اور سب عربوں کے جد امجد قرار پائے۔ ان کی پشت سے خیر البشر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تولد ہوئے۔ تو مجھے ان الفاظ سے مخاطب کرتا ہے حالانکہ

میں حضرت فاطمہ و علی کا فرزند ہوں۔ پھر انہوں نے ہشام کے رو برویہ اشعار پڑھے۔
 نَشْرَدَا الْخَوْفَ وَأَذَى بِهِ كَذَلِكَ مَنْ يَكْرَهُ حَذْرَ الْجَلَاءِ

خوف نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا اور عیب دار بنا دیا لڑائی کو برا سمجھنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔
 قَدْ كَانَ فِي الْمَوْتِ لَهُ مَرَاحَةٌ وَالْمَوْتُ حَتْمٌ فِي رِقَابِ الْعِبَادِ

موت اس کے لئے باعث راحت تھی اور موت بندوں کے لئے ناگزیر ہے۔

إِنْ يُحْدِثِ اللَّهُ لَهُ دَوْلَةً يَشْرِكُ أَثَمًا لِعَدَاكَ السَّرْمَادِ
 اگر خدا تعالیٰ اسے قوت و شوکت سے بہرہ ور کرے تو وہ دشمنوں کے آثار کو راکھ کی طرح

نہیں رہنا پود کر دیتا۔

چنانچہ زید کو فوج چلے گئے اور وہاں سے قرام اور رؤساء کی جمعیت کے ساتھ لڑائی کے لئے
 نکلے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو آپ کے رفقاء بھاگ گئے صرف چند ساتھی رہ گئے۔ آپ
 بڑی بہادری سے لڑے۔ یہ اشعار ورد زبان تھے:

أَذَلُّ الْحَيَاةِ وَعِزُّ الْمَمَاتِ وَكَلَامُ أَسْرَاءٍ طَعَامًا وَبَيْتًا

زلت کی زندگی اور عزت والی موت میں دونوں کو ناخوشگوار کھانا تصور کرتا ہوں۔

فَإِنْ كَانَ لَا بَيْتًا مِنْ وَاحِدٍ فَمَسِيرٌ إِلَى الْمَوْتِ سَيْرًا جَبِيلًا

اگر دونوں میں سے ایک ضروری ہے تو موت کی طرف اچھی چال سے چلنا بہتر ہے۔

حضرت زید کے قتل پر لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۳۶۔ اس واقعہ سے مستفاد ہوتا ہے کہ امام زید دراصل
 امام زید کا علم و فضل | خلیفہ کے اطاعت شعار تھے اور باغی نہ تھے۔ حقیقت یہی

یہی ہے آپ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے تھے، علماء وقت کے ساتھ آپ کے خوشگوار

مراسم تھے اور وہ آپ سے استفادہ کرتے تھے۔ چنانچہ روایات میں منقول ہے کہ فرقہ

معتزلہ کے بانی و اصل بن عطاء نے آپ سے استفادہ کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی

آپ سے ملے تھے اور کسب فیض کیا۔ آپ امام زید کے زبردست حامی تھے۔ جب امام زید اموی

لشکر سے لڑنے کے لئے نکلے تو امام ابوحنیفہ نے فرمایا آپ کا جنگ کے لئے نکلنا اسی طرح ہے

جیسے نبی کریم جنگ بدر کے لئے نکلے تھے۔ امام زید بڑے فقیہ اور ماہر علم الکلام تھے۔ آپ

نے علم فقہ پر کتاب المجموع تحریر کی فقہی مذاہب کا ذکر کرتے وقت ہم آپ کے علم و فضل پر روشنی

ڈالیں گے۔

فرقہ زیدیہ کے افکار و معتقدات | نام لے کر کسی کو امام مقرر فرما دیا تھا بلکہ ان کا

اعتقاد یہ ہے کہ

۱۔ آپ نے کچھ اوصاف بتا دیئے تھے جن کا امام میں پایا جاتا ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حامل آپ کے بعد صرف حضرت علی تھے۔ ان اوصاف کی رو سے امام کا یا شیخ متقی عالم اور سنی ہونا ضروری ہے۔ اپنی طرف دعوت دینا بھی امام کے فرائض میں سے ہے۔ حضرت علی کی وفات کے بعد ہونے والے امام کا اولادِ فاطمہ سے ہونا بھی ان کے یہاں شرط ہے۔ دوسروں کو اپنی طرف دعوت دینے اور خروج کرنے میں بہت سے شیعوں نے ان کے مخالف تھے۔ ان کے بھائی محمد یا قریب بھی اس میں ان کے ہم خیال تھے۔ باقر فرمایا کرتے تھے تمہارا مذہب کی رو سے تو تمہارے والد بھی امام نہیں کیونکہ انہوں نے نہ کبھی خروج کیا اور نہ اس کے درپے ہوئے۔

۲۔ زیدیہ کے نزدیک مفضول کی امامت جائز ہے۔ گویا امام افضل و کامل میں ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے اور وہ دوسروں کی نسبت اس کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے۔ لیکن اگر امت کے اربابِ بیعت و کشادگی ایسے شخص کو امام چن لیں جس میں یہ بعض صفات موجود نہ ہوں اور اس کی بیعت کر لیں تو اس کی امامت درست اور بیعت لازم ہوگی۔ اس بناء پر حضرت ابو بکر و عمر کی امامت زیدیہ کے یہاں درست اور صحیح تھی۔ اس بیعت کی بناء پر وہ صحابہ کی تکفیر نہیں کرتے تھے۔ زید حضرت علی کو افضل الصحابہ تصور کرتے تھے۔ مگر ان کے نزدیک ایک مصلحت اور دینی قاعدہ کے تحت خلافت ابو بکر کو تقویٰ نفس کی گئی تھی۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ فتنہ کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ نیز عوام الناس کی رائے کا احترام۔ اس لئے کہ غزواتِ اسلامیہ کا زمانہ ابھی بڑا قریب تھا اور امیر المؤمنین حضرت علی کی تلوار سے مشرکین کا خون ابھی خشک ہونے نہ پایا تھا۔ مسیئوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لہذا لوگوں کے دل آپ کی طرف مائل نہ ہوتے تھے اور نہ وہ آپ کے سامنے تسلیم خم کرنے کو تیار ہوتے۔ یہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ خلیفہ ایک ایسا شخص ہو جو حلیم الطبع محبت پیشہ معر انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی اور سابق الاسلام ہو۔

انہی خیالات کی بناء پر اکثر شیعہ نے زید کو آٹے وقت میں تنہا چھوڑ دیا۔ علامہ بعد ادی
کتاب الفرق بین الفرق میں لکھتے ہیں:

”جب زید اور یوسف بن عمر ثقفی میں گھمسان کا دن پڑا تو شیعہ کہنے لگے ہم اس شرط پر
آپ کی امداد کریں گے کہ آپ ابو بکر و عمر کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کریں جنہوں نے آپ کے
جدِ ماجد حضرت علی پر ظلم کا ارتکاب کیا۔ زید کہنے لگے میں تو ان کے بارے میں اچھی بات
ہی کہوں گا۔ بنو امیہ کے خلاف تو میں نے اس لئے خروج کیا تھا کہ انہوں نے میرے
دادا حضرت حسین کو شہید کیا۔ حرہ کے روز مدینہ پر غارتگری کی۔ بیت اللہ پر منجلیق
سے پتھر اور آگ برسائی۔ شیعہ یہ سن کر آپ سے جدا ہو گئے۔“

۳۔ (زید یہ کہ یہاں بیک وقت دو مختلف علاقوں میں الگ الگ دو امام ہو سکتے ہیں
ان میں سے ہر ایک اپنے علاقہ کا امام ہو گا۔ بشرطیکہ وہ اوصاف مذکورہ سے آراستہ
ہوں۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی خطہ ارضی میں دو اماموں کے وجود کو ناجائز
خیال کرتے تھے۔ کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ لوگ ہر یک وقت دو اماموں کی بیعت
کریں اور یہ شرعاً ممنوع ہے)

۴۔ زید یہ کہ نزدیک گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا ابدی جہنمی ہے تا وقتیکہ وہ خالص
توبہ کرے۔ انہوں نے معتزلہ سے یہ عقیدہ اخذ کیا تھا۔ کیونکہ زید معتزلہ کے بحیال تھے اور
ان کے استاد واصل بن عطاء سے آپ کے بڑے ہمراہ سم تھے اس سے آپ نے بہت سے
اصول و قواعد سیکھے۔ انہی خیالات کی بناء پر شیعہ ان سے بغض و عناد رکھتے تھے
واصل کا عقیدہ تھا کہ حضرت علی نے جو جنگیں اہل شام اور اصحابِ جمل سے لڑیں ان
میں آپ کا راہِ راست پر ہونا یقینی نہیں۔ دونوں میں ایک قرنی غلطی پر تھا۔ مگر معلوم
نہیں کون؟ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ صرف واصل سے عداوت رکھتے تھے۔ عام
معتزلہ کے خلاف نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیعہ عام عقائد میں اشاعرہ و ماتریدیہ
کے برعکس معتزلہ کے ہمنوا تھے۔

۸۔ زید جب قتل ہوئے تو زید نے ان کے بیٹے یحییٰ کی بیعت
کی۔ پھر وہ مقتول ہوئے تو ان کے بعد عبد اللہ ابن حسن کے دونوں
بیٹوں محمد اور ابراہیم کی بیعت کی گئی۔ عبد اللہ ابن حسن امام ابو حنیفہ کے محترم استاد تھے۔ پھر

ابراہیم نے عراق میں خروج کیا اور محمد نے مدینہ میں۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ کو عراق میں اور امام مالک کو مدینہ میں بڑی تکلیف کا سامنا ہوا کیونکہ امام ابوحنیفہ عراق کے امام ابراہیم کی نصرت و تائید سے روکتے نہ تھے بلکہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرتے اور امام کی مدح و ستائش میں اللسان لہراتے تھے۔ ابو جعفر منصور بھی اس سے غافل نہ تھا۔ جب یہ تحریک ختم ہو گئی اور مالک میں امن و امان کا دور دورہ ہوا تو منصور نے امام کو ان کی خطائیں یاد دلائی اور سزا کے لئے ایک حیلہ بھی گھڑ لیا وہ حیلہ یہ تھا کہ آپ کو منصب قضا کی پیشکش کی جائے۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو سزا دی جائے اور ہوا بھی اسی طرح جیسا کہ فقہی مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے ہم بیان کریں گے۔ امام مالک نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جس شخص کو کسی ایسا پرجبور کیا جائے اسکی قسم معتبر نہیں۔ محمد بن حنفیہ کے رفقاء کا خیال تھا کہ منصور کی بیعت جبراً لی گئی ہے۔ لہذا انہوں نے اس فتویٰ کو جو حدیث نبوی کی روشنی میں دیا گیا تھا منصور کی بیعت توڑ دینے کا ذریعہ بنایا۔ روایت کیا گیا ہے کہ جبہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نفس زکیہ کے خروج کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا اگر بغاوت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ کے خلاف ہو تو ناروا ہے اور اگر ایسے شخص کے خلاف نہ ہو تو جانے دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ایک ظالم کے ذریعہ دوسرے ظالم سے انتقام لیں پھر روز محشر دونوں خدا کے حضور جواب دہ ہوں گے۔

ابو جعفر منصور کی مجلس نگاہ اس سے بھی بے خبر نہ تھی۔ چنانچہ واپسی مدینہ نے امام مالک پر سخت عتاب نازل کیا۔ بعد میں منصور کہا کرتا تھا کہ یہ میرے حکم سے نہیں ہوا تھا۔ فقہی مذاہب پر گفتگو کرتے وقت ہمال امام مالک کا تذکرہ آئے گا وہاں ہم اس کی تفصیلات بیان کریں گے۔

زیدیہ عقائد میں تبدیلی کے بعد زیدیہ فرقہ مکر و پرہیزگیا اور دوسرے شیعہ فرقے اس پر غالب آئے یا انہوں نے اسے لپیٹ کر رکھ دیا اور یہ اپنی خصوصیت کو کھو بیٹھے یہ مفسول کی امامت کے عقیدہ سے منحرف ہو گئے اور ان روافض میں شمار ہونے لگے جو حضرت ابو بکر و عمر کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے ان کی عظیم ترین خصوصیت جاتی رہی۔ بنا بریں ہمارا خیال ہے کہ زیدیہ دو ہیں۔ اول = متقدمین جو روافض میں شمار نہیں ہوتے اور شیخین (ابو بکر و عمر) کی امامت کے قائل ہیں۔ دوم = متاخرین جو رافضی ہیں اور شیخین کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے۔

زیدیہ فرقہ آجکل بھی یمن میں موجود ہے یمن کے زیدیہ متقدمین زیدیہ سے بہت قریب ہیں اور وہی عقائد رکھتے ہیں۔

۱۲۔ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ

۵۔ امامیہ کی تعریف | یہ فرقہ جسے شیعہ امامیہ کہا جاتا ہے۔ اس کے عموم میں شیعہ کے وہ تمام فرقے داخل ہیں جو مختلف بلادِ اسلامیہ

مثلاً ایران عراق پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ شیعہ امامیہ میں وہ فرقے بھی شامل ہیں جن کے افکار و معتقدات میں اس حد تک انحراف پیدا نہ ہوا ہو کہ وہ کسی نصِ قرآنی یا دین کے اساسی دنیاوی مسائل میں سے کسی قاعدہ و اصل کی مخالفت کرنے لگیں نیز وہ فرقے جو اپنے اعتقادات پوشیدہ رکھتے ہیں اور ان کے اعمال کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہم مختصراً ان فرقوں پر روشنی ڈالیں گے۔

۳۱۔ ان تمام فرقوں میں وجہ اشتراک لفظ امامیہ کا مفہوم ہے۔ امامیہ کہتے ہیں کہ امامان

دین کے صرف اوصاف ہی نہیں بتائے جاتے۔ جیسا کہ امام زید کا قول ہے بلکہ صریح الفاظ میں شخصانہ کی تعیین کر دی جاتی ہے (حضرت علی کو نبی کریم نے خود متعین فرمایا تھا۔ بعد میں انبیا کے ائمہ کو حضرت علی آنحضرت کی وصیت کے مطابق خود متعین فرماتے ہیں انکو اوصیاً کہا جاتا ہے۔ حضرت علی کی امامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصِ قطعی اور یقین کامل سے ثابت ہو چکی ہے اور آپ نے اوصاف بیان کر کے اشارے کئے پر کتفا نہیں فرمایا۔ دین اسلام میں امام کی تعیین سے تپا نہ ضروری کام اور کوئی نہ تھا کہ آپ امت کے کام سے قانع ہو کر دنیا سے تشریف لے جائیں۔ جب آپ کی بعثت ہی رفعِ خلافت اور قیامِ اتحاد کے لئے تھی تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ امت کو یونہی چھوڑ کر راہی ملک بقاء ہوں کہ ہر شخص اپنی مانی کارروائی کرنے لگے۔ اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ اپنی راہ لے۔ بلکہ ایک شخص کی تعیین ضروری تھی جس کی طرف رجوع کیا جاسکے اور ایک قابلِ اعتماد امام کے نام کی صراحت بے حد ناگزیر تھی۔ حضرت علی کی تعیین پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ بعض آثار سے استدلال کرتے ہیں اور انہیں ان روایات کی صداقت اور صحت سند کا بھی دعویٰ ہے۔)

مثلاً یہ آثار

- (۱) " مَنْ كُنْتُ مَوْلَاكَ فَعَلَيْهِ وَالْآخِرَةُ " (جس کا میں دوست ہوں حضرت علی بھی اس کے دوست ہیں)
- (۲) " اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ " (اے اللہ جسے دوست رکھے تو بھی اسے دوست رکھا اور جو علی کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو)

(۳) "أقضاكم علي" (حضرت علی سے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں) مگر اہل سنت محدثین کے نزدیک ان آثار کی صحت مشتبہ ہے۔

اس کے علاوہ چند دوسرے امور سے بھی حضرت علی کی امامت کا استنباط کرتے ہیں جن کی انجام دہی کے لئے آپ نے حضرت علی کو مامور فرمایا اور دیگر حضرات کو کچھ اور کام تفویض فرمائے وہ یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم نے کسی صحابی کو حضرت علی کا امیر مقرر نہیں کیا بلکہ جس لڑائی میں آنحضرت تشریف نہ لے جاتے اور حضرت علی تنہا ہوتے تو وہاں آپ ہی امیر لشکر ہوتے تھے۔ بخلاف ازیں حضرت ابو بکر و عمر کبھی امیر ہوتے اور کبھی مامور حضرت ابو بکر و عمر کو اسامہ کی سپہ سالاری میں جنگ پر بھیجنے سے وہ حضرت علی کی خلافت پر استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے ان کو جنگ میں اس لئے بھیجا یا تھا کہ خلافت کے بارے میں حضرت علی سے جھگڑا نہ کریں جو بقول ان کے آنحضرت کی وصیت کے مطابق خلیفہ مقرر ہو چکے تھے۔ علاوہ ازیں ۹ھ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علی کو سورہ توبہ پڑھنے کی ہدایت کرنے اور حضرت ابو بکر کو یہ خبر تفویض نہ کرنے سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت علی خلافت کا اولین استحقاق رکھتے تھے حالانکہ حضرت ابو بکر اس وقت امیر چھتے۔

۲۲ امامیہ اس طرح حضرت علی کی تعیین پر استدلال کرتے اور ان اخبار و آثار کی صحت کے بھی مدعی ہیں۔ وہ چند

امامیہ میں ظہور اختلاف

اعمال کو بھی خلافت علی کی دلیل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اعمال بمنزلہ نصوص ہیں۔ بخلاف ازیں جمہور نہ ان آثار کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان اعمال سے امامیہ کے استنباط کو درست تصور کرتے ہیں۔

جس طرح امامیہ آنحضرت کی نص قطعی سے حضرت علی کے وصی ہونے کے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی کے بعد ان کی وہ اولاد اوصیاء میں شمار ہوگی جو حضرت فاطمہؓ، حسنؓ اور پھر حسینؓ کی نسل سے ہو۔ اس حد تک تو یہ عقیدہ ان کے ہاں اجماعی ہے۔ اس کے بعد وہ مختلف انجیال ہو گئے اور ایک نظریہ پر جمع نہ ہو سکے وہ بہت سے فرقوں میں بٹ گئے بعض نے ستر سے زائد فرقے شمار کئے ہیں۔ دو فرقے سب سے زیادہ مشہور ہیں (۱) اثنا عشریہ

(۲) اسماعیلیہ

۲۳ (۱) اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؓ کے بعد خلافت علی زین العابدینؓ

کا حق تھا پھر محمد باقر بن زین العابدین پھر جعفر صادق بن باقر پھر ان کے فرزند موسیٰ کاظم پھر علی رضا پھر محمد جوہاد پھر علی ہادی پھر حسن عسکری پھر ان کے بیٹے محمد جوہار ہوئے امام تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ ستر من رومی میں اپنے والد کے گھر کے ایک تہ خانہ میں داخل ہوئے اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔ اس بات کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس وقت انکی عمر کیا تھی۔ بعض کے نزدیک چار سال اور بعض آٹھ سال کہتے ہیں۔ اس طرح آپکی امامت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ آپ اس وقت امام تھے اور صاف کچھری طرح بہرہ ور تھے اور آپ کی اطاعت ضروری تھی۔ کچھ اثنا عشریہ یہ کہتے ہیں کہ بوقت کو پہنچنے سے قبل شیعہ علماء کو حکومت کا حق حاصل تھا۔ موجودہ اثنا عشریہ آخری رائے پر عمل کرتے ہیں۔

فرقہ اثنا عشریہ اور ایران و عراق | ۲۴۳۔ (اثنا عشری شیعہ آج کل عراق میں پائے جاتے ہیں۔ عراق میں شیعہ کی بڑی کثرت ہے اور

تقریباً نصف آبادی پر مشتمل ہیں۔ یہ سب اثنا عشری ہیں اور عقائد ائمہ اربعہ، اموال موارثت و وصایا اوقاف زکوٰۃ اور عبادات میں اثنا عشری اصولوں پر چلتے ہیں۔ ایران کے اکثر شیعہ بھی اثنا عشری ہیں۔ اس فرقہ کے لوگ شام و لبنان اور دیگر ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں) یہ لوگ اہل سنت سے محبت کرتے ہیں اور حقارت و نفرت کا سلوک نہیں کرتے۔

(امامیہ اثنا عشریہ دیگر امامیہ کی طرح امام کو ایک مقدس شخصیت تسلیم کرتے ہیں جو وصیت نبوی کے مطابق اس منصب پر فائز ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک جس طرح اس کی امامت وصیت پر مبنی ہوتی ہے اسی طرح اس کے جملہ تصرفات آپ کے زیر اثر ہوتے ہیں) چنانچہ اب ہم امام کی حکومت و سلطنت اور قوانین و احکام میں اس کی حدود کا تذکرہ کریں گے۔

امامیہ کی نگاہ میں امام کا مقام | ۲۴۵۔ (امامیہ کے نزدیک امام کو قانون سازی اور تشریح کا پورا اختیار حاصل ہے۔ امام کی ہدایات

شرعیہ کا درجہ رکھتی ہے اور کوئی بات خلاف شریعت نہیں ہوتی۔) علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء لکھتے ہیں۔

در امامیہ کا اعتقاد ہے کہ وجوب و حرمت کراہت و کذب اور اباحت کے پانچ احکام میں سے کوئی نہ کوئی حکم انسانوں کے تمام اعمال اور واقعات میں ضرور پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام احکام خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت کر دیئے تھے۔ آپ نے وحی و الہام کے ذریعہ ان کی معرفت حاصل کی اور ان میں

سے بہت سے احکام کو بیان کر دیا خصوصاً ان صحابہ کو آپ نے ان سے آگاہ کر دیا تھا جو ہر وقت آپ کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ صحابہ ان احکام کو تمام اَنفِ اَرْضی میں پہنچا دیں۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا۔
 "لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا"
 بہت سے احکام ایسے ہی تھے جو دوامی محرکات کے فقدان کے باعث معرض ظہور میں نہ آسکے مصلحت تدریج کا تقاضا بھی یہ تھا کہ بعض احکام کو ظاہر کیا جائے اور بعض کو مخفی رکھا جائے۔ نبی کریم نے یہ تمام احکام ایسے اوصیاء کو ودیعت کر دیئے اس طرح ہر وصی دوسرے تک یہ احکام پہنچاتا رہتا تاکہ وہ مصلحت و حکمت کے تحت مناسب وقت پر انہیں ظاہر کر دے۔ احکام سمجھی قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً عام مخصوص البعض مطلق مقید یا مجمل مبتین و علاوہ ازیں بعض اوقات پیغمبر ایک حکم عام صادر کرتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اس کا تخصیص ذکر کرتا ہے بعض اوقات وہ بالکل تخصیص کا ذکر بھی نہیں کرتا اور اسے اپنے وصی کے سپرد کر دیتا ہے کہ وہ مناسب وقت پر اس کا اظہار کر دے۔

(بحوالہ اصل الشیعہ و اصولہا ص ۲۹)

یہ اقتباس ہم نے ایک شیخ بزرگ کی تصنیف سے پیش کیا ہے۔ دستور سازی اور احکام کے متعلق اس سے تین باتیں مستفاد ہوتی ہیں۔

- ۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ نبی کریم نے ائمہ کو جو آپ کے اوصیاء بھی تھے شریعت کے اسرار بتا دیئے تھے آپ نے زمان و مکان کے تقاضا سے ان میں سے بعض اسرار بیان فرمادیئے اور بعض ائمہ کو بطور امامت تفویض کر دیئے تھے کہ حسب ضرورت ان کو لوگوں پر متکشف کر دیئے۔
- ۲۔ اوصیاء کے اقوال شریعت اسلامیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ انھنوں کی تفویض کردہ امانتیں ہیں اور ان کا مصدر و ماخذ آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔
- ۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ ائمہ نصوص عامہ کو مخصوص اور مطلق کو مقید کر سکتے ہیں۔

امام کے منصب عالی کے جوہرات | ہم نے قانون سازی میں امام کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ فرقہ امامیہ کی نگاہ میں معصوم ہے

عن الخطاء اور بھول چوک سے میرا ہوتا ہے۔ ظاہر و مہر اور شک و ریب سے براہ راست بھی امامیہ کے نزدیک امام کے لوازمات میں سے ہے۔ تمام امامیہ کا اس پر اجماع ہے اور

نا عشری کتب میں بھی اسی طرح مرقوم ہے (پنچا پنچ شریف مرتضیٰ اپنی کتاب الشافی میں لکھتے ہیں۔
 "ہمارے نزدیک یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور ہمارے شیخ الفین بھی اس امر کا
 اعتراف کرتے ہیں کہ شرعی حدود قائم کرنے اور تنفیذ احکام کے لئے ایک امام کا وجود
 از بس ناگزیر ہے۔ جب امام کی ضرورت مسلم ہو گئی تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ امام
 معصوم ہوتا ہے کیونکہ اگر اس کی عصمت کو تسلیم نہ کیا جائے تو دین میں خطا کا ہونا
 لازم آتا ہے۔ مگر ہم بصورت خطا بھی امام کی اتباع و اقتداء پر مامور ہیں۔ اس کا
 مطلب یہ ہو گا کہ ہمیں ایک اعتبار سے ایک مذموم فعل انجام دینے پر مامور کیا گیا ہے جو
 فاسد ہے۔ لہذا لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جن کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے وہ معصوم
 عن الخطا ہیں۔" (الشافی للشریف المرتضیٰ ص ۴۰ طبع قادیان)

(امامیہ کے نزدیک امام ظاہراً و باطناً تقویٰ امامت سے قبل و بعد گناہوں سے
 معصوم ہوتا ہے۔ علامہ طوسی اس ضمن میں لکھتے ہیں :-

"خدائے علیم و حکیم کے لئے یہ پسندیدہ بات نہیں کہ امامت ایسے منصب عالی پر
 ایسے شخص کو متعین کر دے جو اپنے باطن کے اعتبار سے لعنت کا مستحق ہو اور اس قابل ہو
 کہ اس سے اظہار رسالت کیا جائے۔ ایسا فعل حد درجہ کی حماقت ہے۔ امامت سے
 قبل بھی امام کا معصوم ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ جب امام کے اقوال شرعی حجت
 کا درجہ رکھتے ہیں تو قبل از امامت بھی اسے گناہوں سے میرا ہونا چاہئے۔ کیوں کہ
 گناہوں سے تلوث ہونے کی صورت میں لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں گے۔ جس طرح
 ہم انبیاء علیہم السلام کو بھی قبل از نبوت معصوم قرار دیتے ہیں۔"

(تلخیص الشافی للطوسی ص ۳۱۹)

۴۷۔ (امامیہ کے یہاں امام سے خارق عادات کا ظہور
 پذیر ہونا بھی جائز ہے اور ان سے اس کی امامت کی تصدیق
 ہوتی ہے۔ وہ امام کے خارق عادات کو بھی معجزہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس طرح انبیاء
 کے خارق عادات کو معجزہ کہا جاتا ہے امامیہ کہتے ہیں کہ جب امام کی امامت کے بارے میں
 کوئی نص قطعی موجود نہ ہو تو امامت کا اثبات معجزہ سے ہونا چاہئے) علامہ طوسی جو اپنے
 زمانہ کے شیخ الطائفہ تھے ارقام فرماتے ہیں :-

کسی کا امام ہونا یا تو نص سے واضح ہوتا ہے یا معجزہ سے۔ جب کوئی شخص کسی امام کے بارے میں نص قطعی پیش کرے تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ جب ایسی نص پیش کرنے سے اعراض کیا جائے تو امام کے باقیوں کیلئے معجزہ کا صدور ضروری ہے جس کی بناء پر وہ دوسروں سے ممتاز ہو جائے۔ لوگ اسے پہچان سکیں اور اس کے اور دوسروں کے درمیان امتیاز قائم کر سکیں۔ (تخصیص الشافی للطوسی ص ۱۰۰ طبع قاری)

۳۸۔ امامیہ کے نزدیک امام کا علم شریعت سے تعلق

اممہ کا علم کلی سے بہرہ ور ہونا رکھنے والی ہر چیز پر حاوی ہوتا ہے اور وہ تمام احکام شریعتی

کو جانتا ہے۔ علامہ طوسی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

”یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مقرر کردہ امام سارے دین کا امام ہوتا ہے اور اور چھوٹے بڑے ظاہر و پوشیدہ تمام احکام اسی سے والیسم ہوتے ہیں (یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ جمیع احکام سے آشنائے ہو۔ کیونکہ عقلاء کے نزدیک یہ بات موزوں نہیں کہ ایسے شخص کو احکام سونپ دیئے جائیں جو ان سے آگاہ بھی نہ ہو۔)

شیعہ امامیہ کی رائے میں امام کو علم کلی بالفعل حاصل ہوتا ہے یہ نہیں کہ اس میں ذاتی کوشش سے علم حاصل کرنے کی استعداد ہوتی ہے مقصود یہ ہے کہ امام علم الہی سے بہرہ ہوتا ہے یہ نہیں کہ وہ دیگر علماء کی طرح ذاتی محنت و مشقت سے علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتہادی علم کا امکان علم ناقص کے قبیل سے ہے جو ابتداءً جہل ہوتا ہے اور پھر علم میں تبدیل ہو جاتا ہے حالانکہ امام کا کسی وقت بھی دینی امور سے جاہل ہونا جائز نہیں۔ امامیہ کا یہ قول کہ اممہ علم کلی پر محیط اور حاوی ہوتے ہیں۔ ان کے اس عقیدہ کا لائق نتیجہ ہے کہ اوصیاء کو رسالت مآب کی جانب سے بیان شریعت کا علم ودیعت کیا گیا ہے۔ پس اممہ و اوصیاء کا علم نبوی امانت ہے جو ان کو عطا ہوئی اور ظاہر ہے کہ انبیا خطاب معصوم ہوتے

۳۹۔ امامیہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام کا وجود

تحفظ شریعت کے لئے امام کی ضرورت صرف بیان شریعت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کے مشن کی تکمیل کے لئے ہی ضروری نہیں بلکہ اس لئے بھی لایبھی ہے کہ امام شریعت کی حفاظت کرتا، اسے صنائع ہونے سے بچاتا اور اس کی نصرت و حمایت کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ نبی کریم کے وصال کے بعد امام دین متین کا محافظ و نگران ہوتا ہے۔ اسے تحریف و ضلالت سے

جاتا اور آراء باطلہ کے غالب آتے سے روکتا ہے (امام خدا کی وہ حجت ہے جو تار و زقیا مت باقی رہے گی حضرت علی رضی اللہ عنہ اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

”کہہ ارضی کسی وقت بھی حجت خداوندی سے خالی نہیں رہ سکتا یہ حجت یا تو پوشیدہ ہوتی ہے یا ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ نبی کے اوصیاء ہی اس حجت کو قائم رکھتے

ہیں۔ ان کی عصمت و عفت کی وجہ سے جو ان کی پیروی کرتے کا سبب ہے دین اسلام تار و زقیا محفوظ و مستون رہے گا۔ نبی کریم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت کبھی ضلالت پر جمع نہ ہوگی۔ ضلالت جمع نہ ہونے سے ہی دین قیامت تک محفوظ رہ سکتا ہے۔ امامیہ کہتے ہیں کہ عقلی اعتبار سے

امت کا ضلالت پر جمع ہونا ممکن ہے مگر امام معصوم تبلیغ و ارشاد کے ذریعے امت کو گمراہ نہیں ہونے دیتا۔ دیا دیوان و مذاہب کے لوگ اسی لئے گمراہ ہو گئے کہ ان میں امام معصوم موجود نہ تھا نیز اس لئے کہ ان کی شریعت آخری شریعت نہ تھی۔ بخلاف اہل نبی کریم کی شریعت آخر الشرائع ہے۔ اور اسے ضلالت سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک امام معصوم کی ضرورت ہے۔ (الشافی شریف المرضا)

امامیہ کے دعاوی کا ابطال | ۵۰۔ یہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک امام کے مرتبہ و

مقام کی جانب چند اشارے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمام امامیہ ان عقائد میں متحد الخیال ہیں۔ امام کا مرتبہ ان کی رائے میں نبی کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس میں ان کے یہاں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ وہ بڑی وضاحت سے کہتے ہیں کہ نبی و وصی میں وحی الہی کے ماسوا سرے سے کوئی فرق و امتیاز پایا ہی نہیں جاتا۔

امام کی شخصیت کے متعلق شیعہ امامیہ کے بلند بانگ دعاوی قطعی طور پر بے بنیاد ہیں اور ان کی کوئی دلیل موجود نہیں البتہ ان کے بطلان کے دلائل موجود ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم نے مکمل طور پر شرعی احکام بیان کر دیئے تھے اور ان کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ“ (میں نے تمہارا دین کامل کر دیا)

اگر (معاذ اللہ) آپ نے کوئی بات پوشیدہ رکھی ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے منصب رسالت کا حق ادا نہ کیا حالانکہ یہ محالات ہیں سے ہے۔ مزید برآں معصوم عن الخطا ہونا خاصہ انبیاء و پیغمبروں کے علاوہ دوسروں کی عصمت کسی دلیل سے ثابت نہیں۔

۳۔ امامیہ اسماعیلیہ

فرقہ اسماعیلیہ | ۱۵ | فرقہ اسماعیلیہ امامیہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ مختلف اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ اسماعیلیہ کسی حد تک جنوبی و وسطی افریقہ، بلاد شام، پاکستان اور زیادہ تر انڈیا میں آباد ہیں۔ کسی زمانہ میں یہ برسرِ اقتدار بھی تھے۔ قاطبیہ مصر و شام اسماعیلی تھے۔ قراطیہ جو تاریخ اسلامی کے ایک دور میں متعدد ممالک پر قابض ہو گئے تھے۔ اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

اسماعیلیہ کا تعارف | ۱۶ | یہ فرقہ اسماعیل بن جعفر کی طرف منسوب ہے۔ یہ ائمہ کے بارے میں امام جعفر صادق ^ع تک اثنا عشریہ کے ساتھ متفق ہیں۔ امام جعفر صادق کے بعد ان دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اثنا عشریہ کے نزدیک امام جعفر صادق کے بعد ان کے بیٹے موسیٰ کاظم امامت کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس کے برعکس اسماعیلیہ امام جعفر صادق کے بیٹے اسماعیل کو امام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جعفر صادق کے بعد ان کے فرزند اسماعیل اپنے والد کی نص کی بنا پر امام ہوئے۔ اسماعیل کو اپنے والد سے قبل فوت ہو گئے مگر نص کا فائدہ یہ ہوا کہ امامت ان کے اخلاف میں موجود رہی۔ کیونکہ امام کی نص کو قابل عمل قرار دینا اس کو عمل کر کے رکھ دینے سے بہتر ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اقوال امام امامیہ کے یہاں شرعی نصوص کی طرح واجب التعمیل ہیں۔

x اسماعیل سے منتقل ہو کر خلافت محمد المکتوم کو ملی یہ مستور ائمہ میں سے اولین امام تھے امامیہ کے نزدیک امام مستور بھی ہو سکتا ہے اور اس کی اطاعت بھی ضروری ہوتی ہے محمد مکتوم کے بعد ان کے بیٹے جعفر مصدق پھر ان کے بیٹے محمد حبیب کو امام قرار دیا گیا یہ آخری مستور امام تھے۔ ان کے بعد عبداللہ مہدی ہوئے جس کو لوگ المغرب بھی کہا جاتا ہے اس کے بعد ان کی اولاد مصر کی بادشاہ ہوئی اور یہی قاطبی کہلائے۔

اسماعیلیہ کی مختصر تاریخ | ۱۷ | دوسرے فرقوں کی طرح شیعہ کا یہ فرقہ بھی سر زمین عراق میں پروان چڑھا اور دیگر فرقوں کی طرح وہاں تختہ مشق ظلم و ستم بنا انہیں فارس و خراسان اور دیگر اسلامی ممالک مثلاً ہندوستان کی طرف

بھاگنا پڑا۔ وہاں جا کر ان کے عقائد میں قدیم فارسی افکار اور ہندی خیالات گڈ بٹھ ہو گئے اور ان میں عجیب و غریب خیالات کے لوگ پیدا ہونے لگے جو دین کے نام سے اپنی مقصد برآدی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد فرقے اسماعیلیہ کے نام سے موسوم ہو گئے بعض دینی امور کے اندر محدود رہے اور بعض اسلام کے اساسی اصولوں کو ترک کر کے اسلام سے باہر نکل گئے۔

اسماعیلیہ فرقہ کے افراد پر ہندو برہمنوں۔ اشراقی فلاسفہ اور بدھ مت والوں سے ملے جلے۔ کڈانیوں اور ایرانیوں میں روحانیت اور کواکب و نجوم سے متعلق جواشکات پائے جاتے تھے وہ بھی اخذ کئے پھر ان مختلف النوع افکار و نظریات کا ایک میٹھون سرکب تیار کیا۔ ایسے لوگ دائرہ اسلام سے بہت دور نکل گئے بعض اسماعیلیہ نے صرف و اجبی حد تک ان افکار سے استفادہ کیا اور اسلامی حقائق سے وابستہ رہنے کی کوشش کی۔ ان کے سب سے بڑے داعی یا طینیہ تھے جو جمہور امت سے کٹ گئے تھے اور اہل سنت کے نظریات سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ جس قدر حقائق کو چھپاتے تھے اسی قدر عام مسلمانوں سے دور نکلتے جاتے تھے۔ ان کے جذبہ اخفاء کا یہ عالم تھا کہ خطوط لکھتے وقت اپنا نام نہیں لکھتے تھے۔ مثال کے طور پر رسائل انعمان الصفاء باطنیہ کی کاوش قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ رسائل بڑے مفید علمی معلومات پر مشتمل ہیں اور ان میں بڑے عمیق فلسفہ پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ مگر یہ نہیں تپہ چلتا کہ کن علماء نے ان کی تسوید و تحریر میں حصہ لیا۔

اسماعیلیہ کو باطنیہ کے نام سے موسوم کرنے کے وجوہات

کو یہ لقب اس لئے ملا کہ یہ اپنے معتقدات کو لوگوں سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسماعیلیہ میں اخفاء کا رجحان پہلے پہل جو رستم کے ڈر سے پیدا ہوا اور پھر ان کی عادت ثانیہ بن گئی کہ اسماعیلیہ کے ایک فرقہ کو حشاشین (بھنگ نوش) بھی کہتے ہیں۔ جن کی کرتوتوں کا انکشاف صلیبی جنگوں اور حملہ تاتار کے آغاز میں ہوا۔ اس فرقہ کے اعمال قبیحہ کی بدولت اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا۔

(ان کو باطنیہ کہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ اکثر حالات میں امام کو مستور مانتے ہیں۔ ان کی رائے میں مغرب میں اٹلی سلطنت کے قبا کے زمانہ تک امام مستور رہا۔ یہ حکومت پھر مصر منتقل ہو گئی۔

ان کو باطنیہ ان کے اس قول کی وجہ سے بھی کہا جاتا ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ لوگوں کو صرف ظواہر شریعت کا علم ہے۔ باطن کا علم صرف امام کو معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ امام باطن الباطن سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ اسی عقیدہ کے تحت باطنیہ الفاظ قرآن کی بڑی دُور انداز کاروائیوں میں لکھتے ہیں بعض نے تو عربی الفاظ کو بھی عجیب و غریب تاویلات کا جامہ پہنا دیا۔ ان تاویلات بعیدہ اور سراسر امام کو وہ علم باطن کا نام دیتے ہیں۔ ظاہر و باطن کے اس چکر میں اثنا عشریہ بھی باطنیہ کے ہم نوا ہیں۔ بہت سے صوفیاء نے بھی باطنی علم کا عقیدہ اسماعیلیہ سے اخذ کیا۔

پھر کیف اسماعیلیہ اپنے عقائد کو پس پردہ رکھنے کی کوشش کرتے اور مصلحت و وقت کے تحت بعض افکار کو منکشف کرتے۔ باطنیہ کے انخفاء و عقائد کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب میں برسر اقتدار ہونے کے دوران بھی وہ اپنے افکار و آراء کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔

باطنیہ کے اصول اساسی | ۵۵ | اعتدال پسند باطنیہ کے افکار و آراء دراصل تین امور پر مبنی تھے۔ ان سب میں اثنا عشریہ ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

۱۔ علم و معرفت کا وہ فیضان الہی جس کی بناء پر ائمہ فضیلت و عظمت اور علم و فضل میں دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ علم و معرفت کا یہ عطیہ ان کی عظیم خصوصیت ہے۔ جس کوئی دوسرا فرد بشر ان کا سہیم و شریک نہیں۔ جو علم انہیں دیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کے لئے بالائے ادراک ہوتا ہے۔

۲۔ امام کا ظاہر ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ مستور بھی ہوتا ہے اور اس حالت میں بھی اس کی اطاعت ضروری ہوتی ہے۔ امام ہی لوگوں کا ہادی اور پیشوا ہوتا ہے۔ کسی زمانہ میں اگر وہ ظاہر نہ بھی ہو تو کسی نہ کسی وقت وہ ظاہر ہوگا۔ قیام قیامت سے قبل امام کا منظر عام پر آنا ان کے لفظ نگاہ کے مطابق ضروری ہے۔ امام جب ظاہر ہوگا تو کائنات عالم پر عدل و انصاف کا دور دورہ ہو جائے گا۔ جس طرح اس کی موجودگی میں جور و استبداد کا سکہ جاری رہتا تھا اب اسی طرح ہر طرح عدل و انصاف کی کار فرمائی ہوگی۔

۳۔ امام کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا اور اس کے افعال کیسے بھی ہوں کسی کو ان

خردہ گیری اور انگشت نمائی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ بلکہ سب کے لئے امام کے افعال پر ہر تصدیق ثابت کرنا اور ان کو نیکی پر محمول کرنا واجب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام جس علم سے بہرہ ور ہے۔ سب لوگ اس سے محروم ہیں (اسی سے انہوں نے عصمتِ ائمہ کا عقیدہ گھڑا۔ ان کے نزدیک اماموں کے معصوم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جو کتا ہمیں معلوم ہے اس سے ان کا ارتکاب نہیں کرتے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جن باتوں کو ہم گناہ تصور کرتے ہیں وہ ان کے مخصوص علم کی روشنی میں ان کے لئے جائز اور مباح ہوتے ہیں۔

فرقہ حاکمیت و ذرہ | ۵۶۔ باطنیہ کے ذکر کردہ افکار کے بعض گوشے ایسے ہیں جنہیں کفر صریح سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

غالب و سنت میں ان کا ذکر نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ اکثر باطنیہ ہی عقائد رکھتے تھے تاہم کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اسلامی احکام کے جوڑا کو ہی اتار پھینکا اور اس کی حدود کو پھانڈے۔ باطنیہ کے عقائد باطلہ کے زیر سایہ حاکمیت کا فرقہ پروان چڑھا۔ حاکمیت ایک عالی فرقہ تھا جو اسلامی حدود سے بہت آگے نکل گیا بعض حاکمیت نے اشراق الہی کے معنی و مفہوم میں جس حد تک اشراق و مبالغہ سے کام لیا کہ وہ ائمہ کی ذات میں حلولِ باری تعالیٰ کے قائل ہو گئے۔ ان عالی شیعہ کا سرغنہ "حاکم بامر اللہ فاطمی تھا جو کہا کرتا تھا کہ ذاتِ خداوندی اس میں حلول کر آئی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دیا کرتا تھا۔ وہ روپوش ہو گیا تھا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی۔ بعض کہتے ہیں وہ قتل کر دیا گیا تھا۔ صحیح تر یہ ہے کہ اس کے کسی رشتہ دار نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اس کے پیر و اس کی موت کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ اٹھایا گیا ہے اور لوٹ کر آئے گا۔ اس فرقہ کو حاکمیت کہا جاتا ہے۔

فرقہ دروز کے لوگ زیادہ تر شام میں پائے جاتے تھے۔ حاکمیت کے ساتھ ان کے گہرے مراسم تھے بعض مورخین کا خیال ہے کہ ایک فارسی شخص "حزہ الدرزی" نے حاکم بامر اللہ کو یہ عقائد باطلہ سکھائے اور یہ فرقہ اسی کی طرف منسوب ہے۔ اس فرقہ کے باقی ماندہ افراد کا بھرتہ نہیں کیونکہ وہ کسی کو اپنے اعمال و عقائد سے آگاہ نہیں کرتے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

فرقہ نصیریہ | ۵۷۔ ملک شام میں حاکمیت کے گرد و نواح میں ایک عالی فرقہ اور بھی تھا جسے نصیریہ کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ اسمائیلیہ کی جانب منسوب تھے۔ تاہم اسلامی حدود سے تجاوز کرنے اور اسلامی احکام کی اطاعت کا جو اتار پھینکنے میں یہ ان کے ہمنوا تھے۔ اس فرقہ کے

افراد نے بھی ان غالی اسماعیلیہ کے زیر اثر تربیت پائی تھی جو اسلامی احکام کی اطاعت سے آزاد تھے۔
 نصیر یہ حاکم کی طرح ملک شام میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہ اثنا عشریہ کے ہم خیال تھے
 یا ان کی طرف منسوب تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اہل بیت کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے معرفت
 علی الاطلاق حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علی کو اللہ قرار دیتے تھے اور ان کی موت کے قائل نہ تھے۔
 یہ شریعت کا ظاہر و باطن قرار دیتے ہیں یا طنیہ کے ہم خیال تھے۔ ان کی رائے میں باطن کا علم صرف
 امام کو ہوتا ہے۔ کیونکہ امام پر ہی تجلیاتِ انوار کا نزول ہوتا ہے جس سے اسے شریعت کی
 حقیقت اور اس کے باطن کا شعور و ادراک حاصل ہو جاتا ہے۔

خلاصہ کلام! یہ فرقہ شیعہ کے غالی فرقوں کے افکار و نظریات کا مجموعہ مرکب تھا۔ انہوں نے
 شیعہ کے کفرانہ اور پر باد شدہ فرقہ سبئیہ سے حضرت علی کی الوہیت اور ان کے خلود و رجعت
 عقیدہ اخذ کیا اور یا طنیہ سے شریعت کے ظاہر و باطن کا مسئلہ سیکھا۔

۵۸۔ ان غالی لوگوں نے اسلامی اصول و شعائر
 حسن بن صباح اور اس کے اتباع کو خیر باد کہہ دیا تھا اور ان میں اسلام صرف برائے

نام باقی تھا۔ فاطمیہ مصر و شام کے عہد حکومت میں یہ فرقے خوب پھیلے پھولے۔ حاکم بامر اللہ بھی
 کی پشت پناہی کرتا تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر حاکم بامر اللہ کے عہد اقتدار میں یا طنیہ کا رئیس
 زعیم حسن بن صباح فارس میں منظر عام پر آیا۔ ایک طرف حاکم بامر اللہ الوہیت کا دعویٰ لے کر
 کھڑا ہوا اور دوسری طرف حسن بن صباح نے عباسیوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع
 کر دیا۔ حسن نے سرزمین شام میں باطنی داعیوں کا جال پھیلا دیا تھا جو لوگوں کو اپنے مذہب کی
 دعوت دیتے تھے۔

ملک شام میں یہ غالی شیعہ بڑی کثرت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے "السمان" نامی پہاڑ کو اپنا
 مرکز بنایا۔ آج کل اسے جبل نصیر یہ کہتے ہیں۔ ان کے بعض پیشوا اپنے مریدوں کو بھنگ نوش
 کی تلقین کرتے تھے۔ اسی بناء پر تاریخ اسلام میں یہ حشاشین (بھنگ نوش) کے نام سے مشہور ہوئے۔
 جب صلیبی حملہ آوروں نے بلاد شام اور پھر دیگر اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کیا تو انہوں نے
 مسلمانوں کے خلاف صلیبیوں کا ساتھ دیا۔ جب صلیبی اسلامی دیار و اقصاء پر مسلط ہو گئے تو
 انہوں نے ان کو اپنا مقرب خاص بنایا اور بڑے بڑے عہدے پیش کئے۔

سلطان نور الدین زنگی سلطان صلاح الدین ایوبی اور دیگر سلاطین ایوبیہ رحمہم اللہ کے

ہمد اقدار میں باطنیہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ ان کے عہدِ حکومت میں ان کا کام صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے قائدین کے خلاف سازشیں کرتے اور ان کے خلاف مکر و فریب کا جال پھیلانے میں مصروف رہتے تھے۔

بعد ازاں جب تاتاریوں نے ملک شام پر دھاوا بولا تو فرقہ نصیریہ والوں نے ان کی نصرت و حمایت کا دم بھرنا شروع کر دیا جس طرح قبل ازیں صلیبیوں کی امداد کی تھی۔ باطنیہ نے مسلمانوں کی خون ریزی اور قتل و غارت میں امکانی حد تک سفاک تاتاریوں کا ساتھ دیا۔ جب تاتاریوں نے غارت گری سے دم لیا تو باطنیہ پہاڑوں میں جا چھپے اور مسلمانوں کو ہنس ہنس کرنے کے لئے کوٹی اور منصوبہ سوچنے لگے۔

۵۵۔ یہ ہے ان فرقوں کی مختصر داستانِ حیات جو شیعہ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ شیعہ فرقہ جہاں میں سے کون حاملِ صدق و صواب تھا۔ کون منحرف تھا۔ کس نے اسلام کا جو آتار پھینکا اور کون شیعہ علی کے نام سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہرا گتتا رہا تھا۔

اب ہم اس فرقہ کا حال بیان کرتے ہیں جو آغازِ ظہور ہی سے شیعہ کا ہم عصر تھا یہ خوارج کا فرقہ تھا۔

۱۴۔ خوارج

خارجی تحریک کا پس منظر | ۶۰۔ شیعہ اور خوارج دونوں فرقے حضرت علی کے عہدِ خلافت میں منصفہ شہود پر آئے۔ یہ دونوں حضرت علی کے

اعوان و انصار میں شامل تھے۔ اگرچہ فکری اعتبار سے شیعہ کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ حضرت علی کے لشکر میں خوارج کا ظہور اس وقت ہوا جب صفین کے مقام پر ان میں اور حضرت معاویہ میں کھسان کار لڑ پڑا۔ جب معاویہ لڑائی سے تنگ آئے اور بھاگ جانا چاہا تو حکیم کے نظریہ نے آپ کی جگہ خلاصی کرائی حضرت معاویہ کے رفقاء نے قرآن میزوں پر بلند کئے جو اس بات کی جانب اشارہ تھا کہ قرآن کو حکم مان لیا جائے مگر حضرت علی لڑائی پر مجبور رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرمادیں۔ جب آپ کے لشکر کے چند آدمیوں نے آپ کو حکیم کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا تو چاروں اچانک آپ نے اسے تسلیم کر لیا۔ جب مصالحت سے یہ طے پایا کہ دو ثالث مقرر کئے جائیں۔ ایک حضرت علی کی طرف سے اور دوسرا معاویہ کی جانب سے تو معاویہ نے عمرو بن العاص کو چنا اور علی نے عبداللہ بن عباس کو ثالث بنانا چاہا۔ مگر مخالفت کرنے والے اس پر معترض ہوئے اور ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانے کا مشورہ دیا۔ حکیم کا آخری فیصلہ یہ ہوا کہ حضرت علی کو خلافت سے علیحدہ کیا گیا اور معاویہ بحالی رہے جس سے معاویہ کا مقصد بڑی حد تک پورا ہو گیا۔

مجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علی کو حکیم کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر ایک خاص حکم مقرر کرنے پر تامل کئے جلد ہی ایسے بیانات سے منحرف ہو گئے اور حکیم کو ایک جرم قرار دینے لگے حضرت علی کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح ہم نے حکیم کو قبول کر کے ارتکاب کفر کیا تھا اور پھر اس سے تائب ہوئے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کا اعلان کریں۔ عرب کے بدو بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ "لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ" کے نعرہ کو اپنا شعار بنایا اور حضرت علی کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔

خارجی مذہب کی اساس | ۶۱۔ خوارج اپنے عقائد و افکار کے دفاع ان کی حمایت

اور تدین و تشرع میں تمام اسلامی فرقوں سے زیادہ سخت تھے۔ یہ اظہارِ جرات و جلالت میں چند الفاظ سے چمٹے رہے جن کے ظواہر کو لے کر انہوں نے

اسے دین مقدس کا درجہ دے رکھا تھا کہ جس سے کسی ایماندار کو خیال اعراض نہیں اور جس کی خلاف ورزی وہی شخص کر سکتا ہے جو بیتان کی طرف مائل اور کفر و عصیان اس کی راہ میں حاصل ہو۔ "لا محکم الا للہ" کے الفاظ ہر آن ان کے پیش نظر رہتے یہی ان کا دین تھا۔ جس سے مخالفین پر آواز دے سکتے اور ہر بات کو نعم کر کے دکھ دیتے جب حضرت علی کو مصروف گفتگو دیکھتے یہی نعرہ لگاتے۔

حضرت عثمان و علی اور ظالم حکام سے اظہارِ بیزاری کا خیال ان پر حاوی رہتا تھا۔ یہ چیز ان کے قلب و دماغ پر چھا گئی۔ ان کے لئے حق تک رسائی حاصل کرنے کے سبب دروازے بند کر دیئے تھے۔ عثمان و علی و طلحہ اور زبیر اور ظالمین بنی امیہ سے برأت کا اظہار کرنے والے کو اپنے زمرہ میں شامل کر لیتے تھے اور بعض دوسرے اصول و مبادی میں نسبتاً اس سے نرم سلوک کرتے۔ حالانکہ وہ مسائل ان سے زیادہ اہم ہوتے اور ان میں مخالفت کا ارتکاب کرنے سے وہ ان سے زیادہ دور جا پڑتے۔ مگر اظہارِ برأت کی مخالفت میں یہ خطرہ نہ تھا۔

جب خلیفہ عادل عمر بن عبدالعزیز نے خوارج سے سخت مباحثہ کیا تو نقطہ اختلاف ظالم امویوں سے اظہارِ برأت تھا۔ حالانکہ خوارج کو اعتراف تھا کہ آپ ان کے مخالف تھے ان کو ظلم سے روکتے اور لوگوں کے حقوق دلاتے تھے۔ لیکن برأت کا خیال ان کے اعصاب پر گہری طرح سوار تھا اور جمہور مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہونے سے مانع تھا۔

۶۲ - چند ذوق برق الفاظ کو اپنے عقول و مدارک پر مسلط کرنے میں خوارج ان لعنوں سے بہت قریب

فرانس کے انقلابی اور خوارج | میں۔ جنہوں نے انقلابِ فرانس کے زمانہ میں بدترین قسم کی ستم آرائی اور سنگ دلی کا مظاہر کیا تھا۔ ان کا نعرہ تھا "حریت، مساوات، اخوت" انہی دلفریب الفاظ کی آڑ لے کر انہوں نے بے گناہوں کو قتل کیا اور خونِ ناحق بہایا۔ خوارج کا نعرہ تھا "ایمان" حکومت صرف خدا کی ہے "افعال ظالمین سے برأت" ان الفاظ کی آڑ لے کر انہوں نے مسلمانوں کا خون بہایا اور بلادِ اسلامیہ کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کر دیا۔ ہر جگہ انہوں نے غارتگری کی۔

۶۳ - خوارج کی صرف یہی خصوصیت نہیں تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر بہادر اور شجاع تھے یا صرف اندلس کے قدائی مسیحی اور خارجی

الفاظ کا ظاہر پہلو دیکھنے کے نوکر تھے۔ ان کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ فدائیت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ موت کا انتظار میں بے چین رہتے تھے کسی قوی سبب کے بغیر بھی بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اس کا سبب محض لوگوں میں قلتِ عقل اور اضطرابِ اعصاب ہوتا تھا۔ اور صرف تمسک بالمدہب کی وجہ سے ایسا نہیں کرتے تھے اس معاملہ میں خوارج عیسائیوں کے اس گروہ سے بہت ملتے جلتے تھے جو اندلس میں عرب حکومت کے زیر اثر رہتے تھے۔ ایک فرقہ ان میں سے کم عقلی کا شکار ہو کر فکرِ فاسد اور شدید تعصب کے زیر اثر موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔ عیسائیوں کے اس گروہ کے افراد محکمہ قضا تک اس لئے جاتے تھے کہ مجھ کو گالی دیکر موت سے ہم آغوش ہوں۔ یہ لوگ جوق در جوق آتے اور مجھ کو گالیاں دیتے رہتے۔ یہاں تک کہ دربان ان کو لپکا کرتے کرتے ہٹک جاتے اور قاضی اپنے کالوں کو پہرہ بنا لیتا کہ ان نادالوں کی ہلاکت کا حکم نہ دینا پڑے۔ مسلمان بھی ان پر ترس کھاتے تھے اور انہیں دیوانہ خیال کرتے تھے۔

(الاسلام خواطر و سوانح از کاؤنٹ ہنری کی کاٹھی ترجمہ مرحوم فتحی زغلول)

یہی حال خوارج کا تھا یہ بے محابا علی کو ان کے خطبوں بلکہ نماز میں تنگ کرتے تھے یہ حضرت عثمان و علی کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور انہیں مشرک قرار دیتے تھے ان لوگوں نے جب عبداللہ بن خطاب بن الارث کو قتل کیا اور ان کی لونڈی کا پیٹ پھاٹ ڈالا تو حضرت علی نے ان سے کہا۔

”عبداللہ بن خطاب کے قاتلوں کو ہمارے حوالہ کر دو“

خوارج نے جواب دیا:

”عبداللہ بن خطاب کو ہم سب نے قتل کیا ہے“

آخر حضرت علی کو ان سے لڑنا پڑا یہاں تک کہ ان کا تقریباً قلع قمع ہی کر دیا۔ تاہم جو بچ نکلے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے طریقہ سے ہٹے نہیں بلکہ پوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ اپنی دعوت میں مصروف رہے۔

۶۴۔ جہاں تک اسلام سے خلوص اور الفت کا تعلق ہے کوئی شبہ نہیں یہ جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر

بھرا تھا۔ اگرچہ اس کے دوش بدوش وہ تدریجی خون اور اس کے صرف ایک پہلو سے

والہاتہ والستگی سے بھی خالی نہ تھے۔ روایت ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت ابن عباسؓ کو ان کے پاس بحث و گفتگو کے لئے بھیجا۔ ابن عباس نے دیکھا ان کے ہاتھوں پر لمبے لمبے مسجدوں کے باعث نشان پڑے ہوئے تھے اور ہاتھ اونٹ کے زانو کی طرح سخت تھے ان کے کمرے پینہ سے مٹرا بوز۔ غرض ان کا دینی اخلاص شک و شبہ سے بالا ہے۔ لیکن ہم دین کی کوتاہی نے اخلاص کے باوجود انہیں گمراہ کر دیا اور یہ اسلام کے جوہر اور روح کو پامال کرنے لگے۔ انہوں نے عبداللہ بن خطاب کو محض اس لئے قتل کر دیا تھا کہ وہ حضرت علیؑ کو مشرک تصور نہیں کرتے تھے بلکہ قیمت ادا کئے بغیر ایک عیسائی کی کھجوریں لینے سے انکار کر دیا تھا۔

ابوالعباس مبرد نے اپنی کتاب الکامل میں لکھا ہے:

خوارج کے دلچسپ واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ ان کی گرفت میں ایک مسلمان اور ایک نصرانی آگیا۔ انہوں نے مسلمان کو قتل کر دیا اور عیسائی کو ذمی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ عبداللہ بن خطاب کی جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی گردن میں قرآن لٹک رہا تھا۔ ان کے ساتھ ان کی حاملہ بیوی بھی تھیں۔

خارجیوں نے ان سے کہا:

”جو چیز تمہاری گردن میں لٹک رہی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ ہم تمہیں قتل کر ڈالیں“

پھر ان خوارج نے عبداللہ بن خطاب سے پوچھا:

”الوبکر و عمر کے بارے میں تم کیا کہتے ہو“

عبداللہ نے جواب دیا۔

”ان کے بارے میں کلمہ شہید کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔“

خوارج نے پھر سوال کیا

”تحکیم سے پہلے علیؑ اور خلافت کے ابتدائی دور میں عثمان کیسے تھے؟“

عبداللہ نے کہا ”بہت اچھے“

خوارج نے پوچھا ”تحکیم کے بارے میں تمہاری رائے کیسا ہے؟“

عبداللہ نے جواب دیا:

”میری رائے یہ ہے کہ علیؑ تم سے زیادہ کتاب الہی کو جانتے تھے۔ تم سے زیادہ وہ

نیکو کار، دین کے حامی نگہبان اور صاحب بصیرت و فراست تھے۔
خوارج نے کہا:

”تم سچائی کی پیروی نہیں کرتے لوگوں کے بھاری بھرکم ناموں کی پیروی کرتے ہو۔“
یہ کہہ کر عبداللہ بن جناب کو پکڑ کر ہنر کے کنارے لے گئے اور انہیں قریح کر دیا۔
X کھجور کے ایک درخت کی وجہ سے ایک نصرانی کو تکلیف دینے لگے
اس نے کہا میں کھجور کا درخت نہیں ہدیہ کرتا ہوں یہ قبول کر لیجئے۔
خوارج نے کہا: ”خدا کی قسم ہم اسے اس صورت میں قبول کر سکتے ہیں کہ ہم سے
قیمت وصول کرو۔“

نصرانی نے کہا:

”کیسی عجیب بات ہے کہ تم نے عبداللہ بن جناب جیسے آدمی کو قتل کر دیا اور
ہم سے ایک کھجور کا درخت نہیں لے سکتے۔“ (الکامل للمبروج ۲ ص ۱۲۳)

X **خوارج کا تشدد** ۶۵۔ خوارج میں یہ گروہی تعصب جنون شدتِ دفاعِ دعوت و
ترغیب میں تلوار کا استعمال اور ایسی سنگ دلی جس میں ترحمی تام کو

نہ تھی اور جس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں کیوں پائی جاتی ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ خوارج کی اکثریت باورِ نشین تھی۔ ان میں شہروں میں بسنے والے
لوگ بہت کم تھے یہ لوگ فقر و فلاکت کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ جب اسلام آیا تو بھی ان کی
مادی حالت کچھ بہتر نہیں ہوئی کیوں کہ انکی اکثریت نے جھگل کی زندگی حبِ سابق جاری رکھی۔ یہ
زندگی سخت کوشی اور صعوبتِ حیات پر مشتمل تھی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کی سادگی فکر انہیں
پسند آگئی۔ لیکن ان کا تصور کا دائرہ تنگ ہی رہا۔ علوم سے بھی انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان
امور کا بحیثیت مجموعی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان تو تھے۔ لیکن صفتِ تصور کے باعث جذبہ جہاد میں
آجاتے تھے۔ لذاتِ دنیوی سے بے تعلق تھے کیوں کہ وہ ان کو میسر نہ آسکی تھیں۔ اور جب
انسان کو دنیوی نعمتیں مل سکیں اور اس حالت میں ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جائے
اور وجدان میں اعتقادِ صحیح اتر جائے تو وہ دنیا کی رغبتوں سے بیزار ہو جاتا ہے۔ زندگی
کی لذتیں اس کا دامن اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں اور حیاتِ اخروی ہی کی طرف اس کی
ساری توجہ مرکوز ہو جاتی ہے۔

۶۶۔ تشدد کے اسباب میں کچھ دوسرے امور بھی تھے جن میں سب سے بڑا سبب قریش سے ان کا اس بات پر حسد تھا کہ وہ خلافت

تشدد کے اثرات و نتائج

حکومت پر قابض ہو گئے ہیں اور دوسرے لوگ اس حق سے بالکل محروم ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خوارج کی اکثریت رجبی قبائل سے تعلق رکھتی تھی۔ ان قبائل کے اور قبائل مضر کے مابین عداوت ایک عرصہ دراز سے چلی آ رہی تھی اسلام نے اگر اس عداوت کو کم کر دیا لیکن ختم نہ کر سکا اس کے آثار دلوں کے ہنساں خانہ میں مستور رہ گئے جو رہ رہ کر سیمان پیدا کیا کرتے تھے اور غیر محسوس طور پر ابھرتے رہا کرتے تھے اور مذہب کے عقیدت کش کو اس کا پتہ بھی نہ چلیا تھا۔ بسا اوقات انسان کے دل میں ایک داعیہ اجاگر ہوتا ہے اور اسے ایک خاص قسم کے لرزہ فکر و نظر پر آمادہ کر دیتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اس کا واحد محرک اس کا خلوص اور اس کا ہادی و رہنما عقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ زندگی کے اکثر امور میں اس کے منظر ہر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ انسان ہر اس نظریہ کو یا سانی قبول نہیں کرتا جو اس کے لئے باعث رنج و ملال ہو۔ بنا بریں ہم یہ سمجھتے ہیں حق بجانب ہوں گے کہ خوارج جو زیادہ تر قبائل ربیعہ سے وابستہ تھے خیال کرتے تھے کہ خلفاء زیادہ تر مضر سے ہیں تو یہ بالادستی اور اقتدار سے بیزار ہو گئے اس بیزاری کی تہ میں قبائلی عصبیت کا جو جذبہ کار فرما تھا وہ اتنا غیر شعوری تھا کہ اسے یہ خود نہ محسوس کر سکے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کی یہ سرگرمیاں فقط دین اسلام اور یقین و اذعان کی خاطر ہیں۔ ان کا محرک اخلاص دینی کے سوا کچھ نہیں ہے یا پھر رضائے الہی جس کے لئے یہ سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔

۶۷۔ خوارج کی اکثریت عربوں پر مشتمل تھی۔ موالی (عجمی) ان میں بہت کم تھے۔ حالانکہ استحقاق خلافت کے بارے میں ان کی جو رائے تھی

خوارج اور موالی

اس کے تحت موالی کو بھی پوری مساوات کے ساتھ یہ حق پہنچتا تھا کہ خلافت کے منصب پر فائز ہو جائیں۔ بشرطیکہ شرط خلافت ان میں پلٹے جاتے ہوں۔ کیونکہ خوارج کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خلافت کسی عرب خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ (مثلاً قریش وغیرہ) نہ کسی خاص قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہے بلکہ کسی کے ساتھ بھی مختص نہیں نہ کسی خاص فریق کے لئے اسے خاص کر دیا گیا ہے موالی کے خارجی مذہب سے نفرت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ خوارج ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے متنبیرت تھے۔

ابن ابی الحدید روایت کرتے ہیں کہ موالی میں سے کسی ایک شخص نے کسی فارسی عورت سے نکاح کر لیا اس پر خوارج نے ساختہ کہا اٹھے "اری تو نے ہمیں رسوا کر دیا"۔ اگر خوارج اس تعصب سے کام نہ لیتے تو بہت سے موالی ان کا مذہب اختیار کر لیتے۔

۶۸۔ اگرچہ خوارج میں موالی کی تعداد بہت کم تھی لیکن فارسی فرقوں میں اس کا اثر موجود تھا۔ چنانچہ زیدیت کا عقیدہ تھا کہ

اللہ تعالیٰ ایک رسول اہل عجم میں بھیجے گا جس پر کتاب نازل کرے گا جو شریعت محمدیہ کو منسوخ کر دے گی۔ بلاشبہ اس رائے پر فارسیوں کا اثر نمایاں ہے۔ کیونکہ اہل فارس ہی اپنی قوم میں کسی نبی کے ظہور پر تیسرے ہونے کے متمنی تھے۔

قرنہ میمونہ کے نزدیک اولاد سے نکاح جائز تھا اور بھائی بہنوں کی اولاد سے بھی شادی کر لینا مباح تھا۔ یہ سراسر کفری عقائد ہیں اور فارسی افکار کا اثر قبول کرنے کی غمازی کرتے ہیں کیونکہ محوس فارس ہی اس قسم کی شادیوں کو جائز تصور کرتے تھے۔

۶۹۔ ہمارے اوپر کے بیان سے خوارج کی عقلیت نفسانی کیفیت اور قبائل کا پتہ چل گیا جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے

خوارج کے عقائد و افکار

کہ ان کے افکار و نظریات بے حد سادہ اور سطحی تھے۔ یہ قریش اور تمام مضر قبائل سے نفرت کرتے تھے۔ اب ہم ان کے چند مخصوص معتقدات و افکار پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ خلیفہ کا تقرر آزادانہ اور منصفانہ انتخاب سے ہونا چاہئے جس میں تمام مسلمان حصہ لیں اور کسی ایک گروہ پر اکتفا نہ کیا جائے۔

تالیفہ اس وقت تک اپنے منصب پر قائم رہے گا جب تک وہ عدل پر قائم رہے۔ شریعت کے احکام نافذ کرے۔ خطا اور کج روی سے کنارہ کش رہے۔ اگر ان چیزوں کو چھوڑ دے تو اس کا معزول کر دینا بلکہ قتل کر دینا جائز ہے۔

۲۔ خلافت کسی عرب خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ قریش کی بھی اس میں کوئی تخصیص

۱۔ یہ لوگ زید بن ابی اینسہ فارسی کے پیرو تھے یہ خیالات ان کے اس وجہ سے ہو گئے تھے کہ جب وطن چھوڑ کر سیستان چلے آئے تو ایرانیوں کے خیالات سے متاثر ہو گئے۔

۲۔ یہ لوگ میمون عجمی کے پیروکار تھے۔ ۳۔ بحوالہ کتاب الفرق بین الفرق للبغدادی ص ۵۷

نہیں جیسا کہ دوسرے (اہل سنت) کہتے ہیں۔

یہ بھی غلط ہے کہ عجمی خلیفہ نہیں ہو سکتا صرف عرب ہی اس منصب پر فائز ہو سکتا ہے تمام مسلمان خلیفہ ہونے کا یکساں حق رکھتے ہیں۔ بلکہ افضل یہ ہے کہ خلیفہ کسی غیر قریشی کو بنایا جائے تاکہ اگر وہ راہ حق سے منحرف ہو یا خلاف شرع حرکات کا ارتکاب کرے تو اسے معزول کرنا یا قتل کر دینا آسان ہو۔ کیونکہ غیر قریشی خلیفہ کو معزول یا قتل کر دینے کے باعث قبائلی عصبیت اڑے نہیں آئے گی۔ نہ خاندانی جذبہ روک بن سکے گا۔

۳۔ اسی نقطہ نظر کے ماتحت خارجیوں نے اپنا امیر عبداللہ بن وہب الراسی کو بنایا اور اسے امیر المؤمنین کہنے لگے۔ یہ شخص قریشی نہیں تھا یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خارجیوں کا نجدات نام کا فرقہ اس کا قاتل تھا کہ کسی امام یا خلیفہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ آپس میں اپنے معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ نپٹایا کریں۔ تاہم اگر ایسا نہ ہو سکے اور امام کے بغیر کام نہ چلے تو امام کو منتخب کر لینے میں بھی مہذابہ نہیں ہے۔ گویا ان کے نزدیک اقامت امام واجب نہیں مصلحت و ضرورت پر منحصر ہے۔

۴۔ خوارج ہر گناہ گار کو کافر سمجھتے تھے خواہ یہ گناہ ارادہ گناہ اور بُری نیت سے ہو یا غلط فہمی اور خطا اجتہادی سے۔ یہی وجہ تھی کہ حکیم کے معاملہ میں وہ حضرت علی کو (معاذ اللہ) کافر کہتے تھے حالانکہ حضرت علی حکیم کے لئے اپنے طور پر تیار نہیں ہوئے تھے لیکن اگر وہ از خود ہی تیار ہو گئے تھے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حکیم درست امر نہ تھا تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت علی کی یہ خطا اجتہادی تھی۔ مگر خارجیوں کا حضرت علی کی تکفیر پر اصرار اس امر کا ثبوت تھا کہ وہ خطا اجتہادی کو دین سے خارج ہونے کا سبب اور فساد عقیدہ کی علامت سمجھتے تھے۔ یہی ویرہ ان کا حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ وغیرہ اکابر صحابہ کے بارے میں تھا جن سے خارجیوں کو جزئیات ہی میں اختلاف تھا لیکن ان کی مروجہ خطا اجتہادی بھی ان کے نزدیک موجب کفر تھی۔

۵۔ انہی افکار و عقائد کی بناء پر خوارج جمہور اہل اسلام خوارج کے دلائل و براہین کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے اور انہیں مشرک قرار دیتے تھے۔ انہوں نے مسلم حکام کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی۔

اور ان ابن ابی الحدید نے مسئلہ تکفیر اہل ذنوب میں خوارج کے متمسکات ذکر کر کے ان کا رد کیا ہے۔ لیکن

ہمیں ان ساری تفصیلات میں جہانے کی ضرورت نہیں صرف خوارج کے دلائل ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ ان کے رجحانات و میلانات کا پتہ چل سکے اور معلوم ہو سکے کہ ان کا انداز فکر کیا تھا جس سے ظاہر ہو جائے کہ ان کے فکر و نظر میں کس قدر سطحیت پائی جاتی تھی۔ خوارج کثرت سے دلائل پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ آیت کریمہ۔

(۱) **قَالَ اللَّهُ غَنَىٰ عَنِ الْعَالَمِينَ (۳: ۹۴)**
أَسْطَاطَعُ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ
عَلَى النَّاسِ حَيْجُ الْبَيْتِ مَعِينِ

اللہ تعالیٰ نے حج کو فرض قرار دیا ہے بشرطیکہ استطاعت ہو اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ تعالیٰ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔

اس آیت سے خوارج نے تارک حج کو کافر قرار دیا کیونکہ ترک حج گناہ کبیرہ ہے اور گناہ کبیرہ کا ہر مرتکب ان کے نزدیک کافر ہے۔

(۲) ارشاد ہوا:-

وَمَنْ كَفَرَ بِي مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵: ۲۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

اس آیت سے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ جو نہ کہ ہر وہ شخص جو کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ خدا کے فرمان کے بغیر فیصلہ کرتا ہے اس لئے وہ کافر ہے۔

(۳) اسی طرح قرآن مجید میں ہے:-

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ
فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ
أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ آيْمَانِكُمْ فَذُوقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۳: ۱۰۶)

قیامت کے روز کچھ لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے کچھ کے سیاہ جن کے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائیگا کیا تم ہی لوگ ہو جنہوں نے ایمان لائے تھے بعد کفر اختیار کیا۔ اب وہ عذاب چکھو جن کا تم انکار کیا کرتے تھے۔

اس آیت سے خوارج نے یہ نتیجہ نکالا کہ فاسق کا چہرہ تو سفید نہیں ہو سکتا لہذا سیاہ ہوگا اس لئے وہ بے ایمان تھے تکفرون کے مطابق کافر ہوا۔

(۴) اسی طرح یہ آیت :-

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مَسْفُورَةٌ
مُسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا

کچھ چہرے روز قیامت خداں وہ خوشحال ہوں گے اور کچھ غبار سے اٹے ہوئے جن پر سیاہی

عَبْرَةٌ تَرَاهُمْ أَقْرَبَ أَوْلِيَّتِكَ
هُدًى الْكَفَرَةِ الْفَجْرَةَ (۸۰ : ۳۸)

اس سے خوارج یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ چونکہ فاسقوں کے چہرے غبار آلود ہوں گے
لہذا ان کا کفار میں سے ہونا ضروری ہے۔

(۵) نیز ارشاد فرمایا:-

وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ
يَجْحَدُونَ (۳۱ : ۶)

ظالم خدا کی آیتوں سے انکار
کرتے ہیں۔

اس سے ثابت کرتے تھے کہ ظالم جاہل ہوتا ہے اور حجود ایک کافر کا وسف ہے۔
خوارج کے یہ تمسکات نصوص کے سطحی معنوں پر مبنی ہیں۔ اکثر نصوص جس میں مشرکین مکہ کے اوصاف
بیان کئے گئے ہیں۔ آیت حج میں حج نہ کرنے والے کو کافر نہیں قرار دیا گیا بلکہ حج کا انکار کرنے والے کو۔

ردِ خوارج میں حضرت علی کی تقریر | ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے
۱۷۔ ہم عصر خوارج کے مزعومات کے دندان شکن اور

مدلل جواب دئے۔ ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ میں خطا وار ہوں اور گمراہ ہوں تو میری گمراہی اور غلطی
کی سزا امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں دیتے ہو۔ میری خطا پر انہیں کیوں پکڑتے
ہو۔ میرے گناہ پر انہیں کیوں کافر قرار دیتے ہو۔ تم نے اپنے کندھوں پر تلوا رہیں
لٹکار رکھی ہیں اور انہیں موقع بے موقع بے نیام کر لیتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ گناہ گار
کون ہے اور بے گناہ کون؟ دونوں کو تم نے ایک ساتھ مل کر کھا ہے۔“

تم ابھی طرح جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانی کو
سنگسار کیا۔ پھر اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی اس کے اہل خانہ کو اس کا وارث بھی
تسلیم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل کو جو رم قتل میں قتل کیا۔ لیکن اس کے اہل کو اس کی
میراث سے محروم نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کے ہاتھ کاٹے اور
غیر شادی شدہ زانی کو ڈرے بارے لہکن دونوں کو مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی دیا
آپ نے گناہ گاروں کے مابین اللہ تعالیٰ کا حکم قائم کیا۔ لیکن اسلام نے مسلمانوں کو جو
حصہ دیا تھا اس سے ان گناہ گاروں کو محروم نہیں کیا۔ نہ ان کا نام دائرہ اسلام سے خارج کیا۔“

حضرت علی کی اس مدلل اور عمدہ تقریر کا خوارج کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت علی نے اس موقع پر کتاب الہی سے دلیل لانے کے بجائے عمل رسول سے دلیل پیش کی۔ کیوں کہ عمل کی تاویل نہیں ہو سکتی۔ اس کو درست طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے اور جس میں خوارج کے سطحی نظریات اور فکر عام کے لئے کوئی گنجائش نہ نکل سکتی تھی۔ سطحی شکر تصویر کا ایک ہی رخ دکھتا ہے۔ اس کی نظر ایک جزئیہ پر ہوتی ہے اور فہم عبادات و اسالیب میں جزئی میلان سے گرا ہی تو حاصل ہو سکتی ہے۔ مقصد تک پہنچنا مشکل ہے۔ امور کلیہ پر نظر رکھنے سے حق کا ادراک کیا جاسکتا ہے اور درست فیصلہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ نظر بریں حضرت علی نے آنحضرت کا عمل پیش کیا تاکہ ان پر تاویل کے دروازے بند کر دئے جائیں۔ پھر اس کے کہ ان کی تلبیساتِ فاسدہ کے لئے حیرت و اضطراب کا کوئی رختہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔

۶۔ یہ تو تھے خوارج کے متفقہ عقائد اس کے علاوہ جو ان کے دوسرے افکار و نظریات تھے ان پر وہ خود جمع نہ ہو سکے بلکہ ان میں بہت اختلاف پایا جاتا تھا وہ چھوٹے چھوٹے امور میں آپس میں جھگڑتے رہتے تھے اور یہی تشنیت و افتراق ان کی ہزیمتوں کا سبب ہوا۔ عہد اموی میں ہتلب بن ابی صخر نے جو خوارج کے مشر سے بچنے کے سلسلہ میں عامرہ اسلمین کے لئے ایک ڈھال کا کام دے رہے تھے۔ خارجیوں کے اختلافات کو ان کی جمعیت توڑنے ان کی قوت کے پارہ پارہ اور ان کی تیزی کے کم کرنے کا ذریعہ بنایا بلکہ ان میں اختلاف نہ بھی ہوتا تو ان میں سے ایسے اشخاص بھیج دیتا جو ان کے اندر اختلاف روتا کر دیتے۔ ابن ابی الحدید نے ایک تقریر نقل کیا ہے:

”خارجیوں کے فرقہ آزارقہ کا ایک لوہا زہر آلود تیر تیار کیا کرتا تھا۔ خوارج انہی

تیروں کی بارش اصحاب ہتلب پر کیا کرتے تھے۔ یہ معاملہ حبیب ہتلب کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے کہا میں اس کا تدارک کرتا ہوں یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک آدمی کو ایک خط دیا اور ایک ہزار درہم دئے اور اسے قطری بن النجاء کے لشکر کی طرف جانے کی ہدایت کی اور کہا کہ یہ خط اور یہ درہم چپکے سے دشمن کے لشکر میں پھینک دو اور وہاں اپنے بچاؤ کا خیال رکھنا۔ وہ آدمی تمہیں ارشاد کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس خط کی عبارت یہ تھی۔

اما بعد آپ کے تیر مجھے مل گئے ہیں ایک ہزار درہم بھیج رہا ہوں یہ رقم قبول کیجئے اور

مزید تیر بنا کر مجھے بھیج دیجئے۔“

یہ خط قطری تک پہنچا دیا گیا۔ قطری نے لوہار کو بلایا اور اس سے پوچھا یہ خط کیا ہے؟ اس نے کہا ”مجھے نہیں معلوم!“
 قطری نے کہا ”یہ درہم کیسے ہیں؟“
 اس نے کہا ”مجھے کچھ خبر نہیں“؟ قطری نے حکم دیا اسے قتل کر دو۔ فوراً وہ قتل کر دیا گیا۔

یہ خبر سن کر توقیس بن ثعلبہ کا ایک مولیٰ عبدالرحمن آیا۔ اس نے قطری سے کہا ”آپ نے ایک شخص کو بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے قتل کر دیا یہ کیا کیا؟“ قطری نے جواب دیا ”مفاد عامہ کے لئے کسی شخص کا قتل کر دینا منجوب نہیں ہے اور امام کو یہ حق حاصل ہے کہ جو مناسب سمجھے کرے اور رعیت کے لئے اس پر اعتراض جائز نہیں۔“
 عبدالرحمن نے کہا کہ یہ بات بہت گراں گزری تاہم جماعت سے علیحدگی نہیں اختیار کی۔ یہ بات جب مہلب کو معلوم ہوئی تو اس نے خوارج کے پاس ایک نصرانی بھیجا اور اس سے کہا: ”جب تم قطری کے پاس پہنچو تو سجدے میں گر پڑو۔ وہ متع کرے تو کہنا میں آپ کو سجدہ کرتا ہوں۔“ نصرانی نے ایسا ہی کیا۔ قطری نے اسے سرسجود دیکھ کر کہا: ”سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے زیبا ہے۔“

نصرانی نے کہا: ”میں آپ کو سجدہ کرتا ہوں۔“ ایک خارجی نے قطری سے کہا: ”یہ خدا کو چھوڑ کر آپ کی پوجا کرتا ہے۔“ پھر اس نے قرآن کی یہ آیت تلاوت کی۔
 ”اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبٌ مَّجْمُوْمٌ
اَنْتُمْ
اَلْهٰٓؤَآءِ دُوْنَ (۲۱: ۹۸)

قطری نے کہا: ”عیسائی عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں لیکن اس سے عیسیٰ علیہ السلام کو کیا ضرر پہنچ سکتا ہے؟ یہ سن کر خارجی اٹھا اور اس نے اس نصرانی کو قتل کر دیا۔ یہ بات قطری کو ناگوار گزری اور قطری کی یہ ناگواری بہت سے خوارج کو ناپسند آئی۔ مہلب کو پتہ چلا تو اس نے دریافت احوال کے لئے ایک آدمی بھیجا وہ شخص خوارج کے یہاں حاضر ہو کر پوچھنے لگا۔

”اچھا یہ بتائیے کہ بالفرض دو شخص آپ کی طرف ہجرت کر کے آتے ایک راستہ میں فوت

اور دوسرا آپ کے یہاں پہنچ گیا۔ تم نے اسے آذایا مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟

بعض کہنے لگے فوت شدہ آدمی یقیناً جنتی ہے اور دوسرا کافر۔

دیگر خوارج بولے۔ ”وہ دونوں کافر ہیں تا وقتیکہ آزمائش میں کامیاب ہوں۔“

اس مسئلہ پر بڑا اختلاف رہا تھا۔ قطری حدود الصغر میں پہنچ گیا اور ایک ماہ وہاں

قیام پذیر رہا اس کی عدم موجودگی میں خوارج میں یہ جھگڑا چلتا رہا۔

شرح پنج البلاغہ ج ۱ ص ۱۲۰

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہلب ایسے سپہ سالارِ اعظم نے کس طرح حکمت عملی سے کام لے کر خوارج میں اختلاف کی آگ بھڑکائی اور ان کی سادہ لوحی اور کم عقلی سے پورا فائدہ اٹھایا اور کس آسانی سے ان کے ضعفِ ادراک کے باعث انہیں آپس میں برسرِ ہیکل کر دیا جس کے نتیجے میں ان کی قوت کمزور پڑ گئی اور وہ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی سکت سے محروم ہو گئے۔ اور پھر پوچھتے تو ان میں اندرونی طور پر اختلافات بہت زیادہ تھے جو کسی دو کے پیدا کردہ نہیں تھے یہی وجہ ہوئی کہ وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر کئی فرقوں میں بٹ گئے اب قاری کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہم پر واجب ہے کہ خوارج کے مناقشات و مناظر کا طرز و انداز کیا تھے اور ان کے مختلف مذاہب و مذاہب کیا تھے۔

خوارج کے اوصاف خصوصی

۱۔ خوارج گونا گوں اوصاف کے حامل تھے ان کا خصوصی طرز امتیاز یہ تھا کہ وہ بڑی شدت سے اپنے مسلک کی حمایت کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ مخالفین کے دلائل سنتے اور ان کے تیروں ہی سے ان کو شکار کر لیتے۔ اپنے آراء و افکار سے تعصب کی حد تک چپے رہتے اور کسی قیمت پر ان کو ترک کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مخصوص نظریات محدود و مقید ہو کر رہ گئے تھے اور ان میں عام قواعد کی طرح حق و باطل کی تمیز کا کوئی امکان نہ تھا نہ کوئی ایسا ضابطہ و معیار تھا جس پر رکھ کر انہیں جانچا پرکھا جاسکے۔

خوارج اپنے اقوال و مناقشات میں مندرجہ ذیل خصوصیات سے متصف تھے۔

(۱) فصاحت و بلاغتِ طلاقتِ لسانی اور خوش بیانی خوارج کا خصوصی وصف تھا جس سے

وہ اکثر موصوف ہوتے تھے وہ بے حد نڈر اور بے باک واقع ہوئے تھے کسی سے ڈرتے نہ تھے

اور نہ اپنے دلائل ذکر کرتے ہوئے جھکتے۔

روایات میں مذکور ہے کہ عبدالملک بن مروان کے پاس کسی خارجی کو لایا گیا۔ عبدالملک نے محسوس کیا کہ وہ بڑا صاحب فہم و فراست اور ہوشیار ہے۔ چاہا کہ وہ خارجی مذہب کو ترک دے۔ اس پر خارجی نے مزید علم و تحقیق کا ثبوت دیا۔ یہ دانشمندی دیکھ کر عبدالملک میں اس ایچہ نے مزید کموٹ لی کہ وہ خارجی نظریات کو خیر باد کہدے۔ یہ سن کر خارجی بولا:

”آپ کی پہلی باتیں ہی کافی تھیں اور اس ضمن میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ تاہم آپ نے کہا اور میں نے سنا۔ اب میری باتیں بھی گوش گزار کیجئے۔“

عبدالملک بولا۔ ”فرمائیے۔“

خارجی نے بڑے مؤثر اور بلیغانہ انداز میں اپنے افکار و نظریات بیان کئے۔ عبدالملک کا بیان ہے کہ اس نے اپنے زور بیان سے میرے اندر یہ تاثر پیدا کر دیا تھا کہ جنت خارجیوں کے لئے ہی پیدا کی گئی ہے اور یہ کہ خوارج کی حمایت میں لڑنا ہی اسلامی جہاد ہے۔ مگر خدا داد حجت و رقی و صداقت کی محبت نے پھر مجھ میں انگڑائی لی اور میں نے خارجی کو مخاطب کر کے کہا:

”دنیا و آخرت کا مالک حقیقی خداوند تعالیٰ ہے۔ اسی نے یہ حکومت و سلطنت مجھے عطا کر رکھی ہے۔“

ابھی عبدالملک خارجی سے محو گفتگو تھا کہ اس کا بیٹا روتا ہوا آیا۔ عبدالملک پر یہ بڑا ناگوار گذرا۔ خارجی عبدالملک کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا ”اسے رونے دیجئے۔ رونے سے اسکی باچھیں کھل جائیں گی۔ اس کا دماغ درست ہو جائے گا اور آواز بلند ہو جائے گی۔ اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ خدا کی عبادت کرتے ہوئے جب رونے کی ضرورت لاحق ہوگی تو اس وقت اس کی آنکھیں رونے سے انکار نہیں کریں گی اور رونے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔“

عبدالملک یہ سن کر بولا۔

”کیا تمہارے لئے وہ مصیبت کافی نہیں جس سے تم دو چار ہو اور بلا وجہ دوسروں کے معاملہ میں دخل اندازی کرتے ہو۔“

خارجی کہنے لگا:

”دنیا کی کوئی طاقت مومن کو سچی بات کہنے سے روک نہیں سکتی۔“

عبدالملک نے اسے قید خانہ بھیجنے کا حکم صادر کیا اور معذرت کے طور پر کہا۔

”اگر مجھے یہ ڈرنے ہوتا کہ تم اپنی چرب زبانی سے میری رعایا میں فساد پیدا کر دو گے تو میں،“

تمہیں قید نہ کرتا جس شخص نے مجھے شکوک و شبہات کے ورطہ میں ڈال دیا یہاں تک کہ حفاظتِ خداوندی نے میرا دہن کھاما اس سے کچھ بچید نہیں کہ وہ دوسروں کو بھی گمراہ کر دے۔
(الکامل للمبروج ۲ ص ۱۰۱)

۲۔ فصاحت و بلاغت کے علاوہ نوارج علوم کتاب و سنت فقہ الحدیث اور آثار العرب کو بڑی ذہانت و فطانت اور بیدار مغزی کے ساتھ حاصل کرتے تھے۔ روایات میں مذکور ہے کہ نوارج کے فرقہ ازارقہ کا امیر نافع بن الازرق علمی استفادہ کے لئے حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نافع نے ابن عباس سے ”وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَوْا“ کا مفہوم دریافت کیا۔ ابن عباس نے فرمایا ”وَسَقَّ“ جمع (جمع کیا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ نافع نے پوچھا ”عربی زبان میں یہ لفظ اس معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔“

حضرت ابن عباس نے فرمایا کیا آپ نے یہ شعر نہیں سنا ہے
إِنَّا لَنَاقِلًا لِّصَا حَقَالِقَا - مُسْتَوِيسَاتٍ لِّوَيْجِدَانَ سَالِقَا
ایک دفعہ نافع نے ابن عباس سے دریافت کیا۔

”حضرت سلیمان علیہ السلام تمام دینی و دنیوی انعامات سے پہرہ ور تھے پھر انہیں ہد ہد ایسے کمزور جا توڑ کی مدد کیونکر درکار ہوئی؟“

حضرت ابن عباس نے فرمایا:

”حضرت سلیمان کو پانی کی ضرورت تھی۔ ہد ہد کو معلوم ہوتا ہے کہ پانی کہاں کہاں ہے اس جا توڑ کو خدا نے یہ عظیم خصوصیت عطا کی ہے کہ زمین اس کے لئے شیشہ کی مانند ہے اور وہ اس کے ظاہر و باطن کو دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے حضرت سلیمان نے ہد ہد کو تلاش کرنا چاہا۔“

نافع نے (معتزضانہ انداز میں) کہا:

”علامہ دوریاں ذرا ٹھہریئے! یہ بتائیے کہ ہد ہد کو زمین کے نیچے چھپی ہوئی اشیاء کیوں کر نظر آتی ہیں جب کہ جال صرف ایک انگلی بھر مٹی کے نیچے چھپا ہوتا ہے اور اسے نظر نہیں آتا۔“
ابن عباس نے فرمایا:

”آپ یہ نہیں جانتے کہ تقدیر آتی ہے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔“

۱۔ یہ واقعات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ خوارج علماء عصر سے استفادہ کرتے تھے مگر تعصب اور تنگ نظری کے باعث زیادہ مستفید نہ ہو سکتے تھے۔

۳۔ جدل و مناظرہ شعر و شاعری اور ادبیانہ اقوال و آثار خوارج کا محبوب مشغلہ تھا۔ میدانِ لب و قتال میں بھی یہ شعر و ادب کے تذکروں میں مشغول رہتے تھے۔

ابن ابی الحدید نے الاغانی سے نقل کیا ہے کہ جب جہلب بن ابی صفرہ اور قطری بن فجاہ کے مابین جنگ ہو رہی تھی تو خوارج لڑائی بند کر کے بڑے امن و سکون سے باہم دینی مسائل پر تبادلہٴ افکار کرتے تھے۔

دورانِ جنگ ایک خارجی عبیدہ بن ہلال شکاری ایک غیر خارجی مسلمان ابو حراہہ ثنمی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے میں آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں کیا آپ سچ بتائیں گے؟ ابو حراہہ نے اثبات میں جواب دیا اور کہا بشرطیکہ آپ بھی صدق بیانی سے کام لیں۔ خارجی نے کہا بہت اچھا! ابو حراہہ کہنے لگا ”جو پوچھنا چاہیں پوچھیں“

خارجی نے کہا اپنے ائمہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ابو حراہہ کہنے لگا۔ ”وہ بلا وجہ خون ریزی کرتے ہیں“

خارجی بولا۔ ”مالی معاملات میں ان کی کیا حالت ہے؟“

ابو حراہہ نے جواباً کہا: ”وہ ناجائز ذرائع سے مال حاصل کرتے اور ناجائز طور پر خرچ کرتے ہیں۔“

خارجی نے پوچھا۔ ”یتیموں کے بارے میں ان کا رویہ کیا ہے؟“

ابو حراہہ نے کہا: ”وہ یتیموں پر ظلم کرتے اور ان کا حق چھینتے ہیں۔“

خارجی نے کہا: ابو حراہہ! آپ ایسے لوگوں کی پیروی کرتے ہیں؟“

(شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید)

۱۔ یہ واقعات اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ خوارج میں جدل و بحث کا جذبہ اس حد تک کارفرما تھا کہ وہ علمی بحث میں حصہ لینے کے لئے لڑائی کو وقتی طور پر بند کر دیتے تھے اور باہم تبادلہٴ افکار میں مشغول ہو جاتے۔

۲۔ یہ حقیقت ہے کہ خوارج کے مناظرات و مناقشات پر تعصب کا رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ کبھی نہ خصم کی دلیل کو تسلیم کرتے نہ اس کے نظریہ کی صحت کا اعتراف کرتے وہ حق سے کس قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ مخالف تہمت زیادہ قوی دلیل پیش کرتا اسی قدر یہ اپنے عقیدہ پر زیادہ راسخ ہو جاتے اور اپنی

✕ تائید میں دلیلیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے افکار ان کے نفوس پر چھائے رہتے تھے اور ان کے نظریات و معتقدات ان کے قلوب کی گہرائی تک جاگزیں ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی قوت فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور ان کے ادراکات و احساسات میں قبول حق کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہی بایں ہمہ خوارج میں شدت نزع و خصومت کا جذبہ کار فرما رہتا تھا جو ان کے بدوی الاصل اور ناشائستہ ہونے کا پتہ دیتا تھا۔

یہ اسباب تھے جن کی بناء پر خوارج کے افکار میں بڑی تنگ نظری پیدا ہو گئی تھی وہ ان کی جانب سے صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھا کرتے اور دوسروں کے نظریات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ندیب و مسلک کی اندھا دھند تائید کا جذبہ بعض اوقات خوارج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ایک خارجی جس نے اس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی علماء سے کہا کرتا تھا کہ احادیث نبویہ کی اچھی طرح چھان بین کریں کیونکہ خوارج کو جب کوئی دلیل نہ ملتی تو وہ خود ساختہ کلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

۵۔ ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ خوارج ظواہر قرآن سے تمسک کرتے تھے اور اس کے معنی و مفہوم کی گہرائی میں اترنے کی کوشش نہ کرتے۔ نصوص پر سطحی قسم کی نگاہ ڈالتے سے جو سرسری مفہوم ذہن میں بیٹھ جاتا بس اسی کے پورہ ہتے اور اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر سرکنا گوارا نہ کرتے۔ جب خوارج میں سے کوئی کسی تہمت کا شکار ہوتا تو ازانہ تہمت کے لئے ظواہر آیات سے کام چلاتا اور ان کے معنی و مطلب سے اسے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔

روایات میں مذکور ہے کہ عبیدہ بن ہلال لشکری جس کے ابو حنیفہ کے ساتھ مناظرہ کرنے کا واقعہ ابھی مذکور ہوا ایک لوہار کی بیوی سے متہم ہوا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ لوہار کے گھر میں بلا اذن

لے مصنف کا یہ بیان محل نظر و تامل ہے۔ خوارج نبی کریم پر دانستہ دروغ گوئی کرنے کو کتنا کبیرہ تصور کرتے تھے جو ان کے نزدیک کفر کا موجب تھا پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حدیثیں خود وضع کرتے۔ اصول حدیث کے علماء نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ خوارج نے احادیث وضع کرنے سے کلیتہً اجتناب کیا ہے۔ خوارج اس ضمن میں تمام گمراہ فرقوں سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں دروغ باقی کا ارتکاب نہیں کیا جب کہ دوسرے فرقے اپنی تائید کے لئے اس عظیم تجارت کا ارتکاب کرتے تھے۔

”غلام احمد حمیری حقی عنہ“

بیا جایا کرتا تھا۔ خوارج نے اپنے امیر قطری بن فجاجہ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ قطری نے کہا "تم
 بتاتے ہو عبیدہ کس قدر دین دار ہے۔ جہاد کے سلسلہ میں اس نے جو خدمات انجام دیں تم ان
 سے بھی آگاہ ہو۔"

خوارج نے کہا۔ "ہمیں اس کا ایک بڑے کام پر مصٹر رہنا گوارا نہیں۔"
 قطری نے کہا "چلے جاؤ۔"

پھر عبیدہ کو بلا کر حقیقت حال دریافت کی۔ عبیدہ نے کہا:
 "امیر المؤمنین! مجھ پر بہتان طرازی کی گئی ہے۔"

قطری کہنے لگا۔ "میں مخالفین کو بہارے رو برو بلاؤں گا نہ تو ایک مجرم کی طرح اپنے جرم
 کا اعتراف کیجئے اور نہ ایک پاکدامن کی طرح دراز دستی سے کام لیجئے۔"
 قطری نے خوارج کو بلا یا۔ انہوں نے واقعہ بیان کیا جو اب عبیدہ نے کھڑے ہو کر واقعہ
 افک کی آیات تلاوت کیں۔

X "رَاتِ الَّذِينَ جَاءُوا بِأَرْفَاقِكُمْ عَصَبَةً مِنْكُمْ"

یہاں تک کہ اس واقعہ سے متعلق تمام آیات پڑھ ڈالیں۔ خوارج سن کر رو پڑے۔ عبیدہ
 کو گلے سے لگا لیا اور کہا ہمیں معاف کیجئے۔ (الکامل للمبروج ۲ ص ۲۲۵-۲۲۶)

اس واقعہ سے عیاں ہے کہ عبیدہ نے یہ آیات تلاوت کر کے خوارج کو ٹال دیا

اور اس بات کی جہلت نہ دی کہ وہ سوچیں آیا یہ واقعہ درست ہے اور اس کی بناء پر عبیدہ سزا
 کا مستحق ہے یا بے گناہ ہے اور انہوں نے بہتان طرازی کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ آیات سن کر
 خوارج نے مطلقاً غور و فکر کی ضرورت محسوس نہ کی اور جس طرح بلا دلیل اسے گناہ سے
 لٹوت کرنے کی سعی لا حاصل کی تھی اب اسے بری قرار دیا۔ خوارج کا یہ طرز عمل اس امر کا
 آئینہ دار ہے کہ کسی دلیل پر غور کئے بغیر وہ آن کی آن میں ایک نقیض سے چھلانگ لگا کر
 دوسری نقیض تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ X

۱۵۔ خوارج کے فرقے

خوارج کے مختلف فرقوں میں نقطہ اختلاف | ۷۴۔ ہم نے جن اصول و مبادی

کا ذکر کیا ہے۔ مجموعی طور پر سب

خوارج میں پائے جاتے تھے مگر اس کے بعد کثرت اختلاف کے باعث ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ مختلف مذاہب و مسلک میں منقسم ہو گئے۔ ہر فرقہ اپنے نظریات کے گرد گھومنے لگا اور اس طرح ان سے مختلف متبائن قسم کے چند گروہ معرض ظہور میں آئے۔ مگر یاں ہمہ خوارج کے یہ فرقے باہم کبھی شاذ و نادر ہی تیرد آتا ہونے۔

خوارج کے فرقہ جات کے مابین نقطہ اختلاف بعض اوقات کوئی جوہری امر ہوتا اور بعض اوقات کوئی جزئی واقعہ یا حادثہ۔ خوارج کے فرقہ جات کی تفصیلات بیان کرنے سے یہ حقیقت منظر عام پر آئے گی کہ کن فرقوں میں جوہری فرق پایا جاتا تھا اور کن میں سطحی اور فرعی اختلاف تھا۔ اب ہم ان کے خاص خاص فرقوں کا حال بیان کرتے ہیں۔

۱۔ ازارقہ | ۷۵۔ یہ نافع بن اوزق حنفی (جو قبائل ربیعہ کے قبیلہ بنو حنیفہ کا فرد تھا) کے پیرو تھے یہ جوش میں سب فرقوں سے زیادہ سخت تھا اور تعداد میں بھی زیادہ تھا۔ قوت و شوکت میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔

ناصح کی سرکردگی میں ازارقہ نے امویوں اور ابن زبیر سے کامل انیس سال تک تہا پت پامردی اور استقلال کے ساتھ جنگ جاری رکھی۔ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے جب ناصح قتل ہو گیا تو عثمان قیادت نافع بن عبید اللہ کے ہاتھ میں آئی۔ اس کے بعد قطری بن فجاوہ نے اس فرقہ کی سرداری سنبھالی۔ قطری کے عہد میں یہ فرقہ روبرو فال ہوا۔ کیونکہ اب عوام خوارج کی خونریزی اور سنگدلی کے باعث ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے اور مسلمانوں میں ان کے خلاف جدیدہ انتقام و عناد پیدا ہو گیا۔ آپس میں بھی خوارج بے سر پیکار رہنے لگے۔ چنانچہ اب ہر معرکہ میں انہیں شکست فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ اور قطری کے بعد مسلسل شکستوں کے باعث اس فرقہ کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

ازارقہ کے افکار و معتقدات | ۷۶۔ ان کے عقائد بھی عموماً وہی تھے جن کا اوپر

ذکر آچکا ہے۔ مزید صاف فرمایا:۔

الف) یہ ایسے مخالفین کو صرف خارج از ایمان ہی قرار نہیں دیتے بلکہ ان کو مشرک اور دائی جہنمی تصور کرتے ہیں۔ ان کا قتل و قتال بھی ان کے نزدیک روا ہے۔

ب) غیر خوارج مسلمان کا ملک دار الحرب ہوتا ہے اور وہاں ہر وہ کام مباح ہے جو دار الحرب میں مباح ہوتا ہے۔ مخالفین کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا اور انہیں لونڈی غلام بنانا جائز ہے۔ جنگ سے جی چرانے والوں کو قتل کرنا واجب ہے۔

ج) مخالفین کے بچے بھی مشرک ہیں اور ابدی جہنمی ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ مخالفین کا کفر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان کے بچوں تک بھی پہنچ جائے گا۔ باوجودیکہ انہوں نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ خوارج کا یہ نقطہ نظر ایک عظیم فکری انحراف کی آئینہ داری کرتا ہے۔

د) زانی کے سنگسار کرنے کو وہ تسلیم نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ قرآن میں مذکور نہیں۔ قرآن میں زانی کے لئے صرف چابک مارنے کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ ان کی نگاہ میں رجم احادیث نبویہ سے ثابت نہیں۔

ه) پاکدامن مردوں پر تہمت لگانے والوں پر کوئی حد نہیں، البتہ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے والوں پر حد قذف (جھوٹی تہمت) واجب ہے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ قرآن میں صرف عورتوں کو بہتان لگانے والوں کے لئے حد قذف کی سزا مقرر کی گئی ہے مردوں کا اس میں ذکر نہیں۔

و) گناہ صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب انبیاء سے بھی ہو سکتا ہے۔ (المئل والمئل شہرتانی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کیا کرنا کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دیتے اور دوسری جانب انبیاء سے بھی ان کا صدور جائز سمجھتے تھے۔ گویا ان کے خیال میں انبیاء کفر کا ارتکاب کر کے توبہ کر لیا کرتے ہیں۔ یہ نظریہ انہوں نے اس آیت کے ظاہری الفاظ سے اخذ کیا تھا۔

”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے

۲۔ فرقہ نجدات | یہ لوگ نجدہ بن عوف کے پیرو تھے جو قبیلہ بنو حنیفہ کی طرف منسوب تھا۔ یہ متعدد مسائل میں ازادہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ مثلاً

یہ جنگ سے جی چرلنے والے خوارج کی تکفیر نہیں کرتے تھے۔ مسلمانوں کے بچوں کا قتل جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن ان سے الگ اس امر کے بھی قائل تھے کہ ذمی اور معابد کا قتل جائز ہے۔ ان کی رائے میں اقامت امام کی حیثیت ایک شرعی وجوب کی نہیں بلکہ مصلحت کے پیش نظر واجب ہے۔ اگر مسلمان اشاعت اسلام اور تو اسی بالحق کا فریضہ بدول امام ادا کر سکتے ہوں تو انہیں تقرر امام کی کوئی ضرورت نہیں۔

نجدات ایک نظر یہ میں باقی خوارج سے بالکل منفرد تھے اور وہ تقیہ کا اعتقاد تھا۔ تقیہ کے پیش نظر جہاں ضرورت ہوتی وہ تحفظ مال و جان کے لئے کہہ دیتے کہ وہ خارجی نہیں۔ مناسب وقت آنے پر اپنے خارجی ہونے کا اظہار کر دیتے۔

اس فرقہ کے لوگ یمامہ میں رہتے تھے۔ پہلے اس جماعت کا سردار ایک شخص ابو طالت الخاری تھا۔ پھر ۶۶ھ میں نجدہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ پھر اس فرقہ نے بڑا عروج حاصل کیا۔ چنانچہ بہت جلد لوگ بحرین عمان حضرموت یمن اور طائف پر قابض ہو گئے۔

پھر بعض باتوں میں قائد جماعت نجدہ سے اہل فرقہ کا اختلاف ہو گیا۔ نجدہ سے ایک شکایت یہ تھی کہ اس نے اپنے بیٹے کو ایک لشکر کا سردار بنا کر بھیجا۔ اس لشکر نے مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیا اور باندی بنا لیا۔ تیسرے تقسیم سے پہلے مال غنیمت کا استعمال شروع کر دیا۔ لیکن نجدہ نے انہیں معاف کر دیا۔ دوسری وجہ شکایت اہل فرقہ کو اپنے سردار نجدہ سے یہ تھی کہ اس نے اپنے ایسے اصحاب کو جن پر حد واجب تھی نوازا اور مناصب عطا کئے اور کہا "شاید خدا انہیں معاف کر دے اور اگر کوئی سزا بھی دی تو جہنم میں نہیں۔ کوئی معمولی سزا دے کر داخل جنت کرے گا" ایک سنگین شکایت یہ تھی کہ ایک مرتبہ اس نے دو لشکر بھیجے، ایک بری ہم دوسری بحری۔ لیکن اس نے دونوں کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو جو بری ہم میں شریک تھے بحری ہم کے لوگوں سے زیادہ انعام و اکرام دیا۔

ان امور میں بڑا اختلاف پیدا ہوا۔ کچھ لوگ نجدہ کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی امارت سے انکار کر دیا۔ نظر بریں یہ فرقہ تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

پہلا فرقہ = ایک فرقہ عطیہ بن اسود حقی کی سرکردگی میں سجستان چلا گیا۔ یہ خوارج کے اجمالی عقائد کے پابند تھے اور ان کے اصولوں میں سے جن کو پسند کرتے تھے ان پر ایمان لاتے تھے۔
دوسرا فرقہ = دوسرا اگر وہ ابو فدیک کی محبت میں نجدہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور

اسے قتل کر دیا۔ یہ گروہ تجذات کے تمام گروہوں میں سے قوی تر تھا اور نجدہ کے تمام مقبوضات و مملوکت پر مستط ہو گیا تھا۔ ان کی قوت و شوکت بدستور رہی۔ یہاں تک کہ عبد الملک بن مروان نے ایک لشکر اس جماعت کی سرکوبی کے لئے بھیجا جس نے اسے تہس تہس کر کے رکھ دیا۔ ابو قریبہ کا سر کاٹ کر عبد الملک بن مروان کی خدمت میں بھیجا اور اس طرح یہ طائفہ ہمیشہ کیلئے نابود ہو گیا۔

تیسرا فرقہ = تیسرا فرقہ بدستور نجدہ کا و گادار دہا اور اسے ان امور میں معذور تصور کرتا رہا۔ یہ قوت و اقتدار سے محروم تھے۔ آخر کار یہ فرقہ بھی مٹ گیا اور تاریخ اسلام نے ازارقہ کی طرح اس کا نام بھی اپنے اوراق سے خارج کر دیا۔

۳۔ فرقہ صفریہ | ۷۸۔ اس فرقہ کے لوگ زیاد بن الاصغر کے پیرو تھے۔ یہ اپنے افکار تھے۔ یہ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں ازارقہ سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کو مشرک نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ جن گناہوں کے بارے میں قرآن میں حد کا ذکر آگیا ہے وہ اسی نام سے موسوم ہو گا جو خدا نے ان کے لئے مقرر کیا ہے جیسا بارق اور زانی وغیرہ۔ جن گناہوں کی حد مقرر نہیں کی گئی ہے ان کا مرتکب بے شک کافر ہے۔ بعض صفریہ کا خیال یہ بھی تھا کہ مرتکب گناہ پر جب تک حاکم حد نہ جاری کر دے اس وقت تک اس کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ اس فرقہ کے لوگوں میں ابو بلال مرداس ثبانی ایک آدمی تھا۔ یزید بن معاویہ کے عہد میں بصرہ کے قریب اس نے خروج کیا۔ لیکن عوام کو نہیں چھیڑا کہیں موقع مل جاتا تو صرف مال سلطان پر قبضہ کر لینے پر اکتفا کرتا۔ جنگ نہیں کرتا تھا۔ عبید اللہ بن زیاد نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر بھیجا اور وہ قتل کر دیا گیا۔

صفریہ کا ایک اور شخص عمران بن حطان تھا۔ یہ شاعر بھی تھا اور زاہد بھی۔ اپنے گروہ سے بھاگ کر بلاد اسلامیہ کے چکر کاٹتا رہا۔ ابو بلال کے بعد صفریہ نے اس کو اپنا قائد اور امام بنا لیا۔ اس فرقہ کے امراء و رؤساء کا حال معلوم کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خون کو مباح سمجھتے تھے نہ مخالفین کے ملک کو دار الحرب قرار دیتے۔ نہ مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو قید کرتے تھے بلکہ صرف سلطانی لشکر سے جنگ کرتے تھے۔

۴۔ فرقہ عجار دہ | ۷۹۔ اس فرقہ کے لوگ عبد الکریم بن عجر کے پیرو تھے جو عطیہ بن اسود حنفی کے اتباع میں سے تھا۔ یہ لوگ اپنے مذہب کے اعتبار سے فرقہ

تجدات سے بہت قریب ہیں۔ ان کے افکار و آراء بھی ان سے ملتے جلتے تھے۔ مثلاً ان کے نزدیک جنگ سے جی چرانے والے خارجی اگر دیانت دار ہوں تو انہیں مناصب تفویض کئے جاسکتے تھے۔ ہجرت ان کے نزدیک فرض نہ تھی بلکہ صرف سبب فضیلت۔ مخالفت کا مال ان کے نزدیک اس وقت تک مالِ غنیمت قرار نہیں دیا جائے گا۔ جب تک وہ مخالف زندہ ہے اور قتل نہیں کر دیا جاتا۔

عجاردہ بہت جلد مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ اس میں اختلاف کچھ اس قسم کے مسائل تھے۔
(۱) قدر و جبر اور بندے کی قدرت (۲) مخالفین کی اولاد سے نوعیت سلوک۔

عجاردہ کا یہ جدل و نزاع باہمی مخالفت کا سبب قرار پاتا تھا اور بہت جلد یہ جزوی مخالفت اصولی و اساسی اختلاف کا رنگ اختیار کر لیتی تھی۔ اس سلسلہ میں چند دلچسپ مثالوں کا پیش کرنا مناسب ہوگا۔

اس فرقہ کا ایک آدمی بن کا نام شعیب تھا ایک دوسرے شخص کا جس کا نام میمون تھا مقروض تھا۔ ایک روز میمون نے شعیب سے تقاضا کیا۔
”قرضہ کی رقم اب واپس کر دو۔“
شعیب نے جواب دیا۔

”خدا نے چاہا تو بہت جلد واپس کر دوں گا۔“

میمون نے یہ جواب سن کر کہا۔

”خدا یہ چاہتا ہے کہ اسی وقت ادا کر دو۔“

شعیب نے یہ بات سن کر کہا۔

”اگر واقعی خدا چاہتا ہوتا تو کہو تو کر سکتا تھا کہ میں اس وقت ادا نہ کر دیتا۔“

میمون نے شعیب سے کہا۔

”اللہ نے قرض ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور خدا جس چیز کا حکم دیتا ہے اس کی یہ تو اہم ہوتی ہے کہ

ایسا کیا جائے اور جس بات کے بارے میں وہ نہیں چاہتا کہ وقوع پذیر ہو اس کا حکم بھی نہیں دیتا۔

اس بات پر عجاردہ میں دو فرقے بن گئے۔ ایک کا نام شعیبیہ قرار پایا۔ دوسرے کا میمونہ۔

ان دونوں نئے فرقوں کے سربراہوں نے اپنی اپنی باتیں امام جماعت عبدالکیم کو لکھیں۔ اس نے جواب دیا

”تم تو کہتے ہو وہی ہوتا ہے جو خدا نے چاہا جو خدا نہیں چاہتا اس کا وقوع بھی نہیں ہوتا۔ ہم

بڑی باتوں کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے۔“

اس جواب کو شعیب اور میمون دونوں نے اپنی اپنی تائید میں سمجھا۔

ایک اور واقعہ ہے کہ ثعلبہ نامی ایک عجمی کی لڑکی تھی۔ دوسرے عجمی نے اس سے شادی کی درخواست کی۔ ثعلبہ نے کسی کو بھیج کر لڑکی کی ماں سے پوچھا۔ کیا لڑکی بالغ ہو گئی۔ اگر بالغ ہو گئی ہو اور اسلام پر اس شرط کے ساتھ راضی ہو جو عجمیوں کے ہاں معتبر ہے تو پھر مہر کی پرواہ نہ کرے جتنا بھی ہو جائے۔

ماں نے جواب دیا لڑکی ہماری ولایت میں مسلمان ہے ہم جیسے چاہیں کر سکتے ہیں بلوغت عدم بلوغت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عبدالکریم کے سامنے یہ معاملہ پیش کیا گیا۔ اس نے برأت اطفال (بلوغت سے قبل بچوں کو کافر سمجھنا مگر ثعلبہ کا کہنا تھا کہ جب تک ان سے کفر یا انکار صادر نہ ہو ان کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا) کے نظریہ کو پسند کیا۔ ثعلبہ نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ عجمیوں نے اس میں ایک نیا فرقہ ثعلبہ نامی پیدا ہو گیا۔

۵۔ فرقہ اباضیہ | یہ لوگ عبداللہ بن ابی اسحاق کے پیرو تھے۔ یہ فرقہ خارجیوں میں معتدل تھا اور فکر و رائے میں عامۃً مسلمانوں سے زیادہ قریب۔ یہ لوگ غلو اور انتہاء پسندی سے بالکل الگ تھے۔ میانہ روی اور اعتدال و توسط ان کا شعار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کے بعض اطراف میں یہ اب تک موجود ہیں۔

فرقہ اباضیہ والوں نے نہایت عمدہ فقہ مرتب کی۔ ان میں ممتاز علماء دین پائے جاتے تھے۔ ان کے بعض طوائف مغربی صحراؤں میں بود و باش رکھتے تھے اور بعض بلاد نجد میں اقامت گزرتے تھے۔ ان کے کچھ فقہی آراء بھی تھے جو موجودہ مصری قانون میں مواریث سے متعلق ان کے بعض افکار کو اختیار کیا گیا ہے اور وہ ولایت عتق کی بناء پر حصول میراث کا مسئلہ ہے۔ مصری قانون میں ولایت عتق کو سب وارثوں سے پیچھے رکھا گیا ہے۔ یہاں تک کہ زوجین میں سے ایک کو باقی ماندہ میراث دینے سے بھی اس کا درجہ موخر رکھا گیا ہے۔ حالانکہ مذاہب اربعہ میں ولایت عتق کا مرتبہ عصبیہ نسبتیہ کے بعد اور اصحاب فروع اقارب کو بقایا میراث ادا کرنے سے مقدم ہے۔

اباضیہ مندرجہ ذیل نظریات رکھتے تھے۔

- ۱۔ غیر خارجی مسلمان نہ مشرک ہیں نہ مومن۔ البتہ انہیں کفر ان نعمت کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے کافر کہا جائیگا۔
- ۲۔ غیر خارجی مسلمانوں کا خون بہانا حرام ہے۔ ان کا ملک دار التوحید ہے البتہ بادشاہ کی چھاؤنی کفر گاہ ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتے ان کے دل میں یہ بات ہوتی ہے کہ مخالفین کی خونریزی

حرام ہے اور ان کا ملک دار التوحید ہے۔

۳۔ غیر خارجی مسلمان پر فتح حاصل کرنے کے بعد ان کے اسلحہ جنگ گھوڑوں اور جانوروں کو نیز ان تمام چیزوں کو جن سے جنگ میں کام لیا جاتا ہو مال غنیمت میں شمار کیا جائے گا۔ البتہ سونا چاندی وغیرہ ان کے مالکوں کو واپس کر دیئے جائیں گے۔

۴۔ غیر خارجی مسلمانوں کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے ان سے معاملات نکاح و وراثت کے تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں۔

اباضیہ کے ان افکار و آراء سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے خارجی فرقوں کے مقابلہ میں یہ لوگ اعتدال پسند تھے اور اپنے مخالفوں کے ساتھ نسبتاً رواداری اور انصاف کا سلوک کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔

خوارج کے فرقے جو مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتے | ۸۱۔ دراصل خارجی مذہب کی بنیاد تشدد اور غلو پر ہے۔ دین اور فہم دین کے معاملہ میں یہ

لوگ بہت زیادہ قالی اور متشدد تھے۔ اس چیز نے انہیں گمراہی کے راستے پر لا ڈالا تھا اور عامہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے لیکن صادق الایمان لوگوں نے کبھی ان پر کفر کا فتویٰ نہیں نکایا۔ دوسری بات ہے کہ انہیں گمراہ کہا ہو۔ روایت ہے کہ حضرت علی نے اپنے اصحاب کو یہ وصیت کی تھی کہ میرے بعد کسی خارجی سے مقاتلہ نہ کیا جائے کیونکہ جو سنی کی تلاش میں نکلا اور ٹھوکر کھائی وہ اس شخص کی طرح نہیں جو باطل کی جستجو میں نکلا اور اسے پالیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علی امویوں کو باطل کا طلبکار اور ان کے مقابلہ میں خارجیوں کو حق کے جو یا خیال کرتے تھے۔ انہوں نے حق کی طلب میں ٹھوکر کھائی اور امویوں نے باطل کو پالیا۔ لیکن خوارج میں ایسے فرقے بھی تھے اور وہی زیادہ تھے جن کا مسلک وہ تھا جس کی تائید کسی درجہ میں بھی کتاب اللہ سے نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی تاویل کے بغیر نصوص قرآنیہ ان کی تردید کرتی ہیں۔ امام ابو منصور بغدادی نے اپنی کتاب الفرق بین الفرق میں خوارج کے ان دو فرقوں کا ذکر کیا ہے جن کو وہ خارج از اسلام قرار دیتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۴۔ فرقہ تیرید یہ | یہ تیرید بن ابی انیسہ خارجی کے اتباع تھے جو پہلے اباضی تھا۔ پھر دعویٰ کرنے لگا کہ خداوند تعالیٰ انجیوں میں سے ایک رسول بھیجیں گے اور اس پر کتاب نازل کریں گے۔ جو شریعت محمدیہ کو منسوخ قرار دے گی۔ اس سے قبل ہم

اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

۷۔ فرقہ میمونیتہ | یہ لوگ میمون عمردی کے پیرو تھے جس کا ذکر ابھی ابھی اوپر آچکا ہے۔ اس فرقہ نے نباتِ اولاد اور بھائی بہنوں کی اولاد کی بیٹیوں سے نکاح بائز قرار دیا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کیا کرتا تھا کہ قرآن نے ان لڑکیوں کو محرمات میں ذکر نہیں لیا ہے۔ اس فرقہ نے سودہ یوسف کے قرآن ہونے کا یہ کہتے ہوئے انکار کیا کہ ایسی سورت قرآن کی کس طرح ہو سکتی ہے جس میں داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔ لہذا اس کو قرآن نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ خدا ایسے بد اعتقادوں کو غارت کرے۔

(الفرق بین الفرق ص ۲۶۳ - ۲۶۵)

۱۶ اختلاف کے مسئلہ میں مسلک جمہور

مسئلہ خلافت میں اختلاف آراء | ۸۲ - یہ ان لوگوں کے افکار و آراء کا تذکرہ تھا جو راہِ راست سے منحرف ہو گئے اور اپنے نظریات

سے مبالغہ کی حد تک متسک کرنے کی بناء پر ایک طرف کو نکل گئے۔ اصحابِ علی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خلافت وراثتِ نبویہ ہے اور نبی کریم کی وصیت کی بناء پر خلافت کا انعقاد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگ خلافت کو ان تمام قیود سے آزاد تصور کرتے تھے۔

جمہور تو وسط و اعتدال کی راہ پر گامزن تھے اور بحیثیتِ مجموعی اس بات میں متحد و انجبار تھے کہ خلیفہ قریش میں سے ہونا چاہئے۔ جمہور اس حدیث نبوی سے استناد کرتے تھے۔
"الامۃ فی قریش" (خلفاء قریش میں سے ہونگے)

جمہور اس حدیث کو بابِ خلافت میں اصل الاصول قرار دیتے تھے و مسلمانوں کے تعامل میں بھی اس حدیث کی توثیق و تائید ہوئی۔

ہم ان انتہا پسندانہ نظریات میں صرف اسی تو وسط و اعتدال پر اکتفا نہیں کریں گے جس کے ایک پہلو پر ایک فریق نے عمل کیا اور دوسرے فریق نے دوسری جانب کو اپنایا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ فقہاء اسلام سیاسیات کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے کیونکہ فقہاء اسلام کا نقطہ نظر ہی وہ مسلکِ اعتدال ہے جو اخبارِ صحابہ سے میل کھاتا ہے اور امت میں تشتت و تفرق پیدا ہونے سے پہلے۔ سب مسلمان اسی پر عمل پیرا تھے۔

مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کا اجماعی طرز عمل | ۸۳ - جمہور علماء اس مسئلہ میں یکے بان

ہے جو خطبہ جمعہ دے۔ نمازیں پڑھائے۔ حدودِ اسلامی کو نافذ کرے۔ تو تگروں سے زکوٰۃ جمع کر کے فقراء میں تقسیم کرے۔ ملکی سرحدوں کی حفاظت کرے اور قاضیوں کی مدد سے لوگوں کے خصومات فیصل کرے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر نہ ہونے دے۔ شرعی احکام کو نافذ کرے۔ تفرق و انتشار کو ضبط و وحدت میں بدل دے اور اعلیٰ قسم کی حضارت و تہذیب کو قائم کرے جس کے قیام پر اسلام نے بڑا زور دیا ہے۔

یہ مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے۔ تاریخ اسلام کے آغاز میں اسی کے پیش نظر دین اسلام
 معاملہ ٹھیک رہا اور اس میں کوئی انحراف پیدا نہ ہو سکا۔ امامت کو خلافت نبویہ سے ہمکنار کرنے
 میں جمہور علماء کے نزدیک امام میں اوصاف چہارگانہ کا وجود ضروری ہے۔ اس طرح امامت
 خلافت حکومت و سلطنت میں تبدیل نہ ہو سکے گی۔

وہ چار اوصاف یہ ہیں :- (۱) قرشیت (۲) بیعت (۳) شوری (۴) عدالت
 اب نیکے بعد دیگرے ہم ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں۔

۴۸ - اس وصف کا مطلب یہ ہے کہ امام قریشی ہو۔ اس شرط کی وجہ
قرشیت وہ احادیث و آثار میں جو قریش کی فضیلت میں وارد ہیں اور جن سے مستفاد
 ہوتا ہے کہ امارت و خلافت انہی میں ہوگی۔

مثلاً یہ احادیث نبویہ :-

- (۱) آپ نے فرمایا جب تک دو آدمی بھی باقی ہیں خلافت قریش میں رہے گی۔
- (۲) بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ خلافت و امارت میں
 قریش کے تابع ہیں مسلمان اہل اسلام قریش کے تابع ہیں اور کفار کافر اہل قریش کی پیروی کرتے ہیں۔
- (۳) آپ نے فرمایا ”لوگ خیر و شر (کفر و اسلام) میں قریش کے زیر اثر ہیں۔“
- (۴) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت معاویہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا خلافت
 اس وقت تک قریش میں رہے گی جب تک وہ دینی احکام کے پابند رہیں گے۔ جو شخص
 ان کی مخالفت کرے گا۔ اسے اللہ تعالیٰ اس کے بل گرا دیں گے۔ (مغلوب کر دیں گے)
 (منہاج السنہ امام ابن تیمیہ ج ۵ ص ۳)

متذکرۃ الصدرا حدیث سے قریش کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ قریش کی فضیلت

کے اظہار کے لئے یہی کیا کم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریشی تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے
 کہ آیا ان احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ ان میں سے ہوگا اور دوسروں میں سے نہیں؟
 اور کیا قرشیت صحت خلافت کے ضروری شرائط میں سے ہے؟

بے شک صحابہ کا تعالٰی اسی پر تھا کہ خلیفہ قریش میں سے ہوگا۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجتماع
 میں اولین اہل ایمان نے مہاجرین قریش میں سے خلیفہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس سے قبل حضرت ابو بکرؓ
 اپنا خطبہ دے چکے تھے۔ قبیلہ قریش میں سے انتخاب خلیفہ کی دعوت اس لئے ہے کہ ارباب نسبت و کشاد
 شرط یہ ہے کہ ارباب نسبت و کشاد

نص پر مبنی نہ تھی بلکہ اس کی اساس دو امور پر رکھی گئی تھی۔

اول = ہاجرین انصار سے افضل ہیں۔ قرآن میں ان کا ذکر انصار سے پہلے کیا گیا ہے۔ اور ان شہداء و آلہم پر صبر کرنے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں جن سے وہ آقاؐ اسلام میں دوچار ہوئے۔
دوم = دوسری وجہ یہ ہے کہ بلاد عربیہ میں ظہور اسلام سے قبل اور بعد قریش کا سکہ جاری تھا اور لوگ ان سے لڑاں و ترساں رہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے خطبہ کے اخیر میں فرمایا تھا:

”عرب خاندان قریش کے سوا کسی اور کے آگے نہیں جھک سکتے۔“

ان تصریحات سے قریش کی افضلیت کا راز منکشف ہوتا ہے۔

قریش کی فضیلت میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں بلاشبہ ان سے یہی مفہوم مترشح ہوتا ہے۔ البتہ حضرت معاویہ کی حدیث کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس حدیث میں آنحضرتؐ نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ خلفاء قریش میں سے ہوا کریں گے اور دوسرا جو شخص خلافت کا دعویٰ کرے گا وہ مغلوب ہو جائے گا۔

اس حدیث سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ آیا آپ اس بات کا حکم دے رہے ہیں یا آئندہ کے متعلق پیش گوئی فرما رہے ہیں کہ خلفاء قریش میں سے ہوا کریں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ امامت و صلاحت جس کا ظہور حضرت ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی خلافت کی صورت میں ہوا قریش ہی کے خاندان میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ہدایت کے علمبردار یہ ائمہ سب قریش میں سے ہوئے۔ مزید برآں حدیث میں یہ شرط بھی عائد کی گئی ہے کہ خلفاء اقامت دیں جس میں حصہ لیں۔ اگر یہ بشرط ان میں مفقود ہو تو امامت ان سے چھین کر اس شخص کو دے دی جائے گی جو اس کا حامل ہو۔

نظر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان اخبار و آثار سے قطعی و حتمی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امامت قریش میں مقصود و محدود ہے اور خلیفہ ہو گا تو اس کی خلافت خلافت نبوت نہیں ہوگی اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ امت کو مامور فرما رہے ہیں کہ خلافت صرف قریش تک محدود ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا فرمان طلب و جواب کے لئے ہے بلکہ آپ کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ قریش کی امامت افضل ہے نہ یہ کہ کسی اور کی امامت صحیح نہیں۔

اس کی وجہ بخاری و مسلم کی یہ روایت ہے کہ

قائم کرے جس کے قیام اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے میرے دوست (نبی کریم) نے وصیت

فرمایا کہ اگر تم پر ایک سنگ جھنڈی کو بھی امام بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرتے رہنا۔

(۲) امام بخاری روایت کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اگر تم پر ایک جھنڈی کو امام

بنا دیا جائے جس کا سر منقح ایسا ہو تو اس کی بات سنا اور اس سے اطاعت نہ کرنا۔

(۳) صحیح مسلم میں ائمہ اربعین سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم پر ایک سیاہ

قام ناک کان کٹے غلام کو امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کا فریضہ

انجام دیتا ہو تو اس کی بات سنا اور اس کی اطاعت کرنا۔

اگر مذکورہ الصدور روایات کو حدیث "ان هذا الامر في قریش" کے ساتھ یکجا

کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ نصوص بحیثیت مجموعی یہ تاثر پیدا نہیں کرتیں کہ امامت

قریش میں محدود ہے اور کسی اور کی خلافت صحیح نہیں۔ بخلاف انہیں احادیث کا بحیثیت مجموعی یہ مفہوم

ہوگا کہ غیر قریش کی امامت درست ہے۔ اور آپ نے حدیث "الامر في قریش" میں اخبار بالغیب

تے طور پر ایک ہونے والے واقعہ سے آگاہ فرمایا تھا۔ جیسے آپ نے ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا۔

"خلافت میرے بعد تین سال تک رہے گی۔ پھر بادشاہی میں تبدیل ہو جائیگی۔"

یا آپ کا مقصد یہ ہوگا کہ قریش کی خلافت دوسروں سے افضل ہے یہ مطلب نہیں کہ سرے سے

اسی اور کی خلافت درست ہی نہیں۔

جہاں تک حضرت ابو بکر صدیق کے اس قول کا تعلق ہے جس میں صحابہ بھی آپ کے ہموا تھے

اس ضمن میں ہم کہیں گے کہ حضرت ابو بکر نے قریش کی قوت و شوکت کو ان کی امارت و امامت کی

اساس قرار دیا تھا۔ جب رعب و داب اور شوکت کسی اور میں موجود ہو اور قریش اس سے محروم

ہوں تو حضرت صدیق کی بیان کردہ علت کے مطابق جس کی تائید صحابہ نے بھی کی تھی اندر ہی

صورت خلافت کے مستحق قریش نہ ہوں گے بلکہ وہ قوم ہوگی جو ان صفات سے بہرہ ور ہے۔ اس

لئے کہ جب امامت کا انحصار قوت و شوکت پر رکھا گیا ہے تو جہاں یہ اوصاف پائے جائیں گے

وہیں خلافت و امامت پائی جائے گی۔

یہ ہے امامت کے قریش میں محدود ہونے کی اصل وجہ! اور یہ ہے ان آثار صحیحہ اور اس

مناط و مدار کی حقیقت و ماہیت جس پر حضرت ابو بکر کے خلیفہ منتخب ہونے کے بارے میں

اجماع منعقد ہوا تھا۔

۲۔ بیعت ۸۵۔ جمہور کے نزدیک انتخاب خلیفہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ ارباب بیت و کشاد

۲۔ بیعت

اس کے دست ہی پر بیعت کر لیں۔ بیعت سے مراد یہ ہے کہ اربابِ حل و عقد قومی اور جمہور اہل انصلاہم رنج و راحت میں اس کی اطاعت شعاری کا عہد کر لیں بشرطیکہ وہ معصیتِ ایزدی کا مرتکب نہ ہو۔ خلیفہ بھی یہ عہد باندھے کہ وہ اسلامی حدود و فرائض کو قائم کرے گا۔ طریقِ بیعت پر گامزن رہے گا اور کتاب و سنت کی پیروی کو اپنا شعار بنائے گا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہی طریقہ و انداز تھا۔ انہوں نے یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا تھا۔ انہوں نے خود بھی ببول کے درخت کے نیچے آنحضرت کی بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”إِنَّ الدِّينَ يُبَایِعُوكَ وَتَبَایِعُوكَ اللَّهُ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ“

جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں، وہ گویا خدا کی بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ فرمایا تو اہل مدینہ سے بیعت لی۔ فتح مکہ کے موقع پر جب مکہ والوں نے آپ کی قبول کر لی تو آپ نے ان سے بیعت لی قرآن کریم میں عورتوں کی بیعت لینے کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَایِعَنَّكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ“

اے نبی جب مومن عورتیں آپ کے پاس اس بات کا اقرار کرنے کے لئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔ چوری اور بدکاری نہیں کریں گی اور نہ ہی اپنی اولاد کو قتل کریں گی۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (سقیفہ بنی ساعدہ میں) ہجرتِ مدینہ کی فضیلت انصار پر دیا تو حضرت عمر نے فرمایا ”ہاتھ بڑھائیے کہ میں آپ کی بیعت کروں“

پھر پیغمبر مسلمانوں نے بیعت کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر نے جب (آخری وقت) حاکمِ عمر کو ولی عہد بتایا تو لوگوں سے آپ کی بیعت لی۔ پھر عام مسلمانوں نے بھی بیعت کر لی۔ جب حضرت کے مقررہ چھ صحابہ نے اتفاق رائے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا تو اہل مدینہ نے مسیّد بنوری میں آپ کی بیعت کی۔ اہل مدینہ نے اس کے بعد حضرت علی کی بیعت بھی کی تھی۔

بیعت لینے کا سلسلہ اموی عہدِ خلافت اور اولین خلفاء عباسیہ میں بھی جاری رہا۔ عصرِ صحابہ میں بیعتِ کامل آزادگی رائے اور بلا جبر و اکراہ لی جاتی تھی ماموی عہدِ خلافت میں جبر سے لیا جانے لگا۔ اموی دور کے مشہور سفاک حجاج ثقفی نے بیعت لینے کے طریقہ میں نئی نئی اختراعات کی حجاج لوگوں کی بیعت لینے وقت انہیں یہ الفاظ کہنے پر مجبور کرتا۔ ”اگر میں خلیفہ کی اطاعت نہ کروں تو میرے غلام آزاد اور میری بیویاں مطلقہ ہو جائیں“

اس سے حجاج کا مقصد یہ تھا کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت میں جکڑے رہیں اور اس کا لگ نہ ہو سکیں۔ اولین عباسی خلفاء بھی لوگوں کو بیعت پر مجبور کیا کرتے تھے تاہم وہ لوگوں کو ایسے الفاظ کہتے پڑھتے نہیں کرتے تھے جیسا کہ حجاج کا رویہ تھا۔ مشہور عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور بھی جبری بیعت لینے سے متکرم ہوا تھا۔ اسی بناء پر والی مدینہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فتویٰ دینے سے روک دیا تھا کہ جس شخص کو جبراً حلف اٹھانے پر مجبور کیا جائے اس کی قسم معتبر نہیں۔ اسی طرح مجبور آدمی کی طلاق بھی بے اثر ہے۔ اس سے اس کی مراد یہ تھی کہ مبادا لوگ یہ کہیں کہ جس کو بیعت کرنے پر مجبور کیا جائے اس کی بیعت قابل اعتماد نہیں۔

۸۶۔ بیعت کا یہ قاعدہ عقداً اجتماعی کے

نظریہ کے ہم آہنگ ہے جسے دور حاضر کے علماء تشکیل سلطنت کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ جان باکرد و سوفرانسیسی اور مشہور انگریزی مصنف ہویر اور لوک کا خیال ہے کہ کسی سلطنت کی تاسیس و تشکیل کی اصل و اساس وہ معاہدہ ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان اس ضمن میں استوار کیا جاتا ہے کہ حاکم رعایا پر ٹیکس و محصول وغیرہ لگا کر ہر طرح اس کی مصلحت و بہبود کا خیال رکھے گا۔

تاہم علماء اس مسئلہ میں مختلف انخیال ہیں کہ حاکم و محکوم اس عہد کے کس حد تک پابند ہوں گے اور وہ عہد بھی کیساں نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ کبھی سخت ہوتا ہے اور کبھی نرم۔

اس کے برعکس علماء اسلام نے فطرتِ مستقیمہ اور اسلام کے طے شدہ اصولوں کے زیر اثر اس معاہدہ کو ایک عملی واقعہ کی شکل دی اور اسے صرف مفروضہ کی حد تک نہ چھوڑا۔ ان اصولوں کے تحت محکوم کی نسبت حاکم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ مقابلتاً زیادہ شدید قسم کی ہوتی ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں یہ فرض نہیں کیا گیا کہ حاکم کا دستِ بدست خود رعایا کی مصلحت و بہبود کی ضمانت ہے جیسا کہ بعض انگریز مصنفین کا خیال ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ حاکم جب عدل و انصاف اور بہبود و مصلحت کے تقاضوں پر عامل نہ ہو نہ ہی کتاب و سنت پر عمل کرتا اور اس کے فرائض و حدود کو نافذ کرتا ہو۔ نہ فساد کے روکنے کے لئے اس نے کوئی نئی تدبیر جدید کی ہو تو ایسا حاکم عین عذابِ خداوندی ہے۔

۸۷۔ یہ شرطِ بیعت کا ذکر تیسری شرط یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے ہو۔ اس کی اصل و اساس یہ ہے کہ اسلامی خلافت اپنی اصل

۳۔ مشورہ کی وضع کے اعتبار سے مشورہ پر مبنی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :-
 «وَأَقْرَبُهُمْ شُورَىٰ بَيْنِهِمْ» (وہ اپنے امور شوریٰ سے طے کرتے ہیں)
 اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مامور فرماتے ہیں :-

«وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ» (دینی امور میں ان سے مشورہ کیجئے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ مسلمانوں سے متعلق اہم امور میں — جن میں وحی نازل نہ ہوتی — شوریٰ کا التزام فرماتے۔ غزوہ ہائے اسلامی اور ان کے نتائج و عواقب میں جہاں وحی نازل نہ ہوتی آپ مسلمانوں سے مشورہ فرماتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زریں دور میں بھی شوریٰ پر عمل درآمد رہا۔

جب خلافت اسلامی اپنی اصل کے اعتبار سے شوریٰ پر مبنی ہے تو خلیفہ کا انتخاب بھی شوریٰ سے ہونا چاہئے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اسلامی حکومت کی اساس شوریٰ پر رکھی گئی ہو اور خلیفہ کو وراثت کی بناء پر مقرر کیا جائے کیونکہ شوریٰ اور وراثت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کا ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو کڑی سے کڑی تنقید کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے بیعت کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی حکومت کو موروث بادشاہی میں تبدیل کر دیا جس سے بیعت کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ بیعت کا معزز و جوہر حریت انتخاب و اختیار ہے جو مزید کی نامزدگی کی صورت میں باقی نہ رہا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے
 «معاویہ میں چار باتیں پائی جاتی تھیں اگر ان چاروں میں سے ایک بھی موجود ہوتی تو ان کی ہلاکت کے لئے کافی تھی۔»

۱۔ معاویہ نے چند احمق لوگوں کی مدد سے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر خلافت پر قبضہ جمایا۔

۲۔ مزید کو خلیفہ نامزد کیا حالانکہ وہ شراب پیتا ریشم پہنتا اور ساز بجاتا ہے۔

۳۔ زیاد کو حاکم بنایا حالانکہ نبی کریم کا ارشاد ہے کہ بچے کی وارث عورت ہوگی اور زانی

کو سنگسار کر دیا جائیگا۔ (یہ زیاد کے ولد الحرام ہونے کی جانب اشارہ ہے)

۴۔ حجر بن عدی کو قتل کیا جو بڑا اقرب سناک فعل ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیعت میں مشورہ کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :-

” جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو بیعت کرے تو اس کی بیعت درست نہیں۔“
حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد گرامی اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ ان کی رائے
میں وہ شخص امامت و خلافت کی صلاحیت سے پرہیز نہیں جو بلا ارادہ و اختیار کسی سے بیعت لیتا ہے۔

انتخاب خلیفہ کے تین طریقے | ۸۸۔ مندرجہ بالا بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری

کرتے ہیں کہ شوریٰ کی شرط ازسین ناگزیر ہے۔ نیز یہ کہ بیعت
مسلمانوں کے مشورہ سے ہوتی چاہئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیعت و شوریٰ کا طریقہ کیا
ہے اور ان کے اہل کون لوگ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے شوریٰ کا حکم دیا اور سنت نبوی نے اس کا التزام کیا
مگر یہ نہیں بتایا کہ شوریٰ کیونکر ہو اور کون لوگ اس کے اہل ہیں؟ بالفاظ دیگر اس کی تنظیم و
عرفت کا طریقہ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ اس کو چھوڑ دینے کی وجہ یہ تھی کہ شوریٰ میں باختلاف
زمان و مکان و بتغییر دیار و امصار تبدیلی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ شوریٰ کا ایک طریق ایک دور
و عصر میں مناسب ہوتا ہے مگر دوسرے میں نہیں۔ اسی طرح ہر قوم کا طریق شوریٰ دوسری
قوم سے جداگانہ انداز کا ہوتا ہے۔ خداوند کریم نے شوریٰ کا حکم اسی طرح دیا جس طرح عدل
مگر دونوں کی تعیین نہیں فرمائی۔ بلکہ انہیں لوگوں کی رائے پر چھوڑ دیا۔

شوریٰ سے انتخاب خلیفہ کے مسلمانوں کے یہاں تین طریقے چلے آتے ہیں۔ ہم قبل ازیں ان
کی جانب اشارہ کر چکے ہیں۔ اب نسبتاً زیادہ تفصیل سے ان پر روشنی ڈالیں گے۔

طریق اول = خلیفہ کو منتخب کرنے کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ سابق کے عہد کے بغیر
سی گو کامل آزادی فکر و نظر سے خلافت کے لئے چن لیا جائے۔ اس قاعدہ کا مصداق حضرت
ابوبکر کا انتخاب ہے۔ آپ کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عہد نہیں کیا تھا۔
روایات میں مذکور ہے کہ آنحضرت نے مرض الموت میں حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کے لئے مامور
فرمایا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے اس فرمان کی روشنی میں صحابہ نے آپ کو خلیفہ چنا
ان کا استدلال یہ تھا کہ آنحضرت نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کے لئے مامور فرمایا تھا جو ایک
دینی کام ہے۔ تاہم خلافت جیسے دنیوی کام کے لئے آپ کو کیوں کر منتخب نہ کریں۔

صحابہ کے اس استنباط کو اگر درست بھی تسلیم کیا جائے تو اسے آنحضرت کا عہد نہیں کہا جاسکتا
یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے اس وطیرہ سے حضرت ابوبکر کی فضیلت کا پہلو نکلتا ہے اور معلوم ہوتا

ہے کہ صحابہ میں آپ کو کیا مقام حاصل تھا مگر اس کو کسی طرح بھی ایک باقاعدہ عہد نہیں کہہ سکتے
 کیونکہ اس میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں اور نہ آپ نے اس کی طرف کسی کو دعوت دی۔
 علاوہ ازیں حضرت ابوبکر کے نماز پڑھانے کا واقعہ سقیفہ نبی ساعدہ میں پیش نہیں آیا
 جہاں آپ کو خلیفہ چنا گیا تھا البتہ آپ کی امامت صلاۃ سے لوگوں میں آپ کی پیروی کا جذبہ
 ضرور پیدا ہو گیا تھا اور جب حضرت عمر نے اپنا ہاتھ بیعت کے لئے بڑھایا تو لوگ بے درپے
 بیعت کرنے لگ گئے۔

بہر کیفیت یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ نبی کریم نے حضرت ابوبکر کی بیعت کا حکم صادر
 نہیں کیا تھا۔

طریق ثانی = انتخاب خلیفہ کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ سابق کسی ایسے شخص کو ولی عہد
 بنا دے جو اس کا قریبی عزیز نہ ہو۔ حضرت ابوبکر نے اسی قاعدہ کے تحت حضرت عمر کو ولی عہد
 مقرر کیا تھا۔ حضرت عمر کو تفویضِ خلافت ایک طرح کی التجا تھی جو حضرت ابوبکر نے حضرت
 عمر سے کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے خلافت کا معاملہ حضرت عمر پر ٹھونس دیا تھا۔
 وہ زمانہ بڑا پورا شوب تھا اسلامی ممالک کے لوگ مرتد ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان جہاد
 کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے تھے حضرت ابوبکر نے خطرہ محسوس کیا کہ کہیں وہی حالات نہ
 پیدا ہو جائیں جو قبل ازیں سقیفہ نبی ساعدہ میں رونما ہو چکے تھے۔ ان خطرات کے پیش نظر
 انہوں نے دینی اخلاص اور مسلمانوں کی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر حضرت عمر سے التجا
 کی کہ ایسے وقت میں خلافت کی نازک ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہ واضح ہے کہ حضرت عمر
 آپ کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اطاعتِ شعاہ صحابہ فوراً ہی بیعت کے لئے
 آمادہ ہو گئے۔ کچھ لوگ آپ کے انتخاب پر معترض بھی ہوئے مگر جب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی
 کہ آپ کا عمل ہی قرین حق و صواب ہے تو انہوں نے اپنی مرضی سے بدول جبر و اکراہ بیعت کر لی
 طریق ثالث = خلیفہ منتخب کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قوم کے چند بہترین اشخاص کو منتخب
 کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ بن لیں۔ حضرت عمر نے جب دیکھا کہ نبی کریم
 نے کسی کو ولی عہد مقرر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ حضرت ابوبکر نے انہیں
 (حضرت عمر کو) ولی عہد بنایا تھا۔ فرمایا: اگر میں کسی کو خلیفہ نہ بناؤں تو جو ہستی مجھ سے بہتر
 تھی (نبی کریم) انہوں نے بھی ایسا کیا تھا اور اگر ولی عہد بنا لوں تو حضرت ابوبکر نے ایسا کیا تھا

جو مجھ سے افضل تھے۔

نظر میں آپ نے ایک درمیانی راہ اختیار کی اور چھ اشخاص کو منتخب کیا کہ وہ اپنے میں سے ایک کو چن لیں۔ انہوں نے حضرت عثمان کو چن لیا۔

لوگوں نے ان کی بیعت کر لی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ چھ اشخاص کا انتخاب جبری قسم کا نہ تھا بلکہ ان سے کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کی التجاء کی گئی تھی۔ اگر مسلمان حضرت عثمان کی بیعت میں حصہ نہ لیتے تو آپ کی خلافت کا انعقاد نہ ہوتا۔ کیونکہ خلافت کا انعقاد صرف طلب و التجاء ہی سے نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے اثبات کے لئے بیعت شرط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیعت آزادی فکر و رائے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اسی سے ولایت کی تکمیل ہوتی اور امامت و خلافت کا تحقق ہوتا ہے۔



حدیث ابن حزم فرماتے ہیں :

”انتخاب خلیفہ طریقہ ہائے سہ گانہ میں محدود ہے۔ ان کے سوا کوئی نیا طریقہ اشتراع نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ اجماع صحابہ کی خلاف ورزی ہوگی۔ ان طرقتی ثلاثہ کی پسندیدگی پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔“

انتخاب خلیفہ کے ان طرقتی ثلاثہ کے سلسلہ میں حق بات یہ ہے کہ اس دور میں آزادی فکر و ارادہ کا تحقق صرف ان تین طرقتی سے ہوتا تھا۔ دوسرے زمانہ والے حسبِ زمان و مکان ایسا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ جس سے انتخاب امیر کے بارے میں امت کی رائے زیادہ واضح طور سے معلوم ہوتی ہو۔

دواہم سوال اور ان کا جواب | ۸۹۔ یہ ہے دور صحابہ میں نظامِ شوریٰ اور اسکے تین اقسام! یہاں دو سوال ذہن میں ابھرتے ہیں۔

(۱) عصر صحابہ میں اہل شوریٰ کون تھے؟

(۲) جب کوئی شخص شوریٰ کے بغیر خلیفہ بن جائے اور سب لوگ اس کے موافق ہو جائیں تو کیا اس کی اطاعت ضروری ہوگی۔

پہلے سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں فعل صحابہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اور دیکھنا ہوگا کہ وہ کس نتیجہ تک پہنچے۔ چنانچہ ہمارا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت ابو بکر کی بیعت کرنے والے اہل مدینہ تھے جو ہجرت میں و انصار پر مشتمل تھے۔ اسی طرح

اہل مدینہ ہی نے حضرت عمر و عثمان کی بیعت کی۔ گویا یوں کہئے کہ مدینہ کو اس دور میں وہی حیثیت حاصل تھی جو بصرہ کیس کے زمانہ میں ایتھنز (یونان کو)۔ اس اہمیت کے کچھ وجوہات بھی تھے مثلاً (۱) مدینہ اس دور میں مسلمانوں کا مرکز و محور تھا۔

(۲) اہل مدینہ ہی اس زمانہ میں اسلام کے تحفظ و دفاع کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

(۳) مدینہ کے علاوہ دیگر بلاد و امصار میں اسلام کو ابھی استقرانقصیب نہیں ہوا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عرب قبائل میں سے اکثر آنحضرت کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ صرف مکہ و مدینہ ہی ارتداد کے فتنہ سے محفوظ رہ سکے تھے۔

(۴) یہ کیسے ممکن تھا کہ نبی کریم کی وفات کے بعد مسلمان ان بدو لوگوں کو اسلامی حکومت میں شامل کر لیتے جو اسلام کا جو ابھی اپنی گردن سے اتار دیتا چاہتے تھے۔

(۵) حضرت عمر و عثمان کے عہد خلافت میں مسلمان جہاد کے لئے مختلف دیار و امصار کی طرف تکل گئے تھے مگر وہ کہیں بھی جا کر آباد نہ ہوئے تاکہ اس ملک کو بھی بیعت کا حق حاصل ہوتا اور وہاں کے رہنے والے انتخاب خلیفہ میں برابر کے سہم و شریک سمجھے جاتے۔

بخلاف ازیں جب حضرت علی کا دور خلافت آیا تو عرب بیرونی ممالک میں جا کر آباد ہوئے۔

چکے تھے۔ عربوں کی اکثریت ملک شام میں سکونت گزیر چکی تھی۔ کچھ لوگ بصرہ کو فرما کر اور مصر کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ مگر یوں ہی حضرت علی کو خلیفہ منتخب کرنے والے صرف اہل مدینہ تھے۔ مسلمانوں کے تحفظ کے نقطہ خیال سے حضرت علی نے اہل مدینہ کی یہ پیشکش قبول فرمائی اور اس بات کو اپن فرمایا کہ اہل مدینہ ہی تنہا آپ کے انتخاب میں حصہ لینے والے ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ مختلف دیار و امصار میں جا بسے تھے وہ آپ کے خیال میں مرتدین عرب ہی کا لقیہ تھے۔ مزید برآں ان ممالک میں اسلامی حکومت کو کبھی استحکام حاصل نہ ہو سکا۔ نیز یہ کہ انتخاب میں ہر فرد بشر کی شمولیت ضروری بھی نہیں۔ ان ممالک میں جا رہی عصبیت کے اثرات بھی نمایاں رہے اور کبھی نہ کبھی وہ منظر عام پر بھی آجاتے تھے۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خلیفہ کے عمومی انتخاب کے لئے ایک ایسے جامع نظام کی ضرورت ہے جس میں عرب و عجم سبھی شریک ہوں۔ اس دور میں بلاد اسلامیہ میں موالی کی کافی تعداد سکونت گزیر چکی تھی جن کی جانب توجہ مبذول کرنا بے حد ضروری تھا۔ مگر اس کے لئے یہ بات ازیں ناگزیر تھی کہ آپ (حضرت علی) کی بیعت کی تکمیل ہوئے۔ حالات نارمل ہو جائیں اور

شورش و اضطراب کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو سازگار فضا پیدا کرنے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ آپ کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ مسلمانوں کو نقص بیعت پر آمادہ کیا۔ آپ کی بیعت کرنے والوں کو متہم کیا۔ بعض نے تو آپ کے کہنے پر حضرت علی کی بیعت توڑ بھی ڈالی۔ اس طرح امت میں خلفشار و انتشار پیدا ہوا اور امن و سکون کی فضا باقی نہ رہی۔

شاید یہی وجوہات کے پیش نظر بعض عربوں کے جی میں یہ بات آئی کہ انتخاب خلیفہ میں صرف اہل مدینہ کے مشورہ پر اکتفا کیا جائے۔ حق بات یہ ہے کہ حضرت علی جس راہ پر گامزن ہوئے تھے وہی قرین صدق و صواب اور تقاضائے عدل و انصاف تھی۔ عقل و فکر سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی کہ جب مدینہ کو بیرونی لشکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے حضرت علی اس وقت انعقادِ خلافت کے لئے مصر و شام اور عراق و فارس کے عربوں کی رائے دریافت کرنے کی فکر میں لگے رہتے۔ موالی کو بھی اس عمومی انتخاب سے محروم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

مگر ذکر کردہ مقاصد کے پیش نظر اہل حجاز کی بیعت نے دوسرے عربوں کو شوریٰ میں شامل کرنے سے بے نیاز کر دیا۔ علاوہ ازیں حضرت علی کو یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ ملک شام کے ماسوا سب لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔

ان حالات کے پیش نظر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اسلامی مصلحت کے آگے جھک جانا اور مسلمانوں کی اکثریت کا ساتھ دینا چاہئے تھا۔ خصوصاً جب کہ حضرت علی کا رتبہ و مقام بھی اس کا مقتضی تھا۔ حضرت علی اس عصر و عہد میں بلا شرکت غیرے امام زمان و مقتدائے دوران تھے یا موجودہ زمانے کی اصطلاح میں حالاتِ حاضرہ کا مقتضی (رجل الساعة) تھے۔ مگر بات یہ تھی کہ

۷۰
۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

۱۰ فتح مکہ کے بعد صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور ان کے ہاتھ پر لکھا گیا کہ "بیتنا علیہ وسلم" (غلام احمد خاں نے مترجم کیا)

ہر طرف حرص و آذکی کار فرمائی تھی۔ عصبیت ہر طرف عام تھی حقد و عناد کا دور دورہ تھا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ تعالیٰ۔

دو عمر سوال اور اس کا جواب | ۹۰۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ جو حاکم شوریٰ کے بغیر خلافت

وامامت پر قابض ہو جائے اس کی اطاعت کا کیا حکم ہے؟ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ جمہور فقہاء کی رائے میں جو شخص از خود خلافت پر قبضہ جما لے مسلمانوں کا کوئی امیر اس وقت موجود نہ ہو اور وہ شرطا امامت سے بھی بہرہ ور نہ ہو، وہ لوگوں میں قیام عدل کے لئے ساعی رہتا ہو۔ اور لوگ اس کو پسند کر کے اس کی بیعت کر لیں تو ایسا شخص بلاشبہ امام ہوگا۔

کتاب المدارک میں تحریر ہے :-

”ابن نافع کا قول ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے جب اہل حرمین بیعت کر لیں تو تمام اہل اسلام کے لئے بیعت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ کو منتخب کرنے والوں کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر کیا ہے۔ امام مالک اپنے عصر و عہد میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مثالی امام تصور کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کا انتخاب بھی شوریٰ کے طریقہ سے نہیں ہوا تھا۔ مگر آپ نے اپنے عہد خلافت میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا اور مظالم کا انسداد کیا۔ لہذا آپ ایک امام بحق تھے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ بیعت سے قبل خلیفہ کا انتخاب امام مالک کی نگاہ میں ضروری نہیں۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ بیعت بھی شرط نہیں بلکہ رضامندی اور امامت حق و انصاف ہی تقرر امامت کے لئے کافی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی عوام کی رضامندی کو انعقاد امامت کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور انتخاب کو ضروری قرار نہیں دیتے۔ امام شافعی کے شاگرد حرمہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے امام شافعی نے فرمایا :

”ہر قرشی شخص جو بزور شمشیر خلافت پر قابض ہو جائے اور لوگ اسے خلیفہ تسلیم کر لیں تو وہ خلیفہ ہی ہوگا“

امام شافعی کے اس اقتباس سے نمایاں ہے کہ ان کے نزدیک انعقاد خلافت کے لئے قرشیت اقامت عدل اور لوگوں کی رضامندی کا پایا جان ضروری ہے خواہ رضامندی

تقریر امامت سے قبل ہو یا اس کے بعد۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں اسے واضح کیا ہے، فرماتے ہیں:

”جو خلافت پر مسلط ہو جائے لوگ اسے خلیفہ تسلیم کر لیں اور اس کی امامت پر خوشنودی کا اظہار کریں تو وہ (شرعاً) خلیفہ ہوگا۔

اسی طرح بوزور شمشیر خلافت پر قابض ہو جائے تو وہ بھی خلیفہ ہے۔

امام احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ خلیفہ کی تائید و نصرت کے لئے، وہ اچھا ہو یا بُرا۔ اس کے اعداء سے بڑا نا قیام قیامت جاری رہے گا۔ امام صاحب مزید فرماتے ہیں:-

”جو کسی خلیفہ کے برخلاف بغاوت کے لئے نکلے حالانکہ لوگوں نے اسے خلیفہ چن لیا ہو اور اس کی خلافت پر جمع ہو چکے ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ انہوں نے رضامندی سے اس کی خلافت تسلیم کی ہو یا بالجبہ، تو ایسے یاغی نے اسلام کا شیرازہ منتشر کر دیا اور احادیث نبویہ کی خلافت و رزی کا ارتکاب کیا۔ اگر ایسا شخص مر جائے گا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

(المناقب لابن الجوزی ص ۱۷۶)

متغلب کی خلافت کے شرائط | ۹۱۔ یہ جمہور فقہاء کا نقطہ نظر ہے۔ یہ بات پیش نظر ہے کہ کہ بوزور خلیفہ بننے والے کی خلافت اس صورت میں خلافت نبوت

ہوگی جب جملہ شرائط کی حامل ہو۔ ان شرائط میں سے اہم ترین شرط اقامتِ عدل و انصاف ہے علاوہ ازیں اقامتِ عدل پر دو اور شرائط کا احصاء بھی لے جانا گنہگار ہے۔ کیونکہ بوزور خلافت پر قابض ہونے والے میں ائمہ کرام کے نزدیک ان کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ اس وقت کوئی دوسرا امام موجود نہ ہو۔ یہ شرط اس لئے ضروری ہے کہ ایک پسندیدہ امام کی موجودگی کی صورت میں اس کے خلاف خروج کرنے والا باغی ہوگا جس کے خلاف لڑنا نیکہ اسے قتل کر دینا ضروری ہے۔

✓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

”جب تم ایک امیر کے زیرِ اثم زندگی بسر کر رہے ہو اور دوسرا شخص خلافت کا دعویٰ کرنے لگے تو اسے قتل کر دو“

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ اختیار و انتخاب کی فرصت نہ ہو اور قیامِ خلافت فوری طور پر ضروری ہو مثلاً خلیفہ لڑائی کے دوران مارا جائے۔

جب ایسے حالات موجود نہ ہوں جن کی بناء پر شوریٰ اور مسلمانوں کے اختیار و انتخاب سے انحراف کیا جاسکتا ہے تو خروج کرنے والا جبر و تشدد اور ایک عادل حاکم کے خلاف بغاوت برپا کرنے کی بناء پر گنہگار ہوگا۔ اور اگر شرعی ہوائ کی قید لگاٹے بغیر ہر یاغی کے ٹھٹھارت و خلافت کا دروازہ کھول دیا جائے تو شوریٰ ختم ہو کر رہ جائے۔ حکام کے مابین قتل و قتال کا بازار گرم رہے اور اسلامی خلافت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ جیسا کہ ماضی میں ہوا۔

۴۔ عدالت | ۹۲۔ چوتھی شرط جس کا خلافت نبویہ میں پایا جانا ضروری ہے عدالت ہے

بلکہ یوں کہئے کہ عدالت تمام شرائط کا جوہر و خلاصہ ہے۔ خلیفہ سے جو عدالت مطلوب و مقصود ہے۔ وہ تمام اقسام عدالت کی جامع ہے۔ مثلاً یہ کہ خلیفہ ذاتی طور پر عادل ہو۔ نہ اقارب و اعزہ کو دوسروں پر ترجیح دے نہ احباب کو دوسروں سے مقدم رکھے۔ نہ اعداء کو اپنے سے دُور رکھے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے۔

”اے ایمان والو! انصاف پر قائم ہو جاؤ اور خدا کے لئے گواہ بن جاؤ خواہ تمہیں اپنے والدین یا اقارب کے خلاف شہادت دینی پڑے۔ اگر شہادت دینے والا سنی یا تنگ دست ہو تو خداوند تعالیٰ اس بات کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے کہ شہادت دیتے وقت اس کو پیش نظر رکھا جائے۔ عدل کو برقرار رکھنے میں خواہشکات کی پیروی نہ کرو اگر تم اس سے انحراف کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔“

امام کی عدالت اس پر یہ واجب کرتی ہے کہ کسی اچھے آدمی کو حاکم بنائے اور ان لوگوں کو بلند منصب تفویض کرے جو انصاف پسند اور نرم مزاج ہوں۔ ولایۃ و حکام کے تعینات کرنے میں نبی کریم نے بڑے سخت احکام دیئے ہیں۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:۔

”جو میری امت میں سے خلافت و امارت کے منصب پر فائز ہوا پھر اس نے باہمی تعلقات کی بناء پر (بدوں استحقاق) کسی کو امیر مقرر کر دیا تو وہ خداوند تعالیٰ فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کا مورد ہوگا۔ اس کے فرائض و توافل مقبول نہیں ہونگے۔“

نیز آپ نے فرمایا:

”جس نے کسی جماعت پر کسی کو حاکم بنا دیا۔ حالانکہ ان میں ایسا شخص بھی تھا جو خدا کو زیادہ خوش کرنے والا تھا تو اس نے اللہ تعالیٰ رسول علیہ السلام اور مسلمانوں سے خیانت کا ارتکاب کیا۔“

امام کی عدالت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اعداء سے بھی عدل و انصاف کا معاملہ کرے کیونکہ

عدالت اسلامیہ کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہے اور اس میں کسی کی تخصیص نہیں یہاں تک کہ دوست و دشمن کے درمیان بھی کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

”وَلَا يَجْرِمُكُمْ شَتَانُ قَوْمٍ عَلَىٰ
أَنْ لَا تُعَدِلُوا إِعْدِلُوا هُوَ
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ“

کسی قوم کی عداوت تم کو انصاف نہ
کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ انصاف
کیجئے کیونکہ انصاف تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

اسلامی عدل و انصاف اس قانونی عدالت کو بھی شامل ہے جس کے تحت کیساں طور پر اسلامی احکام سب پر عائد کئے جاتے ہیں۔ تمام فقہاء اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ خلیفہ اگر کسی قصور کا مرتکب ہو گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ شرعی حدود کا مرتکب ہونے کی صورت میں اس پر حد قائم کی جائے گی۔ اسی طرح فقہاء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ خلیفہ کے حکام جب کسی ایسے جرم کا ارتکاب کریں جو حد یا قصاص کا موجب ہو تو ان سے قصاص لیا جائے گا اور ان پر حد قائم کی جائے گی۔ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔

اسلامی عدالت اجتماعی عدالت کو بھی شامل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ اجتماعی عدالت کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ اسی طرح عدالت اسلامی معاشی عدالت کو بھی ماویٰ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو روزگار مہیا کرنا بھی خلیفہ کے فرائض میں سے ہے۔ معاشی عدالت کی بدولت تقسیم اوقات میں یکسانی پیدا ہوتی ہے۔ اسی کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاتحین کو عراق و مصر اور شام کی مفتوحہ اراضی کا مالک بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ یہ اراضی طبقہ امراء و اعیان میں گردش نہ کرتی رہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معادن (کانیں) حکومت کی ملکیت ہیں۔ دوسرا کوئی شخص ان کا مالک نہیں۔

۵۱۳ھ - خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ
مکتوب حسن بصری بنام عمر بن عبدالعزیز

تھا کہ امام عادل کن اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت حسن نے یہ مکتوب گرامی لکھا۔
”د امیر المؤمنین! آپ کو معلوم ہوتا چاہئے کہ امام عادل کا وجود مسعود ہر کج رو کے لئے
راست روی کا موجب ہر مفید کے لئے پیغام صلح و قلاح ہر کمزور کے لئے سبب قوت و
نصرت ہر مظلوم کے لئے داد رسی کا موجب اور ہر پریشان حال کے لئے جائے امن و
امان و سکون و اطمینان ہوتا ہے۔“

اے امیر المؤمنین! امام عادل ایک گڈ رٹے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے اونٹوں پر ٹرا مہربان ہو ان کے لئے بہترین چوگاہ انتخاب کرے۔ مہلک چوگاہوں سے بچائے۔ درندوں سے محفوظ رکھے اور سردی و گرمی سے بچاؤ کا اہتمام کرے۔

امیر المؤمنین! عادل امیر ایک نقشبند والد کی طرح ہوتا ہے جو بچپن میں بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ بڑے ہونے پر انہیں لکھاتا پڑھاتا۔ زندگی میں ان کے لئے کماتا اور بوقت موت ان کے لئے ذخیرہ چھوڑ جاتا ہے۔

امیر المؤمنین! امام عادل لطیف و شفیق والدہ کی طرح ہوتا ہے جو بحالت حمل اولاد کو بطن میں اٹھاتی پھر زحمت و ولادت گزارا کرتی۔ بچپن میں ان کی تربیت کرتی۔ دودھ پلاتی اور پھر چھڑاتی ہے۔ اولاد کی خوشی میں اس کی خوشی اور ان کے رنج میں اس کا رنج ہوتا ہے۔ امیر المؤمنین! انصاف پسند امیر تہیوں کا غمخوار اور مسکینوں کا خزانچہ ہوتا ہے۔ وہ چھوٹوں کی تربیت کرتا اور بڑوں کے لئے نان و نفقہ بھیجا کرتا ہے۔ انصاف پسند امیر کو کسی ملک میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو دل کو جسمانی اعضاء میں۔ اگر دل کی حالت درست ہے تو سب اعضاء صحیح و سالم ہیں اور اگر دل میں قہار پیدا ہو جائے تو سب اعضاء بگڑ جاتے ہیں۔

امیر المؤمنین! امام عادل عیب اور معبود کے درمیان ایک واسطہ کا کام دیتا ہے وہ اللہ کا کلام سنتا اور بندوں کو سناتا ہے۔ خود خدا کو دیکھتا اور بندوں کو اس کا مشاہدہ کراتا ہے۔ خود خدا کی اطاعت کرتا اور بندوں کی قیادت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ امیر المؤمنین! آپ اس غلام کی طرح نہ ہوں جس کے آقائے سے امین سمجھ کر اپنا مال و متاع اس کے سپرد کر دیا۔ غلام نے مال کو ادھر ادھر صنایع کر دیا اور اہل و عیال کو منتشر کر دیا جس کے نتیجے میں آقا دو تلوں سے محروم ہو گیا۔

امیر المؤمنین! آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خدا نے شرعی حدود کو اسی لئے نازل فرمایا کہ لوگ فاحش و منکرات سے رک جائیں جب وانی حکومت خود ہی ان کا ارتکاب کرنے لگے تو آپ ہی فرمائیے اس کا کیا انجام ہوگا؟ خدا نے قصاص کو انسانی جانوں کے تحفظ کے لئے مشروع فرمایا ہے۔ جب قصاص لینے والا خود ہی لوگوں کو قتل کرنے لگے تو ان کی حفاظت کون کرے گا؟

امیر المؤمنین! موت اور اس کے بعد کے حالات کو یاد رکھئے۔ جب آپ کی امداد کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ پس آپ موت اور اس کے بعد پیش آنے والے شدید حوادث کے لئے زاویہ راہ جمع کیجئے۔

امیر المؤمنین! جہاں آپ سکونت پذیر ہیں اس کے سوا بھی ایک منزل ہے (قبر) جہاں عرصہ دراز تک آپ ٹھہرے رہیں گے۔ سب دوست احباب ایک گڑھے میں آپ کو تنہا ڈال کر چلے جائیں گے اس کے لئے آپ ایسا گوشہ جمع کیجئے جو اس آٹے وقت میں کام آئے۔
قرآن حکیم میں فرمایا:

يَوْمَ يَقْرَأُ الْمُرُوءُ مِنْ أُخِيهِ وَآمِهِ
وَآبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ۔
جب آدمی اپنے بھائی سے بھاگ جائیگا۔ اپنی
ماں سے اپنے باپ سے اور بیوی اور بیٹیوں سے
راہ فرار اختیار کرے گا۔

امیر المؤمنین! یاد رکھئے جب قبروں والے اٹھائے جائیں گے۔ سینوں کے راز افشاء کر دیئے جائیں گے اور کتاب الہی چھوٹے بڑے کسی گناہ کو نہیں چھوڑتی بلکہ اسے محفوظ کر لیتی ہے۔
امیر المؤمنین! اب اعمال صالحہ انجام دینے کا وقت ہے۔ اب آپ کو فرصت ہے بھی آخری وقت نہیں آیا۔ ابھی مالوسی کے آثار بھی ظاہر نہیں ہوئے۔

امیر المؤمنین! جہلاء کے قول کے مطابق فیصلہ نہ کیجئے۔ نہ ظالموں کی راہ پر چلیے اور نہ بظروں کو چھوڑوں پر مسلط کیجئے۔ کیونکہ وہ کسی مومن کی قرابت داری اور عہد کی پڑاہ نہیں کرتے۔ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو اپنے گناہوں کے علاوہ دوسروں کے گناہوں سے بھی تلوث ہونگے اور اپنے بوجھ کے ساتھ دوسروں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو لوگ عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں وہ آپ کی تکلیف کا موجب ہوں۔ وہ لوگ جو دنیا میں لذائذ و طیبات سے لطف اندوز ہوتے ہیں کہیں آپ کو آخری طیبات سے محروم نہ کر دیں۔ آپ اپنی موجودہ قدرت پر نگاہ نہ رکھیں بلکہ یہ دیکھیں کہ آئندہ آپ کو کس قدر قدرت حاصل ہوگی۔ جب آپ موت کے نیچے میں جکڑے ہوئے ہوں گے اور انبیاء و رسل اور فرشتوں کے زمرہ میں خدا کے روبرو کھڑے ہونگے۔ قرآن کریم میں فرمایا:
وَعَنْتِ الْوُجُوهُ لِلْحَىِّ الْقَيُّومِ۔ (سب چہرے خداوندی و قیوم کے سامنے جھک جائیں گے)
امیر المؤمنین! اگر پچھلے علماء سلف کی طرح میں نصیحت کا فریضہ ادا نہ کر سکا تاہم

میرے یہ معروضات شفقت و مہمردی کے ترجمان ہیں جس میں میں نے کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ میرے اس خط کو یوں تصور کیجئے جیسے ایک دوست کڑوی دوا پلا کر اپنے دوست کا علاج کرتا ہے کیونکہ اسے امید ہوتی ہے کہ اس دوا سے وہ صحت یاب ہو جائیگا۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا امِيرَ الْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ۔

مکتوب حسن بصری پر تبصرہ | ۹۲۴۔ حضرت حسن بصری ایسے خدا رسیدہ تابعی نے اپنے گراں قدر مکتوب میں امام عادل کے اوصاف کائنات میں

ان کی نگاہ میں خلیفہ عمومی عدل کا حامل ہونا چاہئے۔ عمومی عدل قانونی عدل و انصاف کو بھی شامل ہے جس کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ حاکم قرآین کتاب و سنت کی اطاعت کرتا ہو۔ قانونی عدالت کے تحت حاکم کے مرتکب جرائم ہونے کی صورت میں اس پر حد بھی جاری کی جاسکتی ہے اور اس سے قصاص بھی لیا جاسکتا ہے۔ جمہور فقہاء اسی کے قائل ہیں۔

یہ مکتوب عدالت اجتماعی پر بھی مشتمل ہے جس کی بناء پر اجتماعی کفالت کی اساس میں نظم نسق پیدا ہوتا ہے۔ نیز یہ عدالت ادارہ کو بھی شامل ہے جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ولادت و حاکم عدل و انصاف کے آگے اپنی گردنیں جھکاٹے رکھیں اور کرسی اقتدار پر اس نیت سے براجم نہ ہوں کہ لوگوں کو اپنا لونڈی غلام بنا لیں اور مسلمانوں کی تذلیل کریں۔ حضرت حسن کے مکتوب گرامی میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ امانت اور حسن تدبیر سے دولت کو ادھر ادھر گھماتے رہنا چاہئے تاکہ اس پر ایک ہی طبقہ کی اجارہ داری نہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس اس خط میں امیر عادل کے اوصاف کو بتمام و کمال اشارۃ و عبارتہ واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ شرائط خلافت عماری خلیفہ اور اس کی شرعی حیثیت

شرائط خلافت عماری خلیفہ | ۹۵۔ جب حاکم شرائط خلافت سے بہرہ ور نہ ہو۔ مثلاً جبراً تخت خلافت پر براجمان ہو جائے اور ابتداءً مسلمانوں

نے اسے اپنی مرضی سے منتخب نہ کیا ہو جیسا کہ اصل دستور ہے یا بعد میں بھی اسے رستائے عامہ جاہل نہ ہوئی ہو جیسا کہ ائمہ ثلاثہ مالک شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا ارشاد ہے۔ ان کی عبارتیں قبل ازیں نقل کر دی گئیں ہیں۔

یا بقول جمہور خلیفہ قریشی نہ ہو۔ یا بیعت حریت فکر و ارادہ سے نہیں بلکہ تبرائی گئی ہو یا وہ عدالت کی حدود کو پیمانہ کیا ہو اندر میں احوال جمہور فقہاء کی رائے میں اس کی ولایت کو خلافت نبویہ قرار نہیں دیا جائیگا۔ البتہ یہ کہیں گے کہ یہ ایک دنیوی سلطنت ہے۔

اپنی وجوہات کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ یزید بن معاویہ خلیفہ نہیں تھا بلکہ ایک (عام قسم کا) بادشاہ تھا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

”اہل سنت کا اعتقاد ہے کہ یزید بزور شمشیر تخت حکومت پر متمکن ہوا تھا، وہ ایک عام قسم کا بادشاہ تھا جیسے عام سلاطین بزور حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔“

جاہل خلیفہ کی اطاعت کے بارے میں شرعی حکم | ۹۶۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایسے خلیفہ کی اطاعت ضروری ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب ایسا خلیفہ قبل ازیں موجود ہو جو شرائط خلافت کا جامع ہو۔ لوگوں نے بالفاق رائے اس کی بیعت بھی کر لی ہو تو بلاشبہ امام مرتضیٰ ہوتے کے اعتبار سے وہ واجب الاطاعت ہے۔ بخلاف ازیں جس نے بالجبر قبضہ کر کے قبضہ و کسریٰ کی حکومت قائم کر لی۔ وہ واجب القتل ہے۔ بشرطیکہ وہ حق کی طرف رجوع نہ کرے۔ عادل امیر کی تائید و توثیق اس آیت کی رو سے ضروری ہے۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ
اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا

اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم نبرد آزما ہوں تو
ان کے درمیان صلح کرادو۔

اگر اس کے سوا اور کوئی عادل خلیفہ موجود ہو۔ یا خوف و لاپرواہی کے پیش نظر پہلے امیر کی بیعت

تکمیل پذیر نہ ہوئی ہو تو شرائط خلافت سے عاری یا بادشاہ کی اطاعت واجب ہوگی پھر حضرت حسن بصریؒ
 خلفاء بنی امیہ کی اطاعت کے وجہ سے بارہ سو میں فرماتے ہیں :-

خلفاء بنی امیہ پانچ ایسے امور کو اپنے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے ہیں جن کے بغیر وہیں اسلام
 قائم ہی نہیں رہ سکتا ہے اور وہ یہ ہیں - (۱) نماز جمعہ (۲) نماز یا جماعت
 (۳) مال غنیمت (۴) ہلکی سرحدوں کا تحفظ (۵) حدود -

اگر یہ لوگوں پر ظلم کریں تب بھی ان کی اطاعت ضروری ہے۔ ان کی بدولت اصلاح
 زیادہ ہوتی ہے اور بگاڑ کم پیدا ہوتا ہے۔

مزید فرماتے ہیں :-

”ملوک بنی امیہ خواہ گھوڑوں کو چرائیں لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے رہیں اور یہ صرف
 اس لئے کہ وہ صرف معصیت خداوندی کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ تاہم اللہ تعالیٰ
 نے ہمیں ان کی اطاعت کا حکم دیا اور ان کی نافرمانی سے روکا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے
 یہ بھی حکم دیا ہے کہ ہم توبہ کر کے اور دعا مانگ کر ان کی معصیت کا ازالہ کریں۔“

۵۷ - علامہ ذرقانی نے شرح مؤطا میں امام مالک اور جمہور اہلسنت
 کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ظالم امام کی اطاعت اس پر خروج

کرنے سے بہتر ہے۔ علامہ ذرقانی بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت پر دو شئی ڈالنے ہوئے رقمطراز ہیں:

”امام عبد البر فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد ”وَأَنَّ لَنَا سَمَ الْوَصْرِ

أَهْلَهُ“ میں خلافت کے اہل سے اہل عدل و احسان اور اصحاب فاضل و دین مراد

ہیں ان کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ یہ وجوہ یہ خلافت کے اہل ہیں۔ فاضل و صاحب

لوگ صلاحیت خلافت سے محروم ہیں قرآن اس ضمن میں کہتا ہے ”لَا يَتَّخِذُ الْكٰفِرِيْنَ

الْاٰمِلِيْنَ“ اس کے برخلاف معتزلہ کے بعض فرقے اور جمہور خوارج یہ رائے

رکھتے ہیں کہ ظالم کی مخالفت کرنا چاہئے۔ اہل سنت کا قول ہے کہ امام ایک فاضل عادل

اور محسن شخصیت کو منتخب کرنا چاہئے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو ظالم امام کی اطاعت پر صبر

کرنا اس کے خلاف تبرا آنا ہونے سے بہتر ہے۔ ظالم خلیفہ کے خلاف بغاوت کرنے

کی صورت میں امن عالم تباہ ہو جاتا۔ فساد کا دور دورہ ہوتا اور ایک دو برس کے

مخلاف جنگ آزمائی شروع ہو جاتی ہے۔ ظالم پر یہ کہہ اس کے قسقی و غور اور ظلم و ستم

پر صبر کرنے سے بھی بڑی بات ہے۔ دین و عقل اور اصول پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ جب وہ مکروہات و ریشی ہوں تو مکروہۃً عظیمہ کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔

(شرح الموطا للزرقانی ج ۲ ص ۲۹۲)

امام احمد صراحتاً فرماتے ہیں جو روایتیں جو روایتیں کہ وقت صبر کرنا واجب اور خروج ممنوع ہے اس ضمن میں آپ سے یہ الفاظ منقول ہیں:-

”سلطان ظالم ہو یا عادل اس کے ظلم پر صبر کرنا چاہئے اور تلوار لے کر امر اور

خروج نہیں کرنا چاہئے۔ اگرچہ وہ ظالم ہی ہوں“ (المناقب لابن الجوزی ص ۶۷)

۹۸۔ اکثر اہل سنت امام مالک،

ظالم خلیفہ کی اطاعت میں علماء کے مذاہب

شاہی اور احمد سے یہ منقول ہے۔ اس

کے برخلاف شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو عادل سمجھ کر خلیفہ منتخب کیا جائے اور سب مسلمان اس کے انتخاب میں شریک ہوں تو اس کی اطاعت کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اطاعت واجب ہے اور وہ باقی رہے گی۔ جمہور کے نزدیک مسلک راجح یہی ہے۔ اس کے برعکس بعض علماء کا خیال ہے کہ اس کی بیعت ٹوٹ جائے گی۔ اس کی اطاعت بھی ضروری نہیں۔ یہ غیر جمہور فقہاء کی رائے ہے۔

جو خلیفہ آزادگی رائے سے نہیں بلکہ بالجبر انتخاب کیا جائے اس کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:-

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ ایسے خلیفہ کے جمیع اوامر مردود ہیں۔ جسکی یا پدی کسی بات میں بھی اس کی طاعت درست نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیعت ابھی مکمل نہیں نظر میں وہ ظالم ہے۔ لہذا اگر نیکی میں بھی اس کی اطاعت کی جائے تو وہ گویا ظلم کا اقرار اور اس کی تائید ہوگی۔ یہ رائے خوارج کے نظریہ سے ملتی جلتی ہے۔ اس لئے اہل سنت نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ صرف بعض لوگوں نے اس کی تائید کی ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ حتیٰ میں اس کی تائید کی جائے اور معصیت میں نہیں جیسا کہ حدیث نبوی میں وارد ہے ”لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق“ یہ قول اولیٰ و افضل ہے۔ اکثر علماء اسی کے قائل ہیں۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر بلا انتخاب مستداً تقدیر کو سنبھالنے والا امارت و خلافت کے منصب پر قابض ہو تو نیک کاموں میں اس کی اطاعت کی جائے گی اور معصیت خداوندی

میں نہیں اور اگر وہ منصبِ امامت پر قابض نہ ہو بلکہ کسی اور عہدہ پر از خود براجمان ہو جائے تو حق و عدل میں بھی اس کی اطاعت ضروری نہیں۔

علماء کے نزدیک اس بات میں فرق ہے کہ ایک شخص مسندِ خلافت پر جبراً متمکن ہو اور دوسرا کسی نچلے منصب پر بدولِ اجازت و استحقاق قابض ہو جائے۔ وہ بترق و امتیاز یہ ہے کہ خلافت پر قابض ہونے والے کو فتنہ انگیزی کے بغیر تحتِ خلافت سے اتارنا ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ فتنہ گری میں اتار کی پھیل جاتی ہے اور اتار کی ایک لمحہ میں ایسے فسادات کو جنم دیتی ہے جو سالہا سال میں بھی رونما نہیں ہوتے۔ البتہ نچلے عہدہ والے کو فتنہ خیزی کے بغیر بھی معزول کر سکتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ امام و خلیفہ سے مدد طلب کر کے اسے معزول کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں سرے سے کوئی اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مسلک معنی برتوسط و اعتدال ہے۔ ”وہ یہ ہے کہ عادل ہونے کی صورت میں اس کی اطاعت ضروری ہے۔ اگر ظالم ہو تو اس کی نافرمانی کی جائے گی۔ تمام مسلمان اس امر میں یک زبان ہیں کہ جس بات میں خدا کی نافرمانی ہوتی ہو اس میں مخلوق کی اطاعت روا نہیں۔ مسلمانوں کا اختلاف صرف اس صورت میں ہے۔ جب خلیفہ حق و عدل کے تقاضوں کا پابند ہو۔“

(منہاج السنۃ ج ۱ ص ۷۶، ۷۷)

علماء کے مذاہب کا خلاصہ | ۹۹۔ علماء کے ان بیانات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خلافت نبوت میں خلیفہ واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

ایسا خلیفہ جب منتخب ہونے کے بعد فسق و فجور پر اتر آئے تو اس کی خلافت خلافت نبویہ نہیں رہتی بلکہ اس کی حیثیت ایک ظالم بادشاہ کی ہوتی ہے اور یوں ہوتا ہے کہ گویا وہ منتخب ہی نہیں ہوا۔ جمہور علماء و خلافت نبویہ کے بارے میں ان تین امور میں متحد الخیال چلے آتے ہیں۔

۱۔ اس پر خروج جائز نہیں۔ اس لئے کہ خروج کی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایسا فتنہ بپا ہو جس میں حق ضائع ہو کر رہ جائے اور حرص و ہوا کا دور دورہ ہو۔

۲۔ معصیتِ خداوندی میں خلیفہ کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ ہم قبیل ازین بنی کریم کا فرمان واجب الازعان نقل کر چکے ہیں کہ خلیفہ کی اطاعت رنج و راحت میں ضروری ہے۔ مگر وہ خدا کی نافرمانی کا حکم دے تو اندریں صورت اس کی بات نہ سنی جائے گی۔ اور نہ

مانی جائے گی۔

۲۔ ظالم حاکم کے روبرو کلمہ حق کہنا واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔
 ”خیر خواہی و ہمدردی کا دوسرا نام دین اسلام ہے۔ صحابہ نے دریافت کیا حضور!
 کس سے ہمدردی؟ فرمایا اللہ تعالیٰ سے۔ رسول علیہ السلام سے اور ائمہ اسلام سے۔“
 آپ نے مزید فرمایا۔ ”ظالم حاکم کے روبرو حق کی بات کہنا افضل الجہاد ہے۔“

جب کوئی شخص حق بیانی کی توفیق سے محروم ہو تو دل میں اُسے بُرا محسوس کرے
 اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت نے
 فرمایا (میرے بعد) بہت سے امراء معرض ظہور میں آئیں گے۔ ان کے اعمال اچھے بھی ہوں گے
 اور بُرے بھی۔ جو شخص اچھے اعمال کو بنظر استحسان دیکھے اور اعمالِ قبیہ کو بنظر نفرت و حقارت
 ایسا شخص پُچ گیا۔ مگر جس شخص نے ان کے اعمالِ قبیہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور خود
 ہی اسی ڈگر پر چلا تو وہ ہلاک ہوا۔ صحابہ نے دریافت کیا۔ ”کیا ہم ان کے خلاف لڑ سکتے ہیں؟“
 آپ نے فرمایا۔ ”نہیں۔“

بخاری و مسلم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا تم میرے
 بعد دیکھو گے کہ اوروں کو تم پر توجیح دی جا رہی ہے اور کچھ دیگر امور بھی ہوں گے جن کو تم بنظر
 نفرت و حقارت دیکھو گے۔ صحابہ نے عرض کیا آپ ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟
 فرمایا جو حقوق تم پر واجب ہوں انہیں ادا کیجئے اور اپنے حقوق ان سے وصول کیجئے۔“
 آپ نے مزید فرمایا۔

”جو اپنے حاکم کو دیکھے کہ وہ کسی بُری بات کا ارتکاب کر رہا ہے تو اس پر نفرت
 و خفدت کا اظہار کرے۔ مگر اس کی اطاعت کے دائرہ سے باہر نہ نکلے۔“

اے اللہ راعی و رعایا کے حالات کی اصلاح فرما۔

مسلمانوں کے امور ایسے حکام کو تفویض فرما جو تو ہی
 رہنماؤں کی اطاعت کا جذبہ و دلچسپی فرما۔

چلے آتے ہیں۔

- ۱۔ اس پر خروج جائز نہیں۔ اس لئے نہ
- کہ ایسا فتنہ بپا ہو جس میں حق ضائع ہو کر رہ جا۔
- ۲۔ معصیتِ خداوندی میں خلیفہ کی اطاعت نہیں کی جا
- واجب الاذعان نقل کر چکے ہیں کہ خلیفہ کی اطاعت
- وہ خدا کی نافرمانی کا حکم دے تو اندریں صورت اس

جلد دوم

انتقادی مذاہب

۱۸۔ اعتقادی مذاہب

تمہید ۱۔ اولین ہاجرین و انصار اور تابعین قرآن کریم کے چشمہ صافی سے اپنے عقائد اخذ کیا کرتے تھے۔ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ ذات باری تعالیٰ کن صفات حسنہ کی جامع اور کن نقائص و عیوب سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اعتقادی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ علامہ مقریزی اپنی کتاب الخطط میں رقمطراز ہیں۔

”جب خداوند تعالیٰ نے عربوں میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت و رسالت سے مشرف کر کے سب لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تو اپنی نازل کردہ کتاب عزیز میں اپنے اوصاف بھی بیان کر دیئے عرب نبی کریم سے شرعی احکام مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ اور دیگر اوامر و نواہی کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے مگر کسی دیہاتی یا شہری عرب نے صفات باری تعالیٰ کے متعلق آپ سے کبھی سوال نہیں کیا۔ اسی طرح وہ آپ سے روز قیامت اور دوزخ و جنت کے احوال پوچھتے مگر خداوندی صفات کے بارے

میں خاموش رہتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح وہ حلال و حرام ترغیب و ترہیب احوال قیامت اور حالات ملاحم (لڑائیاں) و فتن کے بارے میں آپ سے دریافت کیا کرتے تھے اور احادیث نبویہ میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر کبھی انہوں نے صفات باری سے متعلق آپ سے دریافت کیا ہوتا تو کتب حدیث میں اس کا پایا جان ضروری تھا۔ جو شخص کتب حدیث پر نظر غائر رکھتا اور آثارِ سلفہ سے بخوبی آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ صحابہ نے کثرت تعداد اور اختلاف طبقات کے باوجود بطریق صحیح یا سقیم صفات باری تعالیٰ میں کوئی روایت ذکر نہیں کی۔ بخلاف ازیں وہ صفات خداوندی سے آشنا تھے مگر دانستہ ان کے ذکر و بیان سے خاموش رہا کرتے تھے صحابہ کے یہاں یہ فرق و امتیاز بھی مفقود تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات کو کسی میں اور فعلی کو کسی صحابہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفات ازلیہ مثلاً علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام، جلال و اکرام، وجود و انعام اور عزت و عظمت کا اثبات کرتے تھے۔“

علامہ مقریزی کے قول پر تبصرہ ۲۔ یہ ہے علامہ مقریزی کا بیان! یہ صحابہ کبار، ہاجرین

انصار ان کے اتباع صادقین پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ البتہ دوسرے لوگوں سے ایسے سوالات منقول ہو کر ہم تک پہنچے ہیں جو فتنہ پروری کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا حال اس آیت میں بیان کیا ہے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَزِيحٌ
فَيَتَّبِعُونَ مَا تُثَابِتُهُ مِنْهُ
ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ۔

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ
فتنہ سامانی کے لئے متشابہات کی
پیروی کرتے ہیں۔

اس دور میں جو مسئلہ بڑے زور سے اٹھاؤہ تقدیر کا مسئلہ تھا۔

تقدیر کا مسئلہ | ایسے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر جو مسئلہ مناقشات کا موجب بنا
وہ تقدیر کا مسئلہ تھا۔ قدیم ادیان و مذاہب کے لوگ بھی اسی مسئلہ
میں الجھے رہتے تھے مشرک بھی تقدیر کے مسئلہ پر طبع آزمائی کرتے اور اسی کے بل بوتے پر اپنے
سے شرک کی ذمہ داری ٹال دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

”مشرک کہتے ہیں کہ اگر مشیت ایزدی شامل حال نہ ہوتی تو ہم اور ہم لوگ سے آباء مشرک
میں گرفتار نہ ہوتے اور نہ ہی کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ ان سے پہلے جو لوگ دنیا میں
آباد تھے انہوں نے بھی اسی طرح تکذیب سے کام لیا یہاں تک کہ عذاب میں گرفتار
ہوئے۔ ان سے کہئے کہ اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کریں۔ تم تو صرف ظن
کی پیروی کرتے اور اندازے لگاتے رہتے ہو۔“

فسر آوسی متذکرہ الصدق آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں :-

”آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مشرک افعال قلیوہ سے معذرت پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ
وہ سرے سے ان افعال کی قباحت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر وہ ان
کے نزدیک بڑے نیک کاموں میں داخل ہے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ بتوں کی پوجا تقرب
خداوندی کا ذریعہ ہے جن جانوروں کو وہ حرام ٹھہراتے تھے ان کے نزدیک ان کی
حرمت خدا کی نازل کردہ تھی۔ اس بات سے دراصل ان کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا
کہ جن افعال کا ارتکاب وہ کرتے ہیں وہ بالکل حق و صداقت کے حامل ہر طرح جائز و مشروع
اور موجب رضائے ربانی ہیں وہ اس کی دلیل یہ دیتے تھے کہ ہم نے یہ افعال خدا کے ارادہ و
مشیت سے انجام دیئے ہیں اور مشیت خداوندی اس کے امر کے مترادف ہے۔ وہ کہتے

تھے خدا نے ہمیں ان کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے منطقیانہ انداز میں ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے شرک و تحریم کا کام خدا کی مشیت و ارادہ کے تحت انجام دیا ہے اور جو کام خدا کی مشیت سے کیا جائے وہ جائز اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ لہذا ہمارے سب کام مستحسن اور پسندیدہ ہیں۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مشرک مسئلہ تقدیر کو چھڑا کرتے اور اس سے نبی کریم کے خلاف احتجاج و استناد کیا کرتے تھے۔

تقدیر کے علاوہ دیگر مسائل | ۴۔ جو لوگ قدیم مذاہب و ادیان سے متاثر تھے وہ ان خصوصیات کے زمانہ میں کچھ دیگر مسائل بھی چھڑا کرتے تھے۔

علامہ شہرستانی الملل والنحل میں ارقام فرماتے ہیں :-

”ذرا اس گروہ کا حال دیکھیے جو صفات باری تعالیٰ میں الجھ کر خدا کی ذات کے بارے میں جدل و بحث سے کام لیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ انہیں اس امر متنبہ سے روکتے اور ڈراتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ
بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ
فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْحَالِ“

وہ (اوپر سے) کونک بھرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس کی زد میں لے آتا ہے اور وہ دکھ کر تو ذات باری تعالیٰ کے بارے میں ہی جھگڑتے رہتے ہیں حالانکہ وہ بڑا ضائقہ و اقتدار ہے۔

یہ نبی کریم کے زمانہ میں ہو رہا تھا حالانکہ آپ قوت و شوکت اور بدنی صحت سے بہرہ ور تھے۔ منافق آپ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے۔ بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے اور باطن کافر کے کافر ہوتے۔ جب منافق نبی کریم کے حرکات و سکنات پر معترض ہوتے تو اس سے ان کے نفاق کا راز پوشت از یام ہو جاتا گویا ان کے اعتراضات کے شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی۔“

ان مسائل کی نوعیت کچھ بھی ہو بلاشبہ ان میں سے بڑا مسئلہ تقدیر کا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر پر ایمان لانے کو واجب قرار دیا۔ مگر ساتھ ہی اس میں غور فکر کرتے سے روک دیا۔ حدیث جبرئیل میں مذکور ہے کہ انہوں (جبرئیل) نے آنحضرت سے ان کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا کہ ایمان کا مقصد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں



تنبولوں، رسولوں روزِ آخرت اور اچھی یا بُری تقدیر کو تسلیم کریں۔

تقدیر کا اقرار بھی گویا ایک طرح سے خدا کی ذات پر ایمان و ایقان اور اس کے عالم الاشیاء ہونے پر یقین رکھنے کے مترادف ہے۔ تقدیر پر ایمان لانے والا اس حقیقتِ مسلمہ کا اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق روزِ آخرت ہی سے ہر چیز کو لکھ لیا تھا۔ یہی وہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تقدیر پر ایمان لانے کی ترغیب دیا کرتے تھے مگر اس میں زیادہ سوچ بچار کرنے سے روکا کرتے تھے۔ کیونکہ تقدیر میں زیادہ غور و غوض کرنا ایسا اوقاتِ تعزیش کا موجب ہو جاتا ہے اور فہمِ انسانی صناعات کی دادی میں جا گرتا ہے۔ عقل اس میں حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ اس سے لازمی طور پر تفرقہ بازی اور گروہ بندی کی بنیاد پڑتی ہے۔ تقدیر میں تفکر و تدبیر اس لئے بھی روا نہیں کہ اس میں بحث و جدل کرنے والے کے پاس دوسرے کو مطمئن کرنے کا سامان بالکل نہیں ہوتا نہ ہی اس کے پاس ایسے عقلی دلائل ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ اختلاف کو ختم کر کے قطعی حجت و برہان قائم کر سکے۔

آنحضور کا وصال اور دیگر ادیانِ مذاہب کے مسلمانوں کا اختلاط | جب آنحضور

راہی عالمِ بقا ہوئے اور مسلمانوں کو قدیم مذاہب و ادیان کے لوگوں سے گھلنے ملنے کا اتفاق ہوا تو ان میں کچھ ایسے لوگ بھی نظر آئے جو تقدیر کو مانتے تھے کچھ ایسے بھی تھے جو منکرِ تقدیر تھے۔ ایسے حالات میں مناقشات کا ظہور ہوا اور وہ بات نہ رہی جو آپ نے تقدیر میں عدمِ تفکر کے بارے میں ارشاد فرمائی تھی۔ روایات میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک چور کو لایا گیا۔ آپ نے پوچھا: "تم نے چوری کیوں کی؟" چور بولا: "خدا کا فیصلہ ہی تھا۔" آپ نے اس پر حد نافذ کر دی اور مزید کچھ دتے لگائے۔ جب حضرت عمر سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا: "اس کا ہاتھ تو چوری کے جرم میں کاٹا گیا اور دتے خدا پر دروغ گوئی کرنے کے جرم میں لگائے گئے۔"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایمان یا تقدیر کا عقیدہ حذر و احتیاط کے منافی ہے۔ حضرت عمر نے جب ایک طاغون زدہ شہر میں داخل ہوئے سے انکار کر دیا تو آپ سے کہا گیا: "کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں؟" حضرت عمر نے جواباً فرمایا:

”ہم خدا کی تقدیر سے بھاگے کہا اس کی تقدیر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔“

حضرت عمر کا اشارہ اس طرف تھا کہ خدا کی تقدیر ہر حالت میں انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔ ایمان بالقدر کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب سے قائلہ نہ اٹھایا جائے۔ اسباب بھی مقدر ہوتے ہیں۔ لہذا ان پر عمل پیرا ہونا از بس ناگزیر ہے۔ کیونکہ اسباب پر عمل کرنے ہی سے انسان مملکت بالاعمال ہوتا اور اور اشیاء کے عواقب و نتائج کو برداشت کرتا ہے۔

جن لوگوں نے خلیفہ شہید حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں عملی حصہ لیا تھا وہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے آپ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ جب آپ پر پتھر پھینکتے تھے تو کہتے اللہ تعالیٰ آپ کو پتھر مار رہا ہے۔ حضرت عثمان فرماتے ”تم جھوٹ کہتے ہو اگر خدا تعالیٰ پتھر مارتے تو اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا۔“

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے یہ خیالات فاسدہ قییم مذاہب کے لوگوں کے پیدا کردہ تھے۔

خلافت حضرت علی اور مسئلہ تقدیر

۴۔ تقدیر کا مسئلہ اٹھا تو اس کے ساتھ ہی ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ عقل پریشان ہو کر رہ گئی مسئلہ تقدیر مناظرات و مجادلات کا اٹھاٹھ بن کر رہ گیا۔ لوگوں میں عقلی و فلسفی کی طرح کے رجحانات پیدا ہو گئے۔ ان مناظرات سے ان کا فکری اور نفسی اضطراب بڑھتا ہی چلا گیا اور اس میں کوئی کمی پیدا نہ ہوئی۔ دین سے بے پیرہ لوگوں نے مسئلہ تقدیر کو اپنے اعمال قبیحہ کا عدا و قرار دیا اور ابا حیت مطلقہ کی راہ پر چلی کہ مشرکین اور مجوس کی طرح شرعی احکام و اعمال کی حد بندیوں سے آزاد ہو گئے۔

اس دور میں جب فتنہ پروری کا زور ہوتا تو مسئلہ تقدیر اور زیادہ ابھرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ نے حضرت علی کے عہد خلافت میں بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔

چنانچہ بیچ البلاغہ اور اس کی شرح از ابن ابی الحدید میں لکھا ہے :-

”ایک بوڑھے نے کھڑے ہو کر حضرت علی کی خدمت میں عرض کیا۔“

”آپ یہ بتائیے کہ آیا ہمارا یہ سفر تقدیر خداوندی کے مطابق تھا؟“

حضرت علی نے فرمایا:

”اس ذات حق کی قسم میں نے دانہ کو پھاڑ کر انگوریاں پیدا کیں اور سب روحوں کو جنم دیا

ہم جہاں سے بھی گذرے اور جس وادی میں بھی اترے خدا کی قضا و قدر سے اترے۔“

یہ سن کر بوڑھے نے کہا:-

”پھر مجھے اجر و ثواب کیونکر ملے گا؟“

حضرت علی نے فرمایا:

”بوڑھے چپ رہو! اس سفر میں اور اس سے لوٹنے میں تمہیں بڑا اجر ملے گا۔ تم کسی حالت میں بھی مجبور نہیں تھے۔ بلکہ یہ سفر تم نے اپنے ارادہ سے انجام دیا۔“

بوڑھا کہنے لگا:

”یہ کیونکر ممکن ہے کیونکہ ہم تو تقدیر کے چلانے سے چلے تھے؟“

حضرت علی نے فرمایا:

”شاید تمہارا خیال ہے کہ تقدیر کی بناء پر کوئی شخص مجبور ہو جایا کرتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو ثواب و عقاب و عفو و عید اور امر و نہی سب بے کار ہو کر رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نہ گنہگار کو ظلمت کر سکیں نہ نیکو کار کی تعریف کر سکیں، نہ نیک اعمال انجام دینے والا بدکار سے افضل ہو اور نہ ہی بدکار نیکو کار کی نسبت مذمت کا زیادہ مستحق ہو۔ جو بات آپ کہہ رہے ہیں یہ تو بتوں کے پرستار شکر شیطان شاہدانِ باطل حق و صواب سے بے بہرہ قدریہ کا مقولہ ہے جو اس امت کے مجوسی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں، ان میں بندہ مختار ہوتا ہے۔ اس نے برے کاموں سے اس لئے منع کیا کہ لوگ برے افعال سے بچ جائیں۔ اس نے انسانوں کو اعمال کا مکلف بتایا ہے مگر انہیں آسائیاں بھی دی ہیں وہ زبردستی اطاعت پر مجبور نہیں کرتا اور نہ ہی مغلوب کو عاصی قرار دیتا ہے۔ اس نے بے مقصد رسولوں کو دنیا میں نہیں بھیجا اور نہ ہی زمین و آسمان کو بے کار پیدا کیا۔ یہ تو کفار کا عقیدہ ہے اور کفار جہنمی ہیں۔“

بوڑھے نے پوچھا: وہ تقدیر کیا چیز ہے جس نے ہمیں چلنے پر مجبور کیا؟

حضرت علی نے فرمایا: ”تقدیر خدا کا امر ہے“ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:-

”وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتَهُ (خدا نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کیجئے)

یہ سن کر بوڑھا ہنسی خوشی چل دیا۔“

ابن ابی الحدید اور بشارت رضی نے یہ واقعہ حضرت علی سے نقل کیا ہے بشرطِ صحت

یہ روایت اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت علی کے عصر و عہد میں تقدیر کا مسئلہ اس قدر پھیل گیا

تھا کہ ظاہری نصوص پیش کر کے آپ نے لوگوں کو اس میں سوچ پیا کرنے سے روکا۔

کیا امر کا مرتکب | مسئلہ تقدیر کے علاوہ حضرت علی کے عہد خلافت میں مرتکب کیا

کا مسئلہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ خوارج نے واقعہ تحکیم کے بعد پیدا کیا تھا۔ خوارج تحکیم (حکم بنیانی) کو کبیرہ گناہ تصور کرتے تھے اور اس کا مرتکب ان کی نگاہ میں کافر تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے حضرت علی اور ان کے رفقاء کو کافر قرار دیا۔ اس سے یہ مسئلہ جاگ اٹھا کہ مرتکب کیا شرعی حکم کیا ہے؟ آیا وہ مومن ہے یا کافر نیز وہ ابدی جہنمی ہے یا اس کی مغفرت کی امید ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف روز افزوں رہا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ معتزلہ کے اہم ترین مسائل میں سے تھا اور اسی وجہ سے انہیں معتزلہ کہا جانے لگا۔

اموی خلافت میں سیاسی و فکری انتشار | ۸۔ جب اموی دور آیا اور سیاسی

اختلاف بڑھنے لگے تو سیاسی میدان فکری جدل و بحث کا آغاز ہوا جو سیاسی انتشار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے غذا پاتے اور قوت و زندگی حاصل کرتے رہے۔

۹۔ فلسفیانہ افکار و آراء

فلسفہ کا ظہور و شیوع | گنجل بن گنجل تو ان میں فلسفیانہ افکار سنم رواج پانا شروع کیا یہ اقوام فلسفہ کی بڑی قدردان تھیں۔ فارس کی طرح عراق میں بھی فلسفیانہ مدارس پائے جاتے تھے۔ بعض عربوں نے ان مدارس میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مثلاً حارث بن کلدہ اور اس کا بیٹا نصر اہنی مدارس کے تربیت یافتہ تھے۔ جب ان ممالک میں اسلام پھیلا تو ان ممالک میں بڑے بڑے فلسفہ دان لوگ موجود تھے بعض مسلمانوں کو بھی فلسفہ کی تعلیم دیتے تھے۔ ملک شام کے لوگ فلسفہ میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ ان علوم میں تمام قریش کی نسبت زیادہ مہارت رکھتا تھا۔ خالد کو علم طب و کیمیا سے خصوصی لگاؤ تھا اور ان کے بارے میں اس نے بہت کچھ تحریر کیا ہے جس سے اس کی علمی مہارت و بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ خالد نے ایک راہب مر یانس رومی سے یہ علوم سیکھے تھے۔ اس نے ان علوم پر تین ریپٹ لکھے ہیں۔ ایک رسالہ میں اس نے اپنے استاد کے حالات و واقعات قلمبند کئے ہیں اور لکھا ہے کہ اس نے کس طرح یہ علوم سیکھے اس نے اس ضمن میں چند اسرار و رموز کا بھی ذکر کیا ہے۔

فلسفیانہ افکار کے رواج پانے سے عوام کی بحث چھڑ گئی۔ بعض علماء نے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ آیا صفات خداوندی عین ذات ہیں یا غیر ذات؟ کیا کلام خدا کی صفت ہے؟ کیا قرآن کریم خدا کی مخلوق ہے یا نہیں؟ اس طرح بہت سے اختلافی موضوعات پیدا ہو گئے۔ پھر تقدیر کا مسئلہ چھڑا اور اس سے انسانی ارادہ کے مناقشات نے جنم لیا کہ کیا انسان فاعل مختار اور قادر علی الفعل ہے یا بے اختیار ہے اور اس پر کی مانند ہے جو بلا ارادہ ہوا کے نسخ اڑنے لگتا ہے۔ اسی طرح افکار و آراء کا یہ سلسلہ پیچم جاری و ساری رہا جس کے نتیجے میں علماء کی مختلف جماعتیں بن گئیں ہر جماعت کے مخصوص آراء و افکار ہوتے تھے وہ انہی بحثوں میں لگے رہتے اور اپنی تحقیق و جستجو کو اسی کے دائرہ میں محدود کر دیتے

تھے۔ اس سے مختلف اعتقادی مذاہب کی بنیاد پڑی۔

ہم اپنے قول کو پھر دہراتے ہیں کہ اعتقادی اختلاف عقیدہ کے جوہر و مغز میں نہیں ہوا تھا بلکہ یہ اختلاف ان فلسفیانہ مسائل میں تھا جن کا جوہر عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جوہری عقائد سے مراد خدا کی وحدانیت کا عقیدہ۔ رسولوں پر ایمان۔ روزِ آخرت پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مسائل و احکام لائے تھے وہ سب حاملِ صدق و صواب تھے۔ اختلافی مسائل کا مرکز و محور یہ امور تھے۔

(۱) جبر و اختیار کا مسئلہ

(۲) مرتکب کیا اثر اور اس کا شرعی حکم

(۳) قرآن کا مخلوق یا غیر مخلوق ہونا۔

مشہور اعتقادی مذاہب یہ تھے :-

جبریہ - معتزلہ - مرجئیہ - اشاعرہ - ماتریدیہ - حنابلہ

اب ہم ان اعتقادی مذاہب پر ایک ایک کر کے روشنی ڈالیں گے۔ لیکن زیادہ

تفصیل سے کام نہیں لیں گے۔

۲۰۔ فرقہ جبریہ

جبریہ کے افکار و عقائد | ۱۰۔ مسئلہ تقدیر انسانی ارادہ و قدرت کی حیثیت اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و قدرت کی حیثیت یہ وہ مسائل تھے جن پر اہل علم نے صحابہ کے عہد میں غور و توجہ شروع کر دیا تھا۔ علماء کا ایک فریق اس بات کا دعویٰ دار تھا کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں ہے اور جو افعال اس کی طرف بظاہر منسوب ہیں ان سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ اس مذہب کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ بندے سے افعال کی نفی کر کے انہیں ذاتِ خداوندی کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ کیونکہ بندہ میں استطاعت نہیں پائی جاتی وہ تو اپنے افعال میں مجبور محض ہے نہ اس میں قدرت پائی جاتی ہے نہ ارادہ اور نہ اختیار۔

اللہ تعالیٰ انسان میں افعال کو ایسے پیدا کر دیتا ہے جیسا کہ سب جمادات میں۔ مجازی طور پر وہ افعال انسان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جس طرح جمادات کی طرف۔ مثال کے طور پر دیکھئے آپ کہتے ہیں ”درخت پھل لایا“ ”پانی جاری ہوا“ ”پتھر نے حرکت کی“ ”آفتاب طلوع ہوا“ ”آسمان پر بادل چھا گئے“ ”بارش ہونے لگی“ ”زمین ہری بھری ہو گئی وغیرہ وغیرہ پس ثابت ہوا کہ جزا و سزا بھی ایک قسم کا جبر ہے۔ جب عقیدہ جبر ثابت ہو گیا تو تکلیف بالا اعمال بھی جبر ہے۔ محدث ابن حزم جبریہ کے زعم کے مطابق ان کے دلائل نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”جب ذاتِ باری تعالیٰ فعال ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کوئی چیز اس کی مشیل و نظیر نہیں تو دوسرا کوئی شخص فعال نہیں ہو سکتا۔ جبریہ کہتے ہیں افعال کی نسبت انسان کی طرف اسی طرح ہے جیسے تم کہو مَاتَ زَيْدٌ (زید مرگیا)۔ قَامَ الْبِنَاءُ (عمارت قائم ہو گئی) حالانکہ اسے خدا نے مارا اور عمارت بھی خدا نے قائم کی“

فرقہ جبریہ کا بانی کون ہے؟ | ۱۱۔ مورخین نے طول طویل بحثیں کی ہیں کہ اس فرقہ کا بانی کون تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ جو فرقہ خاص دھڑے کی صورت اختیار

کرے اس کے منہکان یہ فیصلہ کرنا بڑا دشوار ہے کہ اس کا اولین مؤسس کون ہے؟ لہذا اس فرقہ کا نقطہ آغاز معلوم کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے؟ لیکن ہم قطعی طور سے کہہ سکتے ہیں کہ

عقیدہ جبر اموی دور کے اوائل میں پھیلا پھولا اور اس نے آخری دور میں ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ اموی عہد کے دو جلیل القدر اہل علم کے دو خطوط ہمارے پیش نظر ہیں، جن کا ذکر مرتضیٰ نے اپنی کتاب المینہ والاہل میں کیا ہے۔

عبداللہ بن عباس کا خط = پہلا خط عبداللہ بن عباس کا ہے جس میں انہوں نے اہل شام کے جبریہ کو مخاطب کرتے ہوئے نظریہ جبر سے منع کیا۔ وہ لکھتے ہیں :-

”اما بعد تم دوسروں کو تقویٰ کا حکم دیتے ہو حالانکہ صاحب تقویٰ تمہاری وجہ سے گمراہ ہو گئے اور گنہگار تمہاری وجہ سے رونا ہوئے۔ اے اولاد منافقین! اور اے ظالموں کی پشت پناہی کرتے والو! تمہارے دم سے بدکاری کی سجدیں آباد ہیں تم سب خدا پر جھوٹ باندھتے والے ہو اور اپنے جرمِ اعلانیہ اس پر مقبوظ دیتے ہو۔“

حسن بصری کا خط :- دوسرا خط حسن بصری کا ہے جو انہوں نے بصرہ کے جبریہ کے نام لکھا تھا وہ کہتے ہیں۔

”جو شخص خدا اور اس کی قضاء و قدر پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے جو اپنے گناہوں کا بوجھ خدا پر ڈال دے وہ بھی کافر ہے۔ خدا کی اطاعت مجبوری کی وجہ سے نہیں کی جاتی اور نہ کسی سے مغلوب ہو کر اس کی نافرمانی کی جاتی ہے اس لئے کہ مالکِ حقیقی نے مالک بنا دیا ہے اور جو قدرت انسان میں پائی جاتی ہے وہ اسی کی ودیعت کردہ ہے اگر وہ نیک اعمال انجام دیں تو ان کے افعال میں مداخلت نہیں کرتا اور اگر معصیت کا ارتکاب کریں تو وہ ان کے افعال میں مداخلت ہو سکتا ہے اگر اس کی مشیت کا تقاضا ہو۔ جب وہ کچھ نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ انہیں خدا نے چھوڑ دیا ہے۔ اگر خدا مخلوقات کو اطاعت پر مجبور کر دیتا تو تو اب کو ساقط کر دیا ہوتا اور اگر جبراً گناہوں پر مجبور کرتا تو سزا کو موقوف کر دیتا اور اگر بے کار چھوڑ دیتا تو اس کی عدم قدرت کی دلیل ہوتی۔ بلکہ مخلوقات کے بارے میں اس کی خاص حیثیت ہے جسے اس نے ان سے پوشیدہ رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ نیک اعمال کریں تو یہ خدا کا احسان ہے اور اگر وہ معصیت کا شیوہ اختیار کریں تو اس کی محبت ان پر تمام ہو جاتی ہے۔“

یہ بیانات اس حقیقت کی آئینہ دار کی کرتے ہیں کہ عہد سلف میں جبر کا عقیدہ رکھنے والے لوگ موجود تھے حضرت ابن عباس اور حسن بصری نے ان کی تردید کی اور ان کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔

علی بن عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا۔ ابن عباس! یہاں ایک قوم ہے جس کا دعویٰ ہے کہ ہر چیز خدا کے ہاں سے آئی ہے اور خدا نے انہیں جبراً گناہوں پر لگا رکھا ہے۔ فرمایا "اگر مجھے پتہ چل گیا کہ ایسا کوئی آدمی یہاں موجود ہے تو میں اس کا گلا ایسا دبوچوں گا کہ اس کی روح نکل جائے۔ یہ نہ کہو کہ خدا نے گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کیا ہے۔ یہ کہنا بھی زیبا نہیں کہ خدا اس بات سے قطعی طور پر بے خبر ہے کہ بتدے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ (بحوالہ المنیۃ والال)

جبر کا عقیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے

۱۲۔ قبل ازیں بیان ہو چکا ہے کہ عقیدہ جبر عہد صحابہ میں پیدا ہوا بلکہ اس دور کے مشرکین بھی اس کے قائل تھے جیسا کہ ہم قرآن کریم کی آیت سے قبل ازیں واضح کر چکے ہیں اموی دور کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد میں اسے ایک مکمل مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی جس کے انصار و اعداؤں تھے جو اس کی طرف دعوت دیتے۔ درس و تدریس کے ذریعہ پھیلاتے اور اس کی وضاحت کرتے تھے۔

۱۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس کے اولین بانی بعض یہود تھے انہوں نے یہ مذہب مسلمانوں کو سکھایا جن سے اس کی نشرو اشاعت ہوئی۔

۲۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس نظریہ کا موجد جعد بن درہم تھا جو مسلمان تھا اس نے شام کے ایک یہودی سے یہ عقیدہ اخذ کیا اور اہل بصرہ میں اسے پھیلا دیا۔ پھر اس سے جہم بن صفوان نے سیکھا۔ کتاب شرح العیون میں جعد بن درہم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جعد بن درہم سے جہم بن صفوان نے وہ قول سیکھا جس کی طرف جہم منسوب ہیں"

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جعد نے یہ نظریہ ابان بن سہمان سے اور اس نے طاوت بن اعصم یہودی سے اخذ کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ یہودی ذہن کی پیداوار ہے اور آنحضرتؐ اور صحابہ کے زمانہ میں اس کا آغاز ہو چکا تھا کیونکہ طاوت نامی یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاصر تھا اور صحابہ کے زمانہ تک بقید حیات رہا۔

لیکن باہم ہم قطعی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس عقیدہ کی تخم ریزی یہود کے ذریعہ عمل میں آئی کیونکہ قبل ازیں یہ نظریات اہل فارس میں موجود تھے۔ لہذا یہ انہی مباحث میں سے ایک ہو گا جو نہ دشتی اور مانوی وغیرہ فرقوں میں عام طور سے رائج تھے۔ کتاب المنیۃ والال میں لکھتے ہیں:-

”حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فارس کا ایک شخص آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پر داندہ ہوا ”میں نے دیکھا ہے کہ اہل فارس اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو اپنے نکاح میں لاتے ہیں اور جب ان سے اس کی وجہ پوچھی جاتی ہے تو کہتے ہیں خدا کی تقدیر یونہی تھی۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ ”میری امت میں ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگا جو اس کا قائل ہوگا یہ میری امت کے نجومس ہونگے۔“

جہم بن صفوان | ۱۳۔ جہم بن صفوان نے اس مذہب کی بنا ڈالی اور سلسلہ اس کی طرف دعوت دیتا رہا۔ یہ خراسانی الاصل اور بنی راسب کے موالی میں سے تھا۔

یہ شریح بن عادت کا کاتب تھا۔ پھر اس نے شریح سے مل کر نصر بن سيار کے خلاف خروج کیا۔ مسلم بن احوتر مازنی نے بنی مروان کے آخری زمانہ میں اسے قتل کیا۔ اس نے خراسان کو اپنی دعوت کا مرکز و محور بنایا تھا۔ اس کے قتل کئے جانے کے بعد اس کے اتباع نہاوند میں مقیم تھے۔ پھر امام ابو منصور ماتریدی کا مسک ان بلاد کے دیگر مذاہب پر چھا گیا۔ اس کی تفصیلات ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

جہم بن صفوان کے عقائد | ۱۴۔ جہم صرف عقیدہ جبرائی کا پانی نہ تھا بلکہ مندرجہ ذیل عقائد رکھتا تھا:-

- ۱۔ جنت و دوزخ آخر فنا سے ہم کنار ہوں گے۔ کوئی چیز دائمی اور ابدی نہیں۔ قرآن میں جو مخلوق کا تذکرہ ہے اس سے مراد طول مدت اور بعد فنا ہے۔ دوام و بقا نہیں۔
- ۲۔ ایمان صرف معرفت کا نام ہے اور کفر صرف جہل کا۔ بنا بریں جو یہود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف سے باخبر تھے وہ مومن تھے۔ اسی طرح وہ مشرک جو کمال یقین و اذعان آنحضرت کے اوصاف سے منکر تھے وہ بھی ایمان سے بہرہ ور تھے۔ وہ یہ بھی کیا کرتا تھا کہ یقین و اذعان معرفت کے بعد پیدا ہوتا ہے جس معرفت کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ تصور ہی نہیں بلکہ وہ معرفت قویہ ہے جو تصدیق و اذعان کی موجب ہو۔
- ۳۔ وہ خدا کے کلام کو قدیم نہیں بلکہ حادث تصور کرتا تھا اور اسی بنا پر خلق قرآن کا قائل تھا۔
- ۴۔ وہ خدا کو اشیاء میں داخل نہیں سمجھتا تھا اور نہ یہ کہتا کہ خدا زندہ ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں خدا کو ان اوصاف سے متصف نہیں کرتا جن کا اطلاق حوادث پر ہو سکے۔
- ۵۔ وہ بروز قیامت دیدار خداوندی کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

جبریہ کے اعوان و انصاف | ۱۵۔ ویسے تو بہت سے لوگ ان خیالات میں جہم کے

زیادہ شہرت حاصل ہوئی نظریہ جبر تھا یعنی یہ کہ انسان مجبور محض ہے نہ اس کا کوئی ارادہ ہے۔ نہ قدرت ہے نہ فعل۔ اس کے علاوہ دیگر عقائد میں اور لوگ بھی ان کے ہمنوا تھے۔ مثلاً معتزلہ خلق قرآن اور صفت کلام کی نفی کے قائل تھے۔

سلف و خلف سب جبر کی تردید کے لئے آگے بڑھے۔ جیسا کہ قبل ازیں ہم حضرت ابن عباس اور حسن بصری کے خطوط نقل کر چکے ہیں۔ اسی طرح اکثر متکلمین اور محدثین و فقہاء عقیدہ جبر کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

۱۶۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شفاء العلیل میں جبری دستوں کے مابین ایک فرضی مناظرہ نقل کیا ہے

جس سے ان کا مقصود یہ بتانا ہے کہ عقیدہ جبر کیا چیز ہے اور جبریہ کس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ مناظرہ یہ ہے۔

جبری کہتا ہے: "عقیدہ توحید کی صحت اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے جب جبر کے عقیدہ کو تسلیم کیا جائے اس لئے کہ اگر ہم جبر کے نظریہ کو نظر انداز کر دیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کے سوا حوادث کا قائل کوئی اور بھی ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے تو افعال کو انجام دیتا ہے ورنہ نہیں یہ ایک ظاہری شرک ہے جس سے مخلصی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جبر کے عقیدہ کو تسلیم کر لیا جائے۔" سنی نے جواباً کہا:

"جبر کا نظریہ منافی توحید ہے، اور شرعی احکام دعوتِ رسل اور ثواب و عقاب سے بھی ٹکراتا ہے۔ اگر جبر کا نظریہ ثابت ہو جائے تو شرائع و احکام اوامر و نواہی اور ثواب و عقاب بیکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔"

جبری۔ "آپ کا یہ کہنا کہ نظریہ جبر امر و نہی اور ثواب و عقاب کے منافی ہے مجلّٰی تعجب نہیں کیونکہ لوگ پہلے سے ایسا کہتے چلے آئے ہیں۔ تعجب انہیں آپ کا یہ قول ہے کہ جبر کا عقیدہ توحید کے منافی ہے حالانکہ یہ عقیدہ توحید کا عظیم ترین مظہر ہے پھر اس کے منافی کیونکر ہو سکتا ہے۔" سنی۔ "جبر کا منافی توحید ہونا بڑی کھٹلی سی بات ہے اور شاید جبر و توحید میں اس سے زیادہ

تضاد پایا جاتا ہے جو امر و نہی اور عقیدہ حیر کے مابین موجود ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ عقیدہ توحید کا طیبہ میں بیان کیا گیا ہے۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“

مگر حیر اس کے منافی ہے جو منافقات و تضاد یہ ہے کہ ”اللہ“ اس ذات کو کہتے ہیں جو جمیع صدقات کمال کی جامع ہے اور بندے خوف ورجاء و زوریات و حاجات اور جملہ امور میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انبیاء کرام میں عقیدہ توحید کو لے کر بیٹھتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ صرف ذات واحد کے سامنے ہی جھکتا اور اظہار عجز و نیاز کرنا چاہئے۔ اس کی طاعات و مرضیات کو بجالانے میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا چاہئے اور سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرنا چاہئے۔ بندہ کو چاہئے کہ اپنے مطلوب و مقصود پر خدا کی مرضیات کو ترجیح دے۔ یہ تمام انبیاء کی دعوت کا خلاصہ ہے اور وہ اسی کی تبلیغ و اشاعت کے لئے دنیا میں سرگرم عمل رہے۔ اسی کا نام توحید ہے جس کے سوا اللہ تعالیٰ کسی اور دین کو قبول نہیں کرتے خواہ وہ لوگ قہیم زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں یا دور حاضر سے خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھی یہی حکم دیا۔ اپنی کتابوں میں بھی اس پر روشنی ڈالی اور بندوں کو بھی اس کی جانب متوجہ کیا۔ اسی کے پیش نظر ثواب و عقاب کا اہتمام کیا اور اسی کی تکمیل کے لئے شرائع و احکام کو مقرر کیا۔

اے حیر عقائد کو ملتے داتے انہما را خیال ہے کہ بندے میں نہ فعل کی قدرت پائی جاتی ہے نہ اس میں فعل کا کوئی نشان ہوتا ہے اور نہ وہ فعل کا مرکب ہوتا ہے۔ اس میں فعل کی قوت بھی نہیں پائی جاتی لہذا اس کو حکم دینا بھی ایسے ہے جیسے کسی نے بس انسان کو جو کچھ کرنے پر قادر ہی نہیں۔ بلکہ یہ ایسے کاموں کے انجام دینے پر ماہور ہے جن کی موجودات بار تعالیٰ ہے۔ یا یوں کہئے کہ خدا نے اسے ان کاموں کے انجام دینے کا حکم دیا ہے اور اسے ان کی ضد پر مجبور کیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ بندے کو اعمال کا مکلف و ماہور بنا کر خود ہی اپنے امور و افعال کی انجام دہی میں ہائل ہو بیٹھا اور اب بندے کو ان سے روکتا ہے اور بندہ کسی طرح بھی ان پر قادر نہیں۔ تم تو یہ کہتے ہو کہ بارگاہ ایزدی میں رسائی حاصل کرنا کسی طرح ممکن نہیں مجلسی گفت و مروت اور ذوق و شوق سے اس کا قرب حاصل نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ توحید کا مفہوم عابد و معبود کے باہمی رابطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ذات باری تعالیٰ محبوب و مورد نہیں ہے تو وہ اللہ ہی

نہیں ہوگا جس کی طرف قلوب انسانی شوق و محبت اور لفت و موذت کے ساتھ متوجہ ہوں
اسی طرح جب بندہ فاعل و عابد اور محبت نہ ہو تو وہ عبودیت کی صفت سے عاری ہو جائیگا۔
اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جبر کا نظریہ تسلیم کرنے اور اس کی محبت کو نہ ماننے سے توحید ضائع
ہو کر رہ جائے گی۔ تمہیں خود اعتراف ہے کہ خداوند تعالیٰ بندے کو ایسے افعال کا حکم دیتے
ہیں۔ جن کے انجام دینے پر وہ قادر نہیں ہے اور ایسے کاموں سے روکتے ہیں جن سے ٹوہ رک
نہیں سکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ بندے کے ناکردہ گناہوں پر اسے عذاب بھی دیتا ہے۔ یا
یوں کہتے کہ جو کام اس نے خود انجام دیئے تھے ان کی سزا بندے کو دیتا ہے۔

جبری عقیدہ کے ماننے والے ائم نے خود اقرار کیا ہے کہ اوامر کی عدم تعمیل اور منہیات
کے ارتکاب پر سزا دینا یونہی ہے جیسے کسی انسان کو اس جرم کی سزا دی جائے کہ وہ اڑ کر
آسمان تک کیوں نہ پہنچ گیا۔ یا اس نے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے منتقل کیوں نہ کر دیا۔ اور
دریاؤں کے پانی کو اپنی گزرگاہ پر بہتا ہوا کیوں چھوڑ دیا۔ یا بندے کو ایسے فعل پر سزا دی جائے
جس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مثلاً یہ کہ فلاں چیز کا فذلہا یا چھوٹا کیوں ہے؟ یا فلاں
چیز فلاں رنگ کی کس لئے ہے؟

اسے جبری ائم صراحتاً کہتے ہو کہ جس شخص نے ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کی نافرمانی نہیں کی وہ
اسے بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے اور یہ اس کی حکمت و رحمت کے منافی بھی نہیں
بلکہ جائز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ خود فرمائے کہ میں ایسا نہیں کرتا تو تم اسے تسلیم کرے کے لئے تیار
نہیں۔ تمہارا قول ہے کہ بندے کو اعمال کا نامورد مکلف بنانا اسی شرح ہے جیسے اپٹر خنہ
کو لکھنے پر مجبور کرنا۔ اور اپاہج و معذور شخص کو اٹھانے کی ترغیب دینا۔ اس کا مطلب یہ
ہے کہ تم جس شخص کو بھی اس عقیدہ کی دعوت دو گے۔ وہ خدا سے متنفر ہو جائے گا۔ اور
مقام تعجب یہ ہے کہ تم اپنے خیال کے مطابق اس عقیدہ سے توحید خداوندی کا پرچار
کر رہے ہو۔ حالانکہ اس سے توحید کا پودہ بیخ و بن سے اکل کر رہ جاتا ہے۔

عقیدہ جبر کا شرعی احکام کے منافی ہونا بھی بڑی کھلی ہوئی بات ہے بشرائع و احکام
اوامر و لوہی پر مبنی ہیں۔ یہ بات بڑی لغو ہے کہ حکم دینے والا (ذات خداوندی) اپنی
ذات کو ہی کسی کام کا حکم دیتا اور اپنی ذات کو ہی ارتکابِ فعل سے روکتا ہے۔ امر دہی
کا تعلق بندے کے فعل اور اس کی طاعت و معصیت سے ہے۔ جب بندہ افعال کو انجام

ہی نہیں دیتا (جیسا کہ جبر یہ کہتے ہیں) تو اس سے طاعت و معصیت کا صدور کیوں کر ہوگا۔ جب طاعت و معصیت سرے سے موجود ہی نہیں تو ثواب و عقاب کیوں کر ہوگا۔ نظریں اللہ تعالیٰ بروز قیامت بعض انسانوں کو جب نعمتوں سے نوازیں گے اور بعض کو سزا دیں گے تو یہ اُس کی قدرت و مشیت کا تقاضا ہوگا اس لئے نہیں کہ انہوں نے کچھ اچھے یا بُرے اعمال انجام دیئے تھے۔

جبر کا = "جب بندے سے کوئی حرکت صادر ہوتی ہے تو اس میں چار امکانات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ وہ حرکت بقدرتِ خداوندی صادر ہوتی ہے۔

۲۔ صرف بندے کی قدرت اس کی موجب ہے۔

۳۔ وہ فعل دونوں کی قدرت سے انجام پاتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ اور بندہ دونوں کی قدرت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

ان اقسام چارگانہ میں سے جو تھی قسم قطعی طور پر باطل ہے۔ اقسام سہگانہ میں سے ہر قسم کو علماء کا ایک گروہ درست تسلیم کرتا ہے۔ ہم (جبر یہ) قسم اول کے قائل ہیں۔ اسی کا نام جبر ہے۔ دوسری قسم کو صحیح تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بعض اشیاء بقدرتِ خداوندی سے خارج ہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ جملہ اشیاء پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس عیدِ ضعیف کو ان پر قائل تسلیم کیا گیا ہے۔ جن پر ذاتِ خداوندی قدرت نہیں رکھتی۔ اس عقیدہ کی بنا پر فرقہ قدریہ نے عقیدہ توحید کو ترک کر دیا اور مجوس کی طرح ہو گئے۔

اگر تیسری قسم کو درست تسلیم کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کی مجموعی

قدرت سے افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اس سے عبودیت کی شرکت لازم آتی ہے۔ اور

یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک فعل دو قاعلوں کے درمیان گھر گیا یا ایک مقدر کے دو قادر اور

ایک اثر کے دو مؤثر ہیں۔ اور یہ محالات ہیں۔ محال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دو مؤثر

جب مستقل طور پر ایک اثر پر جمع ہو جاتے ہیں تو اثر دونوں سے بے نیاتہ ہو جاتا ہے۔ اسے

کسی کی بھی ضرورت نہیں رہتی اس کے ساتھ ساتھ وہ دونوں کا محتاج بھی ہوتا ہے۔

لہذا اس سے لازم آیا کہ ایک ہی چیز دوسری کی محتاج بھی ہے اور اس سے بے نیاتہ

ہستی۔ شرعی دلائل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدرتِ خداوندی جمیع ممکنات کو حاوی ہے۔

وہ ذات ہوں صفات ہوں با افعال نیز یہ کہ کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ شرعی

دلائل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اپنی قدرت و ارادہ سے اپنے کام انجام دیتا ہے۔ یہ اس کے اپنے افعال ہوتے ہیں جن کی بنا پر عقلاً عرفاً اور شرعاً اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ جب افعال اچھے ہوں اور بُرے ہونے کی صورت میں اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ یہ فطرتِ خداوندی ہے جس پر اس نے بندوں کو پیدا کیا۔

دلیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک عینی مفعول کا صدور دو مستقل فاعلوں سے محال ہے اسی طرح ایک عینی اثر دو مستقل مؤثروں سے صادر نہیں ہو سکتا۔ دلیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کسی حادثہ کا محدث کے بغیر عالم وجود میں آنا محال ہے۔ اسی طرح وجہ تزیح کے بغیر کوئی چیز راجح نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ امور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانی عقول میں پہلے سے ثبت کر رکھے ہیں یہ ظاہر ہے کہ عقلی براہین و دلائل میں نہ تعارض و تناقض پیدا ہوتا ہے نہ یہ باہم متصادم ہوتے ہیں بلکہ سبھی پر عمل کیا جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے موید ہیں ان میں تعارض اس شخص کو نظر آتا ہے جس کی بصیرت کمزور ہو۔ اگرچہ وہ بڑا کثیر الکلام ہو اور اس کے ذہن میں شکوک و شبہات کی بھرمار ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ شکوک و اشکالات کے علاوہ علم ایک جداگانہ چیز ہے۔ اسی وجہ سے خصوم و اعداء کے مابین تناقضات پیدا ہوئے۔ مسئلہ زیر بحث کی اصلیت یہ ہے کہ بندہ اس قدرت و ارادہ سے حرکت کرتا ہے جو اللہ نے اسے تفویض کر رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جب بندے سے کسی فعل کو صادر کرنا چاہتے ہیں تو اس میں اس فعل کی قدرت اور اس کا داعیہ پیدا کر دیتے ہیں۔ اندریں صورت بندے کے فعل کو اس کی طرف اس طرح منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسے سبب کو مسبب کی طرف۔ اس کی نسبت قدرتِ خداوندی کی طرف اس طرح کی جاتی ہے جیسے مخلوق کی نسبت خالق کی جانب۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسے مقذور کا وقوع دو قادروں سے منع نہیں جس میں ایک کی قدرت دوسرے کی قدرت کا نتیجہ و اثر ہو۔ یہ سبب کا ایک جزو ہے اور دوسرے کی قدرت مستقل بالتاثر ہے۔ اسے "مقدورین" یا "قادرین" کے الفاظ سے تعبیر کرنا مبنی بر فساد و فریب ہے۔ کیونکہ اس سے یہ رہم پڑتا ہے کہ شاید دونوں قادر قدرت میں مساوی ہیں جس طرح تم کہتے ہو "یہ کپڑا دو آدمیوں کی ملکیت ہے۔" یا اس گھر کی ملکیت میں دو آدمی شریک ہیں۔ بات یہ ہے کہ مقذور قدرتِ حادثہ کے باعث اسی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے جیسے مسبب سبب کی بنا پر معرضِ ظہور میں آتا ہے۔ سبب و مسبب اور قائل و آلہ یہ سبب قدرتِ قدیمہ کے اثرات ہیں اور قدرتِ خداوندی تمام ممکنات پر حاوی

اور مشتمل ہے۔ حادث و مشیت ایزدی کے سوا کوئی چیز بھی اس کائناتِ ارضی میں مستقل بالذات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز اس کی مخلوق ہے اور اس کی قدرت و مشیت کی کمر بستہ ساز ہے۔ جو شخص ان حقائقِ ثابتہ کو تسلیم نہیں کرتا اسے اس بات کا اقرار کرنا چاہئے کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی خالق ہے یا یہ کہ اس کائناتِ ارضی میں ایسی مخلوق بھی ہے جس کا کوئی خالق نہیں۔“

جبری = ”منکرین تقدیر کی رائے میں کافر کی بھالت و صلاحت خدا کی پیدا کردہ اور اس کے ایجاد و اختیار سے وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محالات میں سے ہے۔ کیونکہ اس کے تسلیم کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا نے اس کے کفر کا ارادہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کام اپنی مرضی سے انجام دیا جائے اس میں قصد و ارادہ کا ہونا ضروری ہے۔ محالات میں سے ہے۔ اس لئے کہ کوئی عاقل بذاتِ خود صلاحت و بھالت کا ارادہ نہیں کرتا لہذا وہ اس کا فاعل اختیار ہی نہیں ہو سکتا۔“

سستی :- ”اے عقیدہ جبر کے معتقد! مقامِ تعجب ہے کہ تمہارے نزدیک کفر و ظلم کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اس کے عین بر خلاف تم کہتے ہو کہ خدا تعالیٰ یہ سب کام انجام دیتا ہے (یہ کھلا بھڑا تصادف ہے)۔“

تمہاری یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز ہے کہ کوئی عاقل اپنے لئے کفر و ظلم کو پس نہیں کرتا حالانکہ تم دیکھتے ہو کہ بہت سے لوگ حسد و بغض کی بناء پر حق آگاہ ہونے کے باوصف کفر و جہل کو اختیار کرتے۔ ان کے مقتضیات کی پیروی کرتے اور ہدایتِ رشد کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ طریقِ صلاحت پر رواں دواں رہتے اور راہِ ہدایت کو دانستہ ترک کر دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-

۱۔ ”جو بلا وجہ اس کائناتِ ارضی میں تکبر کرتے ہیں میں انہیں اپنی آیات سے پھیر دوں گا۔ وہ تمام آیات کو بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے اور راہِ ہدایت کو دیکھ کر اس پر چلنے کی کوشش نہیں کریں گے البتہ وہ سرکشی و بغاوت کی راہ کو دیکھ کر اس پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور ان سے عاقل ہیں۔“

۲۔ دوسری جگہ فرمایا : ”قوم ثمود نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔“

۳۔ قوم فرعون کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

”جب ہمارے واضح دلائل آگئے تو انہوں نے کہا یہ طاہر جادو ہے۔ انہوں نے لفتین رکھنے کے باوجود کبر و ظلم کی بناء پر ان سے انکار کر دیا“

۴۔ ایک اور مقام پر فرمایا :

”شیطان نے ان کے اعمال کو آراستہ کر دیا اور وہ خدا کی راہ سے روکنے لگے حالانکہ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے“

۵۔ نیز فرمایا۔

”انہیں معلوم تھا کہ جو اسے خرید لے گا آخرت سے اسے کچھ حصہ نہیں ملے گا۔“

۶۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

”ان کی یہ خرید کردہ چیز کس قدر بُری ہے کہ وہ اس حسد کی بناء پر خدا کے نازل کردہ

احکام سے انکار کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل سے بندوں پر احکام نازل کرتا ہے۔

۷۔ نیز فرمایا : ”تم اللہ کی آیات سے انکار کیوں کرتے ہو جب تم خود اس کے شاہد ہو۔“

۸۔ ارشاد ہوا۔

”اے اہل کتاب تم حق و باطل کو کیوں گٹھڑ کرتے اور اسے چھپاتے ہو جبکہ تم جانتے بھی ہو“

۹۔ فرمایا۔

”اے اہل کتاب تم خدا کی راہ سے کیوں روکتے ہو۔ تم ایمانداروں کو بگردی پر آمادہ کرنا چاہتے

ہو۔ حالانکہ تم (حق سے) آگاہ ہو۔

قرآن کریم میں ایسی بہت سی آیات ہیں۔ ان آیات میں یہ حقیقت الم نشرح کی گئی ہے

کہ کفار نے دانستہ کفر و ضلالت کو اختیار کیا تھا۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو

کفر و ضلالت کو رشد و ہدایت سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔

ابن قیم نے یہ مناظرہ تو ضیحاً اپنی کتاب ”شفاء العلیل فی مسائل التصناد والقدرة

والحکمة والتعلیل میں تحریر کیا ہے۔

۲۱۔ فرقہ قدریہ

۱۷۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے خلافت راشدہ کے اواخر اور اموی خلافت کے آغاز ہی میں قضا و قدر کے مسئلہ پر غور و خوض کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ ایک فریق نے غلو سے کام لیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ انسان میں افعال کا ارادہ سرے سے پایا ہی نہیں جاتا یہ جبر یہ تھے۔ دوسری جانب قدریہ نے مبالغہ آمیزی سے کام لیکر اس عقیدہ کا اظہار کیا کہ انسان سب کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے اور خدا کا اس سے کوئی تعلق نہیں معتزلہ بھی اس کے قائل تھے اگرچہ اس کے علاوہ وہ اور عقائد بھی رکھتے تھے اور یہ مسئلہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کو قدریہ سے ایک الگ فرقہ شمار کیا جاتا ہے اور وہ اس میں مدغم نہیں سمجھا جاتا۔

فرقہ قدریہ والے صرف اس مسئلہ کی حد تک آکر نہیں ٹھہر گئے تھے جو ان میں اور معتزلہ میں ماہر الاشرک تھا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ تقدیر خداوندی کی نفی کر لگے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ جب امور و حوادث وقوع میں آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو اسی وقت ان کا علم حاصل ہوتا ہے۔ منقول ہے کہ جب معبد بن خالد الجہنی نے جو قدریہ کا رئیس و رئیس تھا۔ سنا کہ بعض لوگ تقدیر کو خدا کی نافرمانی کا بہانہ بنا رہے ہیں تو اس نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا: ”تقدیر وغیرہ کچھ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو حوادث کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ وقوع میں آتے ہیں۔“

اس سے معبد کا اصلی مقصد ازلی علم و ارادہ کی نفی کرنا اور یہ ثابت کرنا تھا کہ انسانی افعال خلاق عالم کی قدرت کے دائرہ سے باہر ہیں۔

۱۸۔ بعض مورخین نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ منکر

قدریہ کی وجہ تسمیہ تقدیر ہونے کے باوجود انہیں قدریہ کیوں کہا جاتا ہے؟ بعض لوگوں کی رائے میں ہے ”برعکس نہند نام زنگی کا فوراً“ کے مصداق قدریہ کا نام ان کے عقیدہ کے برعکس رکھا گیا ہے۔

بعض کے نزدیک ان کو قدریہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا سے تقدیر کی نفی کر کے اسے بندے کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ہر چیز انسان کے لہادہ و قدرت کے تابع ہے۔ گویا ان کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ بعض مصنفین کی رائے ہے کہ یہ نام قدریہ کو ان کے مخالفین نے دیا تھا تاکہ انہیں حدیث نبوی کا مصداق قرار دیں۔ وہ حدیث یہ ہے :-

”الْقَدَرِيَّةُ هَجُوسٌ هَذِهِ الْأُمَّةُ“ (قدریہ اس امت کے مجوس ہیں۔)

پروفیسر شیخ مصطفیٰ صبری آفندی سابق شیخ الاسلام ترکی نے قدریہ سے موسوم کرنے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قدریہ کے عقائد مجوس کے خیالات سے قریبی مماثلت رکھتے تھے۔ مجوسی خیر کو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے اور شر کو شیطان کی جانب۔ قدریہ بھی خیر و شر کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیتے اور مجوس کی طرح خیر کو خدا کی طرف اور شر کو شیطان کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ شر کا ارادہ نہیں کرتا۔

قرۃ قدریہ کا بانی و مؤسس | ۱۹۔ مورخین نے اس ضمن میں بڑی بحثیں کی ہیں کہ اس عقیدہ کی دعوت سب سے پہلے کس نے دی اور کہاں دی؟

کس زمین میں یہ پودا لگا پھلا پھولا اور تناور درخت بن گیا؟ ہمارا خیال ہے کہ کسی عقیدہ کے متعلق بطریق یقین یہ معلوم کرنا کہ اس کا نقطہ آغاز کیسے بڑا دشوار کام ہے۔ اس عقیدہ کی بھی یہی حالت ہے۔

بعض مصنفین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ قرۃ قدریہ نے ان دنوں بصرہ میں جنم لیا جب وہاں مختلف افکار و آراء کے بارے میں بڑی معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں۔ سرزمین عراق ان مناقشات و مناقشات کی خصوصی رزمگاہ تھی۔ کتاب ”سرح العیون“ میں لکھا ہے :-

”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس شخص نے پہلے پہل تقدیر کے مسئلہ پر گفتگو کی وہ

پہلے نصرانی تھا پھر اسلام لایا اور بعد ازاں پھر نصرانی مذہب اختیار کر لیا۔ اس

سے بعد مجوسی اور غیلان و شقی نے یہ عقیدہ اخذ کیا۔“

یہ بیان اس امر کی بنا ہی ہے کہ انکار تقدیر کا نظریہ اسلام میں دوسرے

مذہب سے آیا اور مسلمانوں میں پھیل گیا اس کے داعی وہ لوگ تھے جو بظاہر اسلام کے دعویٰ ار

تھے اور بیاطن کافر تھے۔

۲۰۔ جن دو شخصوں نے نصرانی سے انکارِ تقدیر کا نظریہ اخذ کیا تھا۔ انہوں نے اسے خوب پھیلایا۔ معبدِ حبیبی عراق میں اس کی دعوت

دیتا رہا اور غیلان دمشق کے گرد و نواح میں اس کی اشاعت میں سرگرم عمل رہا۔

معبد کا فی عرصہ تک اس کی دعوت میں مشغول رہا یہاں تک کہ عبد الرحمن بن اشعث کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا اور معبد اس سے مل گیا۔ جب ابن اشعث نے شکست کھائی تو حجاج نے معبد کو اس بغاوت کا داعی و محرک سمجھ کر قتل کر دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معبد جب تک بقید حیات رہا ہر قسم میں برابر کا سہیم و شریک رہا۔

غیلان دمشقی نے ملک شام میں دعوت و تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے غیلان سے چھٹیر چھپاڑ کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ غیلان نے ان کے نام ایک خط لکھا جس میں ان کو عدل و انصاف پر کاربند رہنے کی ہدایت کی۔ غیلان نے لکھا:۔

”اے عمر! آپ کو اچھی طرح غور و فکر کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ آپ کو دین اسلام اس وقت بلاجب وہ مکرور اور خستہ ہو چکا تھا اور اس کے نشانات مٹ چکے تھے تو مردوں کے درمیان ایک مردہ کی طرح پڑا ہے۔ نہ ہمیں کوئی نشان دکھائی دیتا ہے جس کی پیروی تم کر سکو اور نہ آواز سنائی دیتی ہے جو تمہارے کام آئے۔“

سنت رسول مٹتی جا رہی اور بدعت زندہ ہو رہی ہے۔ عالم خوف کے مارے بول نہیں سکتے۔ بہلاء کو کوئی نصیحت کرنے والا نہیں، جس سے وہ کوئی بات پوچھ سکیں۔ امام کی وجہ سے امتیں ہلاک بھی ہوتی ہیں اور ساحلِ مراد سے بھی ہٹکنا ہوتی ہیں۔

اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کیسے امام ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

”وَجَعَلْنَا هُمَا رَمَّةً يَهْدُونَ بِأَهْرِنَا“
ہم نے انہیں امام بنایا ہے اور ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کو راہ دکھاتے ہیں۔

اس آیت میں امّہ ہدیٰ کا ذکر کیا گیا ہے اور اس میں ان کے اتباع بھی داخل ہیں

دوسرے امّہ کے بارے میں فرمایا:

”وَجَعَلْنَا هُمَا رَمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ“
ہم نے انہیں ایسے امام بنایا ہے جو دوزخ کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔

آپ کو ایسا دمی تو کوئی نہیں ملے گا جو یہ کہے کہ ”آگ کی طرف آؤ“، کیونکہ ایسے شخص کی پیروی تو کوئی بھی نہیں کرتا۔ دراصل آگ کی جانب دعوت دینے والے وہ لوگ ہیں جو گناہوں کی طرف بلاتے ہیں۔

اے عمر! کیا تو نے کوئی ایسا داتا آدمی دیکھا ہے جو کسی چیز کو بنا کر خود ہی اس کی ندمت کرتے لگے یا وہ چیز بتائے جو قابل ندمت ہو؟ یا جو فیصلہ اس نے کیا ہو اس پر سزا دینے لگے یا اس بات کا فیصلہ کرے جس پر خود ہی دوسروں کو سزا دے۔؟ کیا تم نے کوئی ایسا رحمدل بھی دیکھا ہے جو بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف دے؟ یا عبادت کرنے کے باوجود سزا دے؟ کیا تم نے کوئی ایسا عادل دیکھا ہے جو لوگوں کو ظلم پر آمادہ کرے؟ اور کبھی ایسا سچا آدمی بھی نظر سے گذرا جو لوگوں کو دروغ کوئی پرا بھاسے۔ میری یہ وضاحت و صراحت (اتمام حجت کے لئے) کافی ہے اور تمہارا اندھا پن بھی کچھ کم نہیں۔“
(المنیۃ والامل از مرتضیٰ)

یہ وہ خط ہے یا خط کا حصہ ہے جو غیلان نے عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام لکھا۔ کتب تاریخ میں مذکور ہے کہ خلیفہ عمر بن العزیز نے غیلان کو دعوت مناظرہ کی اور اس کے براہین و دلائل کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ غیلان یہ سن کر کہنے لگا۔
”امیر المؤمنین! میں جیسا کہ خدمت میں حاضر ہوا ڈگراہ تھا۔ آپ کی بدولت مجھے ہدایت نصیب ہوئی۔ میں اندھا تھا۔ آپ نے بینا کر دیا۔ میں جاہل تھا۔ آپ سے علم کی دولت پائی۔ بخدا اس کے بعد میں کبھی اپنے عقائد کی اشاعت نہیں کرونگا۔“

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد غیلان پھر قدری عقائد کی طرف دعوت دیتے لگا تھا۔ علامہ مرتضیٰ اپنی کتاب ”المنیۃ والامل“ میں لکھتے ہیں۔
”خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے غیلان کو مخاطب کر کے فرمایا:

”میں جن حالات سے دوچار ہوں ان میں میری امداد کیجئے۔“

غیلان نے کہا:-

”مجھے خزانوں کے فروخت کرنے اور اس تمام مال کو واپس کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو چہرا لوگوں سے وصول کیا گیا ہے۔“

عمر بن عبدالعزیز نے اس کی اجازت دے دی۔ غیلان ان خزانوں کو فروخت کرنا

رہا اور یوں کہتا رہا کہ "خیانت کار لوگوں کا مال لے لو، یہ دیکھو ا ظالموں کا مال و متاع
 آؤ ان لوگوں کے ساز و سامان کا انجام دیکھو جو آنحضرت کی سیرت و سنت کی پیروی کئے بغیر
 آپ کے جانشین بن بیٹھے تھے" (المینۃ والابل)

۲۱۔ جب عمر بن عبدالعزیز حجۃ اللہ علیہ
 کا انتقال ہو گیا تو غیلان نے از سر نو

پھر اپنے عقیدہ کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ ہشام بن عبدالملک اموی کے دورِ خلافت
 میں مذہبی فتنوں نے بڑا فروغ پایا۔ فارس و خراسان خصوصی طور سے ان مذہبی فرقوں کا
 ملجا و مسکن تھے۔ ہشام نے محسوس کیا کہ ان فرقوں کی وجہ سے اس کی خلافت کو خطرہ
 لاحق ہے چنانچہ اس نے ان ممالک میں پیدا ہونے والے ہر مذہب کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا
 ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ والی خراسان نے جعد بن درہم کو اس لئے قتل کر دیا تھا
 کہ وہ قرآن کو مخلوق کہتا تھا۔

اندریں حالات ہشام چاہتا تھا کہ غیلان کا پیچھا کر کے اسے اس عقیدہ کی تبلیغ و
 اشاعت سے روک دے مگر وہ بلا دلیل اسے قتل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان وجوہات
 کو پیش نظر ہشام نے غیلان دمشق کو فقیہ شام امام اوزاعی سے مناظرہ کرنے کی دعوت دی
 امام موصوف نے غیلان سے مناظرہ کر کے اسے خاموش کر دیا۔ یہ واقعہ "العقد الفرید"
 اور "سرح العیون" میں مذکور ہے۔ "محاسن المساعی فی مناقب ابی عمر الاوزاعی" کے مصنف
 نے اس مناظرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں اور بتایا کہ یہ مناظرہ فرقہ قدریہ کے ایک عالم کے
 ساتھ ہوا تھا۔ العقد الفرید اور سرح العیون کے بیانات سے آشکار ہوتا ہے کہ فرقہ قدریہ
 کا وہ عالم غیلان ہی تھا۔ کتاب محاسن المساعی کے بیان کے مطابق وہ مناظرہ اور
 اس کی تمہید یہ ہے۔

مناظرہ کی تمہید :- اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں ایک قدری فرقہ
 قدریہ سے تعلق رکھنے والا شخص تھا۔ ہشام نے اسے بلا کر کہا کہ "لوگ آپ کے بارے میں
 بہت چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "امیر المؤمنین ایجا ہے۔ آپ جسے چاہیں میرے ساتھ مناظرہ کرنے کے لئے
 بلا لیں۔ اگر وہ مجھ پر غالب آجائے تو جو سزا آپ چاہیں مجھے دلائیں۔"

ہشام نے کہا: ”آپ نے انصاف کی بات کہی“
چنانچہ خلیفہ ہشام نے امام اوزاعی کو بلایا۔ جب آپ تشریف لائے تو کہا: اے ابو عمر! اس قدری سے مناظرہ کیجئے۔“

امام اوزاعی نے غیلان سے مخاطب ہو کر کہا:
”اگر چاہیں تو آپ سے تین باتیں کہوں اور اگر چار کا ارادہ ہو تو چار، ورنہ صرف ایک بات پراکتفا کروں۔“
غیلان نے کہا: ”تین باتیں“

امام اوزاعی نے فرمایا: ”یہ بتائیے کہ خدا نے جن باتوں سے منع کیا ہے کیا پہلے ان کا بیصلہ کر رکھا ہے یا نہیں؟“
غیلان نے کہا: ”مجھے نہیں معلوم!“

اوزاعی نے کہا: ”یہ ایک بات ہوئی۔ اچھا! اب یہ بتائیے کہ کیا اللہ تعالیٰ کسی بات کا حکم دے کر اس میں حائل بھی ہو جاتا ہے؟“

غیلان نے کہا: ”یہ تو اور زیادہ مشکل بات ہے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“
اوزاعی نے کہا: ”امیر المؤمنین! یہ دوسری بات تھی۔ اچھا! اب یہ بتائیے کہ جن نیزوں کو خدا نے حرام قرار دیا ہے ان میں کسی کی مدد بھی کرتا ہے یا نہیں؟“

غیلان نے کہا: ”یہ پہلی دونوں باتوں سے زیادہ مشکل ہے مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔“
امام اوزاعی نے کہا: ”امیر المؤمنین تینوں باتیں پوری ہو گئیں۔“
یہ سن کر ہشام نے حکم دیا اور غیلان کی گردن اڑا دی گئی۔

پھر ہشام نے امام اوزاعی سے کہا ”ان تینوں باتوں کی وضاحت کیجئے۔“
امام اوزاعی نے کہا:

”امیر المؤمنین! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس بات سے روکتے ہیں، اسے انسانی تقدیر میں پہلے سے لکھ بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جنت کے ایک مخصوص درخت کا پھل کھانے سے منع کیا۔ اس کے پہلو بہ پہلو ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا کہ وہ یہ پھل کھائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہ پھل کھا لیا۔“

امیر المؤمنین! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ حکم دے کر اس میں حائل بھی ہو جاتے ہیں

اس کی مثال یہ ہے کہ ابلیس کو حکم دیا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرے۔ پھر خود ہی سجدے میں جا کر ہو گیا۔
امیر المؤمنین! کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو حرام قرار دے کر پھر ان کے استعمال
کرنے میں بندوں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ مثلاً مردار، خون اور خنزیر کو حرام ٹھہرایا پھر اضطرابی
صورت میں ان کی اجازت دے دی۔“

ہشام نے کہا: ”اچھا! یہ فرمائیے کہ آپ اس سے ایک بات کونسی کہنے والے تھے“

اوزاعی نے کہا:

”میں اس سے یہ پوچھتا کہ کیا خدا نے تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق پیدا کیا یا
خود چاہا؟ اس کے جواب میں وہ یہ کہتا کہ جیسا اُس نے خود چاہا۔ پھر میں اس سے پوچھتا
”کیا خدا تعالیٰ تمہیں تمہاری مرضی کے مطابق موت سے ہمکنار کرے گا یا اپنی مشیت کے مطابق
اس کے جواب میں وہ یہ کہتا: ”اپنی مرضی کے مطابق“

پھر میں اس سے پوچھتا: ”بعد از موت تم جہاں چاہو گے جاؤ گے یا جہاں خدا چاہے؟“
اس کے جواب میں وہ یہ کہتا کہ جہاں خدا چاہے۔

امیر المؤمنین! آپ خود غور فرمائیے کہ جب انسان اپنی تخلیق پر قادر نہیں نہ رزق میں
کر سکتا ہے۔ نہ اہل کو پیچھے بٹا سکتا ہے نہ حسب مرضی بعد از موت جنت یا دوزخ میں
سکتا ہے۔ تو پھر اس کے تصرف میں کونسا اختیار رہا۔

امیر المؤمنین! قدریہ کے نزدیک نہ خدا کا کلام کوئی وزن رکھتا ہے نہ انبیاء کے ارشاد
نہ اہل جنت و جہنم کی بات جیت، نہ فرشتوں کے اقوال اور نہ ان کے بھائی ابلیس ملعون کا قول
فرمان باری تعالیٰ ہے:-

۱- ”فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ
الصَّالِحِينَ“

اس کے رب نے اسے چن لیا اور نیکوں
میں شامل کر دیا۔

۲- فرشتوں کا قول ہے:-

لَا عَلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

ہمیں صرف اسی بات کا علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا۔

۳- انبیاء کا قول حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے:-

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
وَالْيُؤْتِيكَ

صرف خدا کی توفیق میرے شامل حال ہے میں
اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۴۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ
مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ

اگر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی نہ فرمائی
تو میں گمراہ قوم میں سے ہو جاؤں گا۔

۵۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا:

”وَلَا يَنْفَعُكُمْ نَصِيحِي اِنْ اَسْرَدْتُ
اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ“

اگر میں تمہیں نصیحت کرنا چاہوں تو میری
نصیحت سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

۶۔ اہل جنت نے کہا:

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ هَدَانَا لِهَذَا وَمَا
كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ“

خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں ہدایت فرمائی۔ اگر
وہ ہدایت نہ کرتا تو ہم راہِ حق کو اختیار نہ کر سکتے۔

۷۔ اہل جنت کا قول یہ ہے:

”مَرَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِي“

اے رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔

۲۲۔ یہ مناظرہ بشرطِ صحت — اور اس کی صحت کے مشتبہ
ہونے کی کوئی وجہ نہیں — اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ

کہ اس مناظرہ میں فریقین مساوی الدرجہ نہ تھے۔ ایک فریق سوال کرنے میں مطلق العنان تھا اس کے
برخلاف دوسرا فریق جواب تو دے سکتا تھا۔ مگر سوال کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اس کے لئے صرف ایک
راستہ کھلا تھا کہ سوالات کا جواب دے ورنہ اسے تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ واقعات اس بات کی
شہادت دیتے ہیں کہ غیلاں کو قتل کرنے کا فیصلہ پہلے سے صادر کیا جا چکا تھا۔ اس مناظرہ کا انعقاد
لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے تھا کہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کیا جائے۔ یہ
بات نہیں کہ مناظرہ قتل کا سبب و باعث تھا۔ جیسے کوئی حاکم حکم صادر کر دے اور پھر تنقید
حکم کے لئے شہادت سننے لگ جائے اس لئے نہیں کہ حکم صادر کیا جائے۔

علاوہ ازیں تمام سوالات ایک ہی نوعیت کے ہیں اور ابہام و ابہام میں ایک چیتان
اور مہتا سے کم نہیں۔ ابہام کی حد یہ ہے کہ ہشام بھی انہیں سمجھ نہ سکا۔ اگر خلیفہ
ہشام حق کا جو یا ہوتا تو قتل کرنے سے پہلے وہ ان سوالات کی وضاحت طلب کرتا۔ یہ
سوالات کیا تھے ان کو ایک پینلی ومیا کا لقب دینا ان کو سوال قرار دینے سے موزوں تر
ہے۔ بہر کیف! یہ مناظرہ نہ تھا بلکہ قتل کا جواز تلاش کرنے کا ایک بہانہ تھا جس کا فیصلہ

پہلے سے کیا جا چکا تھا۔

مناظرہ کی نوعیت و کیفیت کسی بھی ہو اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ امام اوزاعی علم قرآن کا بحر زخار تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبل از وقوع مناظرہ کی استعداد سے بہرہ ور تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے بر محل ایسی آیات سے استشہاد و استناد کیا جو بظاہر انکارِ توحید کے منافی ہیں۔

۲۳۔ خلیفہ ہشام نے یوں تو غیلان کو قتل کر دیا مگر سوال قدری مذہب کا خاتمہ یہ ہے کہ آیا اس کی موت سے قدری مذہب بھی مر گیا یا اس

بعد باقی رہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مذہب نہ مرا اور نہ کسی اور مذہب میں مدغم ہوا جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے وہ کہتے ہیں کہ قدری مذہب معتزلی افکار کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ مگر یہ نظریہ محل نظر ہے۔ یقیناً یہ ہے کہ قدری مذہب صدیوں تک بصرہ میں موجود رہا اور وہاں خوب پھلا پھولا۔ بعض کے نزدیک قدری مذہب نے ثنویہ عقائد کا لبادہ اوڑھ لیا۔ ثنویہ کہتے ہیں دنیا پر دو قوتیں حاکم ہیں ایک لوردوسری ظلمت۔ نور خیر کا مصدر و ماخذ ہے اور ظلمت شر کو جنم دیتی ہے۔ ثنویہ نیک اعمال کو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے اور افعالِ قبیحہ کو اپنے طرف۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ شر کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔

۲۴۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل" میں سنی اور

قدری کے مابین ایک فرضی مناظرہ ذکر کیا ہے جس میں ہر فریق اپنے نقطہ نظر کے اثبات میں لائق دیتا ہے۔ آخر کار فتح سنی کی ہوئی ہے ہم مناظرہ کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں۔

قدری :- "اللہ تعالیٰ نے اعمال کو بندوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ نسبت عام بھی ہے اور خاص بعض جگہ استطاعت کے نقطہ خیال سے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کیا۔ مثلاً فرمایا:

۱۔ "مَنْ كَسَبَتْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْجَحَ الْمُخْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ" | جو شخص تم میں سے پاکدامن اور مومن عورتوں کو نکاح کرنے کی وسعت نہ رکھتا ہو۔

بعض مقامات پر مشیت کے اعتبار سے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کیا۔ مثلاً فرمایا:

۲۔ "لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ" | تم میں سے جو سیدھا رہتا چاہے۔

کبھی ارادہ کی بنا پر جیسے خضر کا قول:

۳۔ فَادَّتْ أَنْ اَعِيْبَهَا۔ | میں نے اسے عیب دار کر دینا چاہا۔

کبھی فعل و کسب اور عننت کے اعتبار سے جیسے

۴۔ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ، " لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ "۔

۵۔ نسبت خاص سے مراد ایسے افعال کو بندوں کی طرف منسوب کرنا ہے۔ جیسے نماز۔ روزہ

حج۔ طہارت۔ زنا۔ سرقت۔ قتل۔ کذب۔ کفر۔ فسق اور دیگر افعال۔ ان افعال کو نہ صرف

ذات خداوندی کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور نہ عباد و معبود دونوں کی طرف

بمخلاف ازین ان کو صرف بندوں کی طرف منسوب کیا جائے گا اور خدا کی طرف نہیں۔

سستی:۔ تمہاری ان باتوں میں حق بھی ہے اور باطل بھی! بے شک افعال کی نسبت بندوں کی طرف

کرنا درست ہے۔ مگر یہ بات بکر و فریب پر مبنی ہے کہ افعال کو بندوں کی طرف منسوب

کرنے کی صورت میں ان کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی جاسکتی۔ اگر ان افعال کو خدا کی طرف

منسوب نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ نہیں۔ خدا کی ذات ان

کے ساتھ منصف بھی نہیں۔ نہ ان افعال کے احکام ذات واحد پر جاری ہو سکتے ہیں۔ اور

نہ ان افعال سے مشتق اسماء کا اطلاق ان پر درست ہے۔ تو یہ بات صحیح ہے اور یہ افعال

ان وجوہ و اعتبارات میں سے کسی وجہ کی بنا پر بھی اس کی طرف منسوب نہیں کئے جاسکتے۔

اگر افعال کو خدا کی ذات کی طرف منسوب نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ یہ اس کے علم و قدرت

مشیت عامہ اور تخلیق کی طرف بھی مضاف نہیں تو یہ سراسر باطل ہے۔ وجہ لبطلان یہ ہے

کہ افعال کا صدور خدا کے علم سے ہوتا ہے۔ اس نے قبل ازین انہیں مقدر کر رکھا ہے اور

وہی ان کا فائق ہے۔ ان کو بندوں کی طرف مضاف و منسوب کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ان

کی نسبت خدا کی طرف نہ کی جاسکے۔ مثلاً مال و متاع اور ساز و سامان کہ یہ خدا کا پیدا کردہ

اور اسی کی ملکیت ہے مگر اسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی طرح اعمال و

اموال خدا کے ملوک و مخلوق ہیں۔ حالانکہ وہ اسے بندوں کی طرف بھی منسوب کرنا ہے

اس کے باوجود کہ اسی نے بندوں کو ان کا مالک و عامل بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ

افعال کی نسبت عباد و معبود دونوں کی طرف صحیح ہے۔ مال بھی انسان کے کسب و ارادہ سے

اسی طرح حاصل ہوتا ہے جیسے اعمال۔ خداوند تعالیٰ اعمال و اموال کا بھی خالق ہے اور

ان کے کاسبین اور عاملین کا بھی۔ خلاصہ کلام بندوں کے اعمال و احوال اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دست تصرف میں ہیں جیسے انسانوں کی آنکھیں ان کے کان اور ان کی جانیں۔ خدا ہی نے انسانوں کو سمع و بصر اور قوت عمل سے بہرہ ور کیا اور انہیں یہ قوی مرحمت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عمل کے آلات و قوی کے دوش و بدوش نفس عمل سے بھی نوازا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قوت عمل کو بازو اور کلام کو زبان کی طرف اسی طرح منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسے قوت سامعہ کو کانوں اور قوت باصرہ کو آنکھوں کی جانب جس طرح رویت و سماعت کو ان کے محل (آنکھ اور کان) کی طرف مضاف و منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح کلام اور قوت اخذ و لفظ کی نسبت ان کے مصدر و ماخذ کی طرف کی جاتی ہے اگرچہ رویت و سماعت کو پیدا کرنے والا انسان بذات خود ہے۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ آیا قوی کے یہ مصادر و منابع قوی بنفسہا اور دیگر اسباب رویت و سماعت کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ یا یہ سب کچھ اس ذات واحد و قہار کی کرشمہ سازی ہے جو اس کائنات عالم کی تمام اشیاء کو عالم وجود میں لائی۔“

قدری :- ” اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کے افعال کا خالق ہوتا تو اس کے اسماء بھی ان افعال سے مشتق ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ نام تجویز کرنا اولیٰ و افضل ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کرمہ ارضی میں اختلاف ادیان و مذاہب اور فرق لغات و عادات کے باوصف ہر دانا شخص ”قائم“ کا اطلاق اسی شخص پر کرے گا جو فعل قیام کو انجام دے رہا ہو۔ ”اکل“ وہ ہے جو کھا رہا ہو اور ”سارق“ وہ ہے جو چوری کا ارتکاب کر رہا ہو۔ تمام افعال کی یہی حالت ہے مگر ہمارے فی الفین قوانین تقدیر نے بساط ہی الٹ دی اور حقائق کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ قوانین تقدیر کہتے ہیں کہ ان افعال کے فاعل حقیقی کے اسماء ان افعال سے مشتق نہیں ہونگے۔ اس کے برعکس ان لوگوں کے نام ان افعال سے اخذ کئے جائیں گے جنہوں نے ان کو انجام نہیں دیا۔ (یعنی انسان) یہ عقل و منطق اور عرف و لغت کی عین خلاف درزی ہے۔

مشتق :- ” بندہ حقیقہً اپنے افعال کا فاعل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے افعال اور ان کے ظاہری باطنی آلات کو پیدا کیا۔ باقی رہا اسماء کا مشتق کرنا تو یہ اس کے لئے مشتق کئے جاتے ہیں جو ان کا فاعل ہوتا ہے۔ مثلاً قائم۔ قائمہ۔ مصلیٰ۔ سابق اور زانی کے اسماء

کا اطلاق بندے پر کیا جائے گا۔ کیونکہ وہی یہ سارے کام انجام دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل کا قیام جب فاعل کے ساتھ ہوتا ہے تو اس کا حکم بھی فاعل ہی کی طرف لوٹتا ہے نہ کہ غیر کی طرف۔ اسی طرح فعل سے فاعل کے لئے نام اخذ کئے جاتے ہیں کسی اور کیلئے نہیں۔ دراصل یہاں چار امور ہیں دو معنوی (یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے حکم کی نفی اور اس کا اثبات) اور دو لفظی (یعنی نفی و اثبات میں بندے کی طرف حکم کا لوٹانا اور اس کے لئے نام مشتق کرنا)۔ جب اکل و شرب زنا و سرور کا قیام بندے کے ساتھ ہے تو ان کے احکام بھی اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور ان افعال سے اس کے لئے نام بھی اخذ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس نہ ان کے احکام اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاسکیں گے اور نہ اس کے اسماء ان سے مشتق ہوں گے۔ مگر کہاں سے لازم آیا کہ یہ افعال خدا کو بھی معلوم نہیں یا اس کے پیدا کردہ اور مقدر بھی نہیں۔

مدری :- ”اگر اللہ تعالیٰ افعال کا خالق ہوتا تو سب امور و افعال ذات باری تعالیٰ کے ساتھ والبتہ ہوتے۔“

نبی :- ”یہ بے بنیاد اور غلط دعویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندے میں جن افعال کو جنم دیا ہے ان سے خدا کے اسماء مشتق نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے احکام اس کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں۔ افعال سے انسان کے اسماء مشتق ہوں گے کیوں کہ افعال کا قیام انسان کے ساتھ ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تو لاتعداد اشیاء مثلاً رنگہائے مختلفہ خوردنی اشیاء اور حرکات و سکنات کو بھی پیدا کیا ہے مگر ان سے اس کے اسماء ماخوذ نہیں اور نہ ان کے احکام اس کی جانب لوٹتے ہیں۔ احکام کے لوٹنے سے مراد یہ بتانا ہے کہ وہ کھڑا ہوتا بیٹھتا کھاتا اور پیتا ہے۔“

امام ابن تیمیہ و ابن قیم کا زاویہ نگاہ | ۲۵۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ کا یہ بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ایک فرضی

مناظرہ کے ذریعہ اپنے محترم استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق اہل سنت کا نقطہ نگاہ واضح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ افعال العباد بندوں کی طرف منسوب ہوں گے اگرچہ ان کی خالق ذات باری تعالیٰ ہے اس لئے کہ اسی نے بندوں میں قوت فاعلہ کی تخلیق کی۔ بندہ بذات خود افعال کا مباشر و فاعل ہوتا ہے۔

اس سے یہ بات صاف ہو گئی کہ افعالِ مشبوبہ کے ساتھ انسان کا علاقہ اسی قسم کا ہے جیسے خدا کی پیدا کردہ اشیاء کے ساتھ اس کا ربط و تعلق انسان خدا کی ودیعت کردہ قوت کے ساتھ افعال کو انجام دیتا ہے براہِ راست نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ابنِ قیم کی نگاہ میں اس مسئلہ میں امام ابو الحسن اشعری کی رائے مسلکِ اہل سنت کی ترجمانی نہیں کرتی، بلکہ ابنِ قیم ان کو جبریہ قرار دیتے ہیں۔ آگے چل کر ہم اس ضمن میں اہل سنت کا مسلک بیان کریں گے۔

۲۲۔ فرقہ مرحبہ

مرحبہ کا آغاز ظہور | ۲۶۔ یہ فرقہ اس دور کی پیداوار ہے جب مسلمانوں میں مرتکب کبائر کا مسئلہ چھڑا۔ کہ آیا وہ مومن ہے یا غیر مومن؟ خوارج اسے کافر قرار دیتے تھے۔ معتزلہ کہتے تھے اسے مومن تو نہیں البتہ مسلم کہہ سکتے ہیں جس بھری اور تابعین کا ایک گروہ اسے منافی تصور کرتا تھا۔ اس لئے کہ اعمال قلب انسانی کا مظہر ہیں۔ زبان سے ایمان کا تپہ نہیں چلتا۔ جمہور مسلمین کہتے تھے کہ وہ گنہگار مومن ہے، اس کا معاملہ خدا کی سپرد ہے۔ اگر چاہے اسے عذاب دے اور اگر چاہے معاف کر دے اپنی اختلافات کے دوران اس فرقہ نے بیانگ دہل یہ اعلان کرنا شروع کیا کہ ایمان کے ہوتے ہوئے گناہ سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا جس طرح کفر کی موجودگی میں طاعات و عبادات بے اثر ہیں۔ بعض مرحبہ یہ بھی کہتے تھے کہ مرتکب کبائر کا معاملہ خدا کو تفویض کر دیا جائے گا۔ یہ بڑی حد تک جمہور اہل سنت کے ہمنوا تھے۔ بلکہ زیادہ چھان بین کرنے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ان کے اور جمہور کے افکار و آراء میں کوئی فرق ہی نہیں۔

خلافت عثمانی میں قتلہ خیزی | ۲۷۔ عہد صحابہ میں سب سے پہلے حضرت عثمان کے آخری عہد میں اس فرقہ کی تخم کاری ہوئی۔ حضرت عثمان اور ان کے عمال حکومت کے بارے میں جب تمام بلاد اسلامیہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں جو ان کی شہادت پر منتج ہوئیں تو صحابہ کی ایک جماعت نے اس سلسلہ میں کامل خاموشی اختیار کر لی اور اپنا دامن کلیتہً ان فتنوں سے بچائے رکھا۔ جسکی رلیٹ میں تمام مسلمان اچکے تھے صحابہ کی یہ جماعت اس ضمن میں حضرت ابو بکر سے مروی اس حدیث پر عمل پیرا تھی۔ انھوں نے فرمایا۔

”بہت بڑے فتنوں کا دور دورہ ہوگا۔ ان میں بیٹھ رہنے والا چلنے والے سے ادا چلنے والا بھاگنے والے سے بہتر رہے گا۔ جب یہ فتنے رونا ہو جائیں تو اونٹوں والا اپنے اونٹوں میں چلا جائے۔ جس کے پاس بکریوں کا ریوڑ ہو وہ ان کی دیکھ بھال میں لگ جائے اور زمیندار زمین کی نگرانی میں مہمک ہو جائے۔ ایک شخص بولا۔

یا حضرت! جس کے پاس نہ اونٹ ہو نہ بکری اور نہ زمین اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا! اپنی تلوار کا رخ کرے اور پتھر پر ناکر اس کی دھار توڑ ڈالے اور اس طرح ممکن حد تک فتنوں سے دور رہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹)

صحابہ کی یہ جماعت ان فتنوں سے کلیتہً الگ تھلگ رہی جو عہد عثمان میں رُدن ہوئے اور ان کی شہادت پر منتج ہوئے حضرت علیؑ کے عہد خلافت میں بھی انہوں نے یہ رویہ جاری رکھا اور انہوں نے مطلقاً حضرت علیؑ و معاویہؓ کی لڑائیوں کے باب میں زحمتِ غور و فکر گوارا نہ کی کہ فریقین میں سچا کون تھا اور جھوٹا کون؟

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ عبد اللہ بن عمرؓ عمران بن حصینؓ اور مذکورۃ الصدر حدیث کی راوی ابو بکرہ رضی اللہ عنہم انہی خوش نصیب صحابہ میں سے تھے۔ گویا انہوں نے اس بارے میں کسی بھی فیصلہ کو موخر رکھا اور معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔

امام نوویؒ ان فتنوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

”یہ معاملات بے حد پیچیدہ تھے اور صحابہ کی ایک جماعت اس میں اپنا موقف متعین نہ کر سکی تھی بلکہ وہ حیران و سرگردان تھے۔ وہ دونوں جماعتوں سے الگ ہو گئے اور لڑائی میں شرکت نہ کی۔ نہ یہ فیصلہ کر پائے کہ راہِ صدق و صواب پر کون گامزن ہے۔“

۲۸۔ ابن عساکر اس فرقہ کے بارے میں لکھتے ہیں:-

”یہ اصحابِ شک میں تھے۔ دراصل یہ غزوات میں مصروف

رہتے تھے۔ جب مدینہ سے گئے تھے تو وہاں اختلاف کا نام و نشان نہ تھا۔ شہادتِ

عثمان کے بعد واپس آئے تو حالات دگرگوں پائے اس کی وجہ دریافت کی اور کہنے

لگے۔ تم میں بعض کہتے ہیں حضرت عثمانؓ بحالتِ مظلومی مارے گئے اور آپ کے اعوان و

انصار عدل و انصاف کے حامل تھے۔ اس کے برعکس دوسرا فریق کہتا ہے کہ حضرت

علیؑ اور ان کے ساتھی برسرِ حق ہیں۔ آپ حضرات سب قابلِ اعتماد ہیں اور قابلِ تصدیق

لہذا ہم ان دونوں سے الگ ہیں نہ کسی کو بٹا بھلا کہتے ہیں نہ کسی سے سزائی کا اظہار

کرتے ہیں اور نہ کسی کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ ہم ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد

کرتے ہیں کہ وہی فیصلہ فرمائے گا۔“ (تاریخ دمشق از ابن عساکر)

مرجبتہ کے افکار و عقائد | ۲۹۔ جب امت مسلمہ شدید تفرق و انقسام کا شکار ہو

اور اس کے ساتھ ساتھ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کا مسئلہ بھی چھیڑ گیا تو ایک گروہ
 ایسا بھی پایا گیا جو مسلک "ارجاء" کا قائل تھا قبل ازیں بعض صحابہ بھی اس نظریہ کا اعتراف
 رکھتے تھے ان کا قول تھا کہ مرتکب کبائر کا معاملہ موخر رکھا جائے اور اس کے معاملہ کو
 دوائے علیم و خبیر کے سپرد کر دیا جائے۔ انہوں نے سیاسی اختلافات کے دوش بدوش مرتکب
 کبائر کے مسئلہ میں بھی غور و خوض کرنے کو ترک کر دیا تھا۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ بھی سیاسی اختلافات
 کا پیداوار ہے۔ اس مسئلہ کی اصل و اساس یہ ہے کہ خوارج اپنے مخالفین کی تکفیر کرتے تھے۔
 اس کے برعکس مرجئہ اپنے مخالفین کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ کلمہ گو ہیں لہذا نہ کافر ہیں نہ
 مشرک بلکہ مسلمان ہیں۔ ہم ان کا معاملہ اس خدائے علیم و خبیر کے سپرد کرتے ہیں جو امر اور مومن
 سے بخوبی آگاہ ہے اور وہی ان کا حساب لے گا۔

مرجئہ میں اختلاف افکار ۳۰۔ - مرجئہ کا یہ زاویہ نگاہ قرین صحت و صواب تھا

کہ اختلافی جھیلے میں نہ پڑیں اور مرتکب کبائر کے معاملہ
 کو ٹال دیں۔ عین ممکن ہے کہ اس نے کچھ اچھے اعمال انجام دیئے ہوں جو اس کے گناہوں کی
 معافی کا باعث ہو جائیں اور اس کے اعمال قبیحہ نیکیوں کی صورت اختیار کر لیں۔ بعد ازاں ان کے
 پانچویں پیدا ہوئے جو مرتکب کبائر کے بارے میں اپنے اسلاف کی طرح سلیبی پہلو پر قانع نہ رہے
 بلکہ مثبت طریق سے ان کا دعویٰ تھا کہ اقرار و تصدیق اور اعتقاد و معرفت کا نام ایمان ہے
 ایمان کی موجودگی میں معصیت ضرر رساں نہیں۔ ایمان اور عمل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

بعض اس سے بھی آگے بڑھ کر کہنے لگے: "ایمان کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ زبان سے
 کفر کا اعلان کرنے۔ بتوں کی پرستش۔ یہودیت و نصرا نیت کا عقیدہ رکھنے اور صلیب کی پوجا کرنے
 سے بھی ایمان ہوں گا توں رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص دارالاسلام میں رہتے ہوئے تسلیم کا عقیدہ
 رکھتا ہو اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ شخص خدا کے یہاں مومن کامل خدا کا محب اور قطعی
 جنتی ہو گا۔"

الفصل فی الملل والنحل ابن حزم ج ۴ ص ۲۰۴

بعض مرجئہ یہ کہتے تھے کہ اگر کوئی یوں کہے کہ مجھے معلوم ہے کہ اللہ نے خنزیر کھانا حرام
 کر دیا ہے لیکن مجھے اتنا معلوم نہیں کہ خنزیر یہ بکری ہے یا کچھ اور، تو مومن ہی رہے گا۔

یا کوئی یوں کہے "خدا نے حج بیت اللہ فرض کیا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کعبہ کہاں واقع ہے
 ممکن ہے وہ ہندوستان میں ہو" تو ایسا شخص بھی مومن ہو گا۔ اس قائل کا مقصد یہ ہے کہ

اس قسم کے اعتقادات ایمان سے الگ ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ ان امور میں شک و شبہ رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک داتا و بنی شخص نہ جانتا ہو کہ کعبہ کس طرف واقع ہے یا وہ ختمز پر اور بکبری میں تمیز نہ کر سکتا ہو۔

(الملل و النحل شہرستانی ج ۱ ص ۲۲۵)

یہ بیانات اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ مرحبہ کی نگاہ میں عمل کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جہاں تک ایمان و عمل کے باہمی رابطہ کا تعلق ہے ان کی رائے میں عمل ایک بے کار سی چیز تھی جس کا دخول جنت و جہنم سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ اعمال کو ایک سلیبی چیز تصور کرتے تھے پھر ایمان کو بھی بے وقعتی کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور اس کی حقیقت کو بدل ڈالا۔ کہا کرتے تھے ایمان صرف قلبی اذعان و ایقان کا نام ہے اگرچہ اعضاء و جوارح اس کے خلاف ہوں اور انسان کے ہر رگ و ریشہ سے یہ عیاں ہو رہا ہو کہ اس کے دل میں ایمان کا گزر نہیں ہوا۔

پھر وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھے اور یہ کہنا شروع کیا کہ قلبی اذعان ہی رکن ایمان ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بدیہی حقائق کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے کہ یہ جوہر ایمان میں شامل نہیں۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ کعبہ سے لاعلمی یا حقیقت ختمزیر سے بے خبری ایمان کے لئے مضرت نہیں۔ یہ آخری قسم ہو سکتا ہے۔ ایمان کے لئے مضرت نہ ہو مگر عقل و شعور کے لئے ضرور ضرر رساں ہے۔

۱۳۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مذہب کی وجہ سے حقائق ایمان و نیکی و پاکبازی کا کوئی احترام باقی نہیں رہتا اسی وجہ سے اخلاق یاختہ اور مفسد لوگ اس مذہب کو اپنانے لگے اور اسے اپنی شہوت رانی کا آلہ کار بنایا ایسے مفسدہ پرداز لوگوں کی کوئی انتہا نہ رہی انہوں نے اسے اپنی معصیت کاری کا ذریعہ قرار دے لیا اور اس سے اپنے اغراض فاسدہ اور عزائم خبیثہ پر پردہ ڈالتے لگے۔

ابوالفرج اصفہانی اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں :-

”مرحبہ فرقہ کے ایک آدمی اور ایک شیعہ میں ایک مرتبہ جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو شخص انہیں سب سے پہلے مل جائے اسے حکم قرار دیں گے۔ چنانچہ اولین شخص جو انہیں ملا وہ اباحی مذہب کا ایک اخلاق یاختہ آدمی تھا وہ دونوں اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”بتائے بہتر کون ہے شیعہ یا مرحبہ فرقہ سے تعلق رکھنے والا؟“ وہ بولا ”میرے جسم کا بالائی حصہ شیعہ ہے اور نیچے والا مرحبہ“

۳۲۔ نظر بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرجئہ کا اطلاق دو فرقوں پر ہوتا تھا۔
(۱) وہ فرقہ جو صحابہ کے باہمی اختلافات اور ان منازعات کے

مرجئہ کی دو قسمیں

بارے میں جو اموی عہد میں ظہور پذیر ہوئے غیر جانبدار تھا۔

(۲) وہ فرقہ جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ کفر کے ماسوا اللہ تعالیٰ سب گناہ معاف کر دے گا۔

لہذا ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت کا کوئی نقصان نہیں۔ جیسے کفر کی موجودگی میں طاعت کا کوئی فائدہ نہیں۔

بدکار لوگوں نے آخر الذکر مذہب میں اپنی من مانی کاروائیوں اور بد اخلاقیوں کا دروازہ

کھلا پایا۔ اسی لئے حضرت زید بن علیؑ کو کہتا پڑا:-

”میں مرجئہ فرقہ سے اظہار برأت کرتا ہوں جنہوں نے بدکار لوگوں کو بھی عنہ و خداوندی

کا امیدوار بنا دیا۔“

اسی فرقہ نے مرجئہ کے نام کو اس قدر بدنام کیا کہ دوسرے فرقوں کے لئے یہ نام گالی

کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

معتزلہ ہر اس شخص کو مرجئہ قرار دیتے تھے جو کبائٹھ کے مرتکب کو دائمی جہنمی خیال نہ کرے

بلکہ وہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر داخل جنت ہوگا اور خدا تعالیٰ اس کو معاف

کر دے گا۔ اسی بناء پر بہت سے ائمہ حدیث و فقہ کو مرجئہ کہا جانے لگا۔ چنانچہ اسی اعتبار

سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین پر مرجئہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

شہرستانی لکھتے ہیں:-

”امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب کو مرجئہ کہا جاتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے

کہ آپ کے نزدیک ایمان دلی تصدیق کا نام ہے اور وہ کم و بیش نہیں ہوتا۔ اس سے

لوگوں نے سمجھا کہ آپ عمل کو ایمان سے موخر رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ امام

صاحب عمل میں اتنے محتاط ہوتے ہوئے ترک عمل کا قوی کیسے دے سکتے تھے۔ اس

کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ آپ ان قدر یہ اور معتزلہ کے برخلاف تھے جو صدر

اول میں ظہور پذیر ہوئے اور معتزلہ ہر اس شخص کو مرجئہ کہتے تھے جو مسئلہ تقدیر میں

ان کا مخالف ہو۔ خوارج بھی اسی طرح کرتے تھے۔ پس لا محالہ یہ لقب آپ کو معتزلہ اور

خوارج نے دیا ہوگا۔“

اسی طریقہ سے امام ابوحنیفہ اور ان اصحاب کے علاوہ دوسرے علماء کے حج و غیر حج کو بھی مرجئہ کہا گیا ہے۔
 مثلاً حسن بن محمد بن علی بن ابی طالب - سعید بن جبیر - طلح بن حبیب - عمرو بن مرہ - محارب بن دثار - مقاتل بن سلیمان - حماد بن ابی سلیمان اساذ امام ابوحنیفہ اور قدید بن جعفر وغیرہم
 حالانکہ یہ علماء حدیث و فقہ کے مسلم امام تھے اور یہ سب اصحاب کبار کی تکفیر نہیں کرتے تھے
 اور نہ ان کو دائمی جہنمی سمجھتے تھے۔

مرجئۃ السنۃ و مرجئۃ البدعت | ۳۳ - بعض علماء نے مرجئہ کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے :-

۱۔ مرجئۃ السنۃ - ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ گناہ کے مرتکب کو گناہوں کے مطابق سزا دی جائے گی اور وہ دائمی جہنمی نہیں ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے اس کی مغفرت فرمائیں اور وہ سزا سے بچ جائے " وَ ذَا لِكْ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَن يَّشَاءُ " محدثین و فقہاء کی ایک کثیر جماعت اس زمرہ میں داخل ہے۔

۲۔ مرجئۃ البدعت :- یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ایمان کی موجودگی میں معصیت سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے طاعات و عبادات بے اثر ہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک یہی فرقہ مرجئہ کے نام سے مخصوص ہے۔ یہ سب لوگوں کے نزدیک قابل خدمت فرقہ ہے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ائمہ کبار کو مرجئہ کے نام سے پکارنا زیبا نہیں۔ کیوں کہ اس طرح بہت سے اخلاق باختہ اباحی المذہب لوگوں کو ان کے ہمنام ہونے کا موقع مل جاتا ہے
 وَاللّٰهُ سُبْحٰنَهُ وَ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِالْاَصْوَابِ

۲۳۔ معتزلہ



مکتبہ اسلامیہ
ذرا غور سے دیکھو

۱۰۰/۱۰۰

معتزلہ کی مختصر تاریخ | ۳۴۔ اس فرقہ نے اموی عرصہ و عہد میں بال و پیر نکلے اور فرقہ کے وقت ظہور میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جب حضرت حسن امیر معاویہ کے بیٹے نے خلافت سے دست بردار ہوئے تو اصحاب علی کی ایک جماعت سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو گئی اور اس کی سرگرمیاں صرف عقائد تک محدود ہو کر رہ گئیں۔

چنانچہ ابو الحسن الطرثلی اپنی کتاب "احل الاحواء والبدع" میں لکھتے ہیں:-
 "انہوں نے اپنا نام معتزلہ رکھا اس لئے کہ جب حضرت حسن بن علی نے حضرت معاویہ کی بیعت کی اور خلافت انہیں تفویض کر دی تو ان لوگوں نے حسن اور معاویہ دونوں سے کنارہ کشی کر لی بلکہ سب سے الگ ہو گئے۔ یہ لوگ اصحاب علی تھے۔ اب ان کی سرگرمیوں کا مرکز و محور گھر رہ گیا یا مسجد۔ یہ کہا کرتے تھے: "ہمیں صرف علم اور عبادت سے مشغول رہنا ہے۔"
 علماء کا دوسرا بڑا گروہ معتزلہ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ رئیس معتزلہ واصل بن عطاء تھے۔ یہ حسن بصری کے حلقہ درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سوال زور و شور سے اٹھنا اور اسی نے اذیان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا کہ کیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے یا نہیں؟
 حضرت حسن بصری کی مخالفت کرتے ہوئے واصل نے کہا:
 "میں کہتا ہوں کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب علی الاطلاق مسلمان نہیں ہے۔ بلکہ وہ کفر و ایمان کی درمیانی منزل میں ہے۔"

اس اختلاف کے بعد واصل نے حضرت حسن بصری کے حلقہ سے علیحدگی اختیار کر لی اور اسی مسجد میں ایک علیحدہ حلقہ قائم کر کے بیٹھ گئے۔

فرقہ معتزلہ کے علماء نے اپنی تصانیف میں لکھا ہے کہ یہ فرقہ واصل بن عطاء سے پہلے کا ہے۔ وہ بہت سے اہل بیت کو معتزلی المسلك قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی معتزلی تھے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حسن افعال الجاہل کے مسئلہ میں قدیم کے ہنرا تھے۔ اس مسئلہ میں معتزلہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ مرتکب کبائر کے بارے میں حسن نے

رائے ظاہر کی ہے وہ معتزلہ کے عقیدہ سے میل کھاتی ہے۔ وہ اسے منافی قرار دیتے ہیں۔
داعی جہتی ہوتا ہے اور اہل ایمان کے زمرہ میں شامل نہیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو گئی
حضرت حسن مرتکب کیاٹر کے مسئلہ میں بھی ان کے ہم خیال ہیں۔

مشہور عالم المر تفضلی نے اپنی کتاب المینۃ والامل میں معتزلہ کے تمام طبقات کا ذکر کیا ہے
ہماری رائے یہ ہے کہ فرقہ معتزلہ واصل سے پہلے کا ہے۔ کیونکہ بہت سے اہل بیت
یہی عقائد رکھتے تھے۔ مثلاً زید بن علی جو واصل کے گہرے دوست تھے۔ اس فرقہ کو واصل کی
طرف منسوب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ واصل نے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بہت سرگرمی سے حصہ
لے لیا۔ لہذا بہت سے لوگ اسے معتزلہ کا بانی تصور کرتے لگے۔

معتزلہ کی وجہ تسمیہ | ۳۵۔ اس فرقہ کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک یہ فرقہ حضرت علی کے اسم
پیدا ہوا جو سیاسیات سے الگ ہو گیا تھا۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ جب واصل (اس فرقہ کا بانی) حضور
حسن سے الگ ہو گیا تو انہیں معتزلہ (الگ ہونے والے) کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔
لیکن بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ یہ فرقہ معتزلہ اس لئے کہلایا کہ یہ لوگ بڑے متقی پار
اور لذات دنیاوی سے کنارہ کش رہتے تھے۔ چنانچہ لفظ معتزلہ اس امر کا آئینہ دار ہے کہ
لوگوں کو یہ نام دیا گیا وہ عابد و زاہد قسم کے لوگ تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس فرقہ کے سب لوگ
ایسے نہ تھے۔ اس جماعت میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ نیکو کار بھی اور گنہ گار بھی۔ ابراہیم اور خیار
ڈاکٹر احمد امین مرحوم اپنی کتاب فخر الاسلام میں لکھتے ہیں۔

”علامہ مقریزی کی کتاب ”الخطط“ میں ہماری نظر سے گذرنا کہ ان دنوں یہودی فرقے ادھر
ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک فرقہ ”فروشیم“ کہلاتا تھا جس کے معنی ہیں ”معتزلہ“
یہ فرقہ تقدیر پر بھی گشتگو کرتا تھا اور یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ بندوں کے سب افعال
خدا کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ کچھ بعید نہیں کہ یہودیوں سے جو لوگ اسلام لائے تھے
انہوں نے اس مماثلت کی وجہ سے معتزلہ پر اس نام کا اطلاق کیا ہو۔“

(فخر الاسلام از ڈاکٹر احمد امین)

معتزلہ اسلام اور معتزلہ یہود کے مابین قرینی مماثلت پائی جاتی ہے۔ معتزلہ یہود فلاسفہ
منطق کی روشنی میں تورات کی تشریح و توضیح کرتے تھے۔ اسی طرح معتزلہ اسلام قرآن میں بیان کرد

ات کی تاویل بھی فلسفیانہ انداز میں کرتے ہیں۔ علامہ مقریزی ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔
 ”فرقہ فروشیم والوں کو معتزلہ کہا جاتا ہے۔ یہ اپنے حکماء سلف کے اقوال کی روشنی
 میں تورات سے احکام اخذ کرتے ہیں۔“ (المخطوط المقریزی)

۳۶۔ ابوالحسن خیاط اپنی کتاب الاختصار میں لکھتے ہیں :-
 ”کوئی شخص جب تک ذیل کے اصول خمسہ کا معتقد نہ ہو معتزلی“
 نے کامز اور نہیں ہو سکتا۔

۱۔ توحید (۲) عدل (۳) وعد و وعید (۴) کفر و اسلام کی درمیانی منزل کا اقرار
 ۵۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

جس شخص میں یہ اصول خمسہ پوری طرح موجود ہوں گے وہ ”معتزلی کہلانے کا مستحق
 رکا۔ کیونکہ مسلک اعتزال کے یہ اصول جامعہ ہیں۔ جو شخص ان سے انحراف کرے گا وہ معتزلی
 بن سمجھا جائے گا اور نہ معتزلہ پر اس کے قول و فعل کی ذمہ داری عائد ہوگی۔
 اب ہم ایجاز و اختصار کے ساتھ مذکورہ اصول خمسہ پر گفتگو کریں گے۔

۳۷۔ ”توحید“ فرقہ معتزلہ کا جو پر خلاصہ اور روح ہے۔ امام ابوالحسن
 اشعری اپنی کتاب مقالات الاسلامیین میں توحید کے بارے میں معتزلہ کا مذہب
 ن کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”خدا ایک ہے۔“ لیس کثیرہ شئی وهو السميع البصير (۱۱: ۲۲)
 وہ نہ جسم رکھتا ہے نہ کالبہ۔ نہ اس کا جثہ ہے نہ صورت۔ خون بھی نہیں۔ گوشت
 بھی نہیں۔ نہ جوہر ہے نہ عرض۔ نہ اس کا کوئی رنگ ہے نہ ذائقہ خوشبو بھی۔ اسے
 چھوا بھی نہیں جاسکتا۔ نہ اس میں حرارت ہے نہ برودت۔ نہ رطوبت ہے نہ بیوست
 طول بھی نہیں۔ عرض بھی نہیں۔ عمتق بھی نہیں۔ نہ اس میں اجتماع ہے نہ افتراق۔ نہ
 متحرک ہے نہ ساکن۔ نہ اس کے الگ اجزا ہیں۔ نہ وہ ذی الباطن و اجزا ہے
 وہ جوارح و اعضاء بھی نہیں رکھتا۔ وہ ذی جہات بھی نہیں۔ نہ اس کا کوئی دایاں ہے
 نہ بایاں۔ نہ آگاہ ہے نہ بچھا۔ اوپر بھی نہیں نیچے بھی نہیں۔ کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں
 کر سکتا۔ زمانہ اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ وہ جدا بھی نہیں اور ملا ہوا بھی نہیں۔ نہ
 اماکن میں وہ حلول کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے صفت سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔ جو خلق میں

پائے جاتے ہوں اور حادثہ دفعانی ہوں۔ نہ اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ
 تنہا ہی ہے۔ اسے ناپا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ مختلف جہات میں سمایا ہوا نہیں۔ وہ
 محدود بھی نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔ تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں
 پردے اسے مستور نہیں کر سکتے۔ وہ جو اس کے ادراک سے بالا ہے۔ اسے لوگوں پر
 قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ وہ مخلوق سے کسی طرح مماثلت نہیں رکھتا۔ نہ اس پر آفات
 کا نزول ہو سکتا ہے۔ نہ مصیبتیں اسے گھیر سکتی ہیں۔ ہر وہ بات جو تصور نہیں آسکتی
 ہے۔ ہر وہ تصور جو وہم میں آسکتا ہے۔ اس کی مشابہت سے وہ ماوراء ہے۔ وہ
 اول ہے۔ سابق ہے۔ متقدم ہے مخلوقات سے قبل موجود ہے۔ وہ عالم ہے۔ قادر
 ہے۔ زندہ ہے۔ نہ اسے آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ نہ بینی اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ اوہام
 اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سماعت سے سن نہیں سکتی۔ وہ دوسری مخلوقات کی طرح
 عالم قادر زندہ نہیں ہے۔ نہ وہ علماء کی طرح ہے جیسے وہ قادر ہوتے ہیں اور زندہ
 ہوتے ہیں۔ صرف وہی قدیم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی قدیم نہیں ہے۔ صرف وہ معبود
 ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے۔ نہ اس
 کا کوئی وزیر مختار ہے۔ اس کی مرضی کی تکمیل و تکوین میں کوئی اس کا معین و مددگار
 نہیں۔ اس نے جو چاہا پیدا کیا۔ اس نے کوئی چیز مثال دیکھ کر پیدا نہیں کی۔ کسی چیز کا
 پیا کرنا نہ اس کے لئے آسان ہے نہ دشوار۔ نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان
 سرور و لذات سے وہ بیگانہ ہے۔ اذیت و الم سے نا آشنا ہے۔ نہ وہ ذی ثنابت
 ہے کہ اس کی انتہا ہو۔ اس پر فنا بھی طاری نہیں ہو سکتی۔ نہ اس میں کسی طرح کی کوتاہی یا
 کمی ہے۔ نہ مجبوری اور بے چارگی ہے۔ وہ عورت سے بے نیاز ہے۔ نہ اس کی بیوی
 ہے نہ اولاد۔“

(مقالات اسلامیہ ج ۱ ص ۲۱۶-۲۱۷)

۳۸۔ معتزلہ انہی اصول کے پیش نظر قیامت کے دن روئے
 عقیدہ توحید کے نتائج | باری تعالیٰ کو محال سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے خدا کی جسمانی

جہت لازم آتی ہے۔ نیز یہ کہ صفات ذات سے غیر نہیں ہیں۔ ورنہ تعددِ قدم لازم آئے گا۔
 اس پر بنیاد رکھتے ہوئے وہ قرآن کو مخلوق سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ صفتِ کلام کو خدا کی صفت
 قرار نہیں دیتے تھے۔

۲۔ عدل | ۳۹۔ مؤرخ شہیر المسعودی مروج الذهب میں عدل کا معنی بیان کرتے ہیں۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا فساد کو نہیں چاہتا۔ نہ افعال العباد کو پیدا کرتا ہے۔ لوگ اللہ کے امر کو بجا لاتے ہیں۔ اس کے مہنیاات سے رک جاتے ہیں تو یہ اس قدرت کے باعث جو اللہ نے انہیں ودیعت کر رکھی ہے۔ خدا وہی حکم دیتا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اسی بات سے روکتا ہے۔ جسے برا سمجھتا ہے۔ ہر شے کی جس کا اس نے حکم دیا اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہر وہ برائی اچھی نہیں جس سے اس نے روکا ہے وہ بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ نہ ان سے وہ کام لینا چاہتا ہے۔ جس کی وہ قدرت نہیں رکھتے۔ کوئی شخص بھی رزق کھولنے اور اور بند کرنے کی قدرت نہیں رکھتا بجز اس قدرت کے جو اللہ نے اپنے بندوں کو مرحمت کی ہے۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ جس سے چاہتا ہے لیتا ہے۔ وہ اگر چاہتا تو مخلوق کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس کی اگر مرضی ہوتی تو لوگ کبھی کسی معصیت کے پاس نہ پھٹکتے۔ بے شک وہ اس پر قادر تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اگر ایسا کرتا تو پھر بندوں کی آزمائش نہ ہو سکتی۔“ (مروج الذهب للمسعودی ج ۲ ص ۱۹۰)

قانون عدل سے معتزلہ دراصل چھینہ کے اس نظریہ کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ بندہ اپنے عمل میں مختار نہیں۔ لہذا اس کو ذمہ دار قرار دینا ظلم ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی مطلب نہیں کہ ایک شخص کسی بات کا حکم دیا جائے اور پھر آہر ہی اس کی مخالفت پر مجبور کرے اور نہ کسی فعل سے روکنے کا یہ مطلب ہے۔ جب کہ منع کنندہ خود اس کو اس فعل کے ارتکاب کے لئے جبر کرے۔

اس بنا پر معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے اور خدا خالق افعال میں۔ لیکن اس کے ثابت کرنے میں یہ امر ملحوظ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو عجز سے ممنون رکھا جائے۔ لہذا اس نے کہا کہ یہ اس قدرت کے باعث ہے جو اللہ نے بندوں کو ودیعت کی اور ان کے لئے عطا کی ہے۔ وہ عطا کرنے والا ہے اور اسے یہ قدرت تامہ حاصل ہے کہ جو کچھ اس نے عطا کیا ہے سلب کرے۔

۴۰۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ وعدہ و وعید لا محالہ وقوع پذیر ہوں گے۔ خداوند کریم نے جو نواہی و وعید دیا اور سزا کی جو دیکھی دی وہ پوری

عدو و وعید

ہو کر رہے گی۔ اس نے غلصانہ توبہ کی قبولیت کا جو وعدہ کیا ہے وہ بھی پورا ہوگا۔ جو نیک کام کرے گا جزا پائے گا۔ اسی طرح بدکار کو سزا دی جائے گی۔ کیا توبہ بلا توبہ معاف نہیں ہوتے۔ نہ نیکی کرنے والا جزاء سے محروم رہتا ہے۔ اس سے ان کا مقصد فرقہ مر جیہ کی تردید کرنا تھا جن کا نظریہ ہے کہ "ایمان کی موجودگی میں معصیت سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا جس طرح کفر کے ہوتے ہوئے طاعت و عبادت کا کوئی فائدہ نہیں"۔

اگر مر جیہ کی یہ بات صحیح ہوتی تو خدا کی وعید بے اثر ہو جاتی۔ تعالیٰ اللہ عما یقولون علو

۳۔ کفر و اسلام میں درمیانہ درجہ | اہم معتزلہ کے اس نظریہ کی توجیہ کرتے ہوئے شہرستانی لکھتے ہیں:۔

”و اصل بن عطاء کا قول تھا کہ ایمان عبارت ہے خصال خیر سے۔ جب یہ کسی شخص میں موجود ہوں تو وہ مومن ہے اور مومن ایک تو صیغی نام ہے چونکہ فاسق میں خصال خیر کبھی جمع نہیں ہوتے لہذا وہ تو صیغی نام کا مستحق نہیں پس اسے مومن بھی نہیں کہا جائے گا۔ مگر اسے علی الاطلاق کافر بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ کلمہ شہادت کا قائل ہے۔ اور دوسرے اعمال خیر بھی اس میں موجود ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر وہ دنیا سے اس طرح زھمت ہو کہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو چکا ہو اور توبہ نہ کی ہو تو وہ دوزخی ہے اور ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ کیونکہ آخرت میں صرف دو ہی فریق ہوں گے۔ ایک فریق جنت میں ہوگا۔ دوسرا جہنم میں۔ البتہ اس کے ساتھ یہ رعایت کی جائے گی کہ عذاب کچھ کم کر دیا جائے اور اسے کافروں سے ایک درجہ اوپر رکھا جائے گا“

”درمیانی درجہ“ کے قائل ہونے کے باوجود معتزلہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ پر یہ تکلیف کے طور پر نہیں بلکہ ذمیوں اور کافروں سے تمیز کرنے کے لئے مسلم کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ ابن ابی الحدید نے جو شیعہ ہونے کے باوجود شیوخ معتزلہ میں شمار ہوتا ہے لکھا ہے: ”گو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ مومن ہے نہ مسلم، لیکن ہم اس کے لئے لفظ ”مسلم“ کا اطلاق جائز خیال کرتے ہیں تاکہ اہل ذمہ اور بت پرستوں سے اسے ممتاز کیا جاسکے۔ لہذا یہ لفظ مرتکب کبائر کے لئے ایسی احتیاط سے استعمال کیا جائے گا کہ اس سے اس کی تعظیم ثنا اور مدح نہ سمجھی جائے۔ (شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید)

۴۲۔ یہ معتزلہ کے اجماعی اصولوں میں سے
پانچواں اصول ہے معتزلہ کے نزدیک امر بالمعروف

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

نہی عن المنکر سب مومنوں پر واجب ہے۔ تاکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ انجام
جائے۔ اور ان لوگوں کے حملوں کی روک تھام کی جائے جو حق و باطل کو ملا تے اور مسلمانوں
فساد بپا کرتے تھے۔ عجمی خلافت میں الحاد و زندقہ کا جو طوفان بدتمیزی اٹھاتا تھا اور جس نے
انت اسلامیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر کے رکھ دیا تھا معتزلہ اس کی روک تھام کے لئے
سیر ہو گئے۔ اس ہمہ گیر فتنہ نے اسلام کے شیرازہ کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ معتزلہ محدثین و فقہاء کے
نہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور حجت و برہان یا سیف و سنان اور قوت سلطان سے اپنا ہمنوا
ناجا یا۔ آگے چل کر خلقِ قرآن کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے اسکی تفصیلاً بیان کریں گے۔ یہ تھے معتزلہ کے اجماعی
دل خمسہ جن کو تسلیم کے بغیر کوئی شخص اس نام سے موسوم نہ ہو سکتا۔

۴۳۔ بیان عقائد میں معتزلہ نقلی دلائل کے بجائے
معتزلہ کا طرز استدلال عقلی برہان و دلائل پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اس اعتماد و

نو شرعی اوامر کا احترام ہی کچھ محدود کرتا تھا۔ وہ اپنے مسائل کو عقل پر پیش کرتے پھر جسے
ل مانتی اسے قبول کر لیتے ورنہ رد کر دیتے۔ اس انداز فکر کے محرکات یہ تھے۔

یہ لوگ زیادہ تر عراق اور فارس میں بود و باش رکھتے تھے جہاں قدیم تہذیب و تمدن
کی صدائیں گونج رہی تھیں۔

۱۔ ان میں غیر عربی عنصر بہت زیادہ شریک تھا جن میں زیادہ تر مولی تھے۔

۲۔ چونکہ وہ یہود و نصاریٰ سے گھلے ملے رہتے تھے جنہوں نے فلسفیانہ افکار کو عربی زبان کا لباس
پہنایا تھا۔ اس لئے وہ عقلی دلائل سے کام لیتے کے عادی ہو گئے تھے۔

۴۴۔ آثار عقلی پر اعتماد ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ معتزلہ اپنے مسائل
معتزلہ کی عقل پرستی | قبح کا فیصلہ از روئے عقائد کہ ایک تہذیب تھے ان کا کہنا تھا۔

”سب معارف (عقائدی مسائل) عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں اور واجب ہے

کہ عقل ہی سے ان میں خود کیا جائے قسلاً وحی کے وارد ہونے سے پہلے ہی معلوم تھا

کہ محسن کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ محسن اور قبح محسن اور قبیح کی دو ذاتی صفات

ہیں۔ (المجلد والنحل از شہرستانی ج ۱ ص ۵۷)

لکھنؤ

مشہور معتزلی علامہ جہانی کا قول ہے :-

”ہر وہ معصیت جس کے متعلق عقل یہ سمجھتی ہو کہ اللہ کو اس کا امر کرنا چاہئے لیکن اگر اللہ نے اس سے منع کر دیا ہو تو وہ نہی الہی کی وجہ سے ”قبیح“ قرار پائے گا۔ لیکن جس گناہ کے بارے میں عقل کا فیصلہ بھی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تو سمجھنا چاہئے کہ وہ گناہ بذاتِ خود قبیح ہے جیسے ذاتِ خداوندی کو نہ جاننا اور اس کے مخالف عقیدہ رکھنا بعینہ اسی طرح اگر کسی بات کا اللہ نے امر کر دیا ہے تو وہ حکم الہی کے باعث ”حسن“ ہو جائے گا۔ اگرچہ عقلاً اس کو ممنوع ہونا چاہئے تھا اور جو احکام ہوں ہی ایسے کہ ان کا حکم دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ضروری تھا وہ بذاتِ خود حسن ٹھہریں گے۔

(مقالات الاسلامیین ج ۲ ص ۲۳)

معتزلہ کا خدا کے لئے واجب صلاح و اصلاح کا نظریہ اسی پر مبنی ہے جبہور معتزلہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا سے وہی بات صادر ہو سکتی ہے جو اپنے اندر صلاح کا پہلو رکھتی ہو۔ لہذا ”اصلاح“ اس کے لئے واجب ٹھہری۔ کیونکہ اللہ جو کچھ بھی کرے گا وہ صالح ہے یہ محال ہے کہ وہ کوئی غیر صالح فعل کرے۔

یونانی افکار سے اخذ و استفادہ | ۲۵۔ اموی عہدِ خلافت کے اواخر اور عباسی

خلافت کے آغاز میں عربی عقل و شعور پر ہندو یونان فلسفیانہ افکار نے دھاوا بول دیا۔ یونانی فلسفہ بلادِ اسلامیہ میں فارس کی راہ سے داخل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ظہورِ اسلام سے قبل فارسی تہذیب یونانی فلسفہ سے متاثر ہو چکی تھی۔ ابنِ فارس کے علاوہ سریانی زبان کے ذریعہ بھی یونانی افکار اسلامی دیار و اقصاء میں آگئے۔ سریانی اقوام نے یونانی افکار سے استفادہ کر کے ان پر اپنا مذہبی رنگ پڑھا دیا تھا۔ جس بنا پر ان افکار کو تقدس و طہارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ فلسفیانہ افکار و راست یونان سے بھی آگئے کیونکہ بہت سے موالی یونانی زبان جانتے تھے۔

معتزلہ اپنے افکار میں یونانی فلسفہ سے بے حد متاثر ہوئے اور بڑی حد تک اس سے گما وہ کیا۔ چنانچہ ان کے دلائل و براہین اور قیاسات کے مقدمہ میں یونانی فلسفہ کے آثار نمایاں ہیں۔ معتزلہ کے ان فلسفیانہ رجحانات کے محرک دو امور تھے۔

۱۔ یونانی فلسفہ سے معتزلہ اپنی علمی پیاس بجھاتے اور نظری و فکری اطمینان کا سامان بہم پہنچاتے

تھے۔ فلسفہ ہی کے بل بوتے پر ان کے پیش کردہ دلائل و براہین میں جان آتی اور زور ہتھللی پیدا ہو جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ فلاسفہ جب اسلامی اصول و مبادی پر حملہ آور ہوئے تو معتزلہ نے اسلام کے تحفظ و دفاع کا فریضہ ادا کیا اور جدل و بحث میں انہی کے طور طریقوں کو استعمال کر کے ان کو زیر کیا۔ بنا بریں معتزلہ دراصل حکماء اسلام تھے۔

۴۴۔ نزولہ کا دفاع اسلام | ان میں عجوس۔ یہود صابی اور نصاریٰ وغیرہ سب ہی تھے۔

مذہب کے جو لوگ داخل اسلام ہوئے ان کے سربراہ اور رہنما ان تعلیمات سے بھرپور

ان کے ادیان سابقہ کی تھیں۔ یہ تعلیمات اس طرح ان میں رواں دواں تھیں، جیسے

میں خون۔ اسلام قبول کر چکنے کے بعد یہ لوگ اپنے سابقہ مذہب کی مدح و ثنا میں

اللسان رہتے تھے۔ انہوں نے اسلام کو اسی روشنی میں دیکھا اور سمجھا تھا۔ بلکہ

ان میں ایسے ہی تھے جو سلطان وقت کے ڈر سے علی الاعلان تو اسلام کا اظہار کرتے

لیکن غیر اسلامی خیالات و معتقدات کو سینہ میں چھپائے ہوئے تھے۔ یہ مسلمانوں میں اپنے

ص خیالات کی نشر و تبلیغ کرتے۔ ان کے معتقدات میں شک و شبہ ڈالتے اور ان کے اندر غیر

ی افکار و آراء داخل کرنے کے درپے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی کوششیں رنگ لائیں۔ رفتہ

ان کی باتوں نے جڑ پکڑ لی اور ایسے فرقے پیدا ہو گئے جو اگرچہ اسلام کا لبیل لگاتے ہوئے

مین درحقیقت اساس اسلام کو منہدم کرنے کے درپے تھے مثلاً مجسمہ مشبہ اور زنا و غیرہ۔

معتزلہ جنہوں نے معتقولات کو پڑھا اور منقولات کو سمجھا ان باطل فرقوں کے مقابلہ میں عقل و دانش

رے کر تودا رہے۔ ان کے وہ اصول نیچگانہ جن کا گذشتہ صفحات میں ہم تذکرہ کر چکے ہیں سچ پوچھئے

ہی تیز مناقشات کی پیداوار تھی جو ان کے اور ان کے مخالفوں کے مابین برپا تھے۔

ان کے عقیدہ توحید کا جس شکل میں اوپر ذکر ہوا ہے اس کی عرض مجسمہ اور مشبہ کی تردید

عدل کے بارے میں معتزلہ کا اصول جہیہ کے رد کے لئے تھا۔

اسی طرح وعد و وعید سے مرجئہ کی تردید مقصود تھی۔

درج صغیرہ گناہ کے مرتکب کو بھی کافر قرار دیتے تھے۔ معتزلہ نے "درمیانی مرتبہ" سے ان میں

مرجئہ کی تردید کی۔

من

بجھنے

خلیفہ مہدی کے دورِ حکومت میں ایک شخص متفق خراسانی پیدا ہوا۔ یہ تنازعِ ارواح کا قائل تھا بہت سے مسلمانوں کو برگشتہ کر کے اس نے اپنے جھنڈے تلے جمع کیا اور ماوراء النہر کی طرف چل دیا۔ خلیفہ مہدی نے اس کا دم ختم توڑنا چاہا۔ مگر تنازعہ (متفق کے متفق) اور بھڑک اٹھے۔ لیکن تلوار کسی نظر سے کو قتل کر سکتی ہے نہ کسی مذہب کو فنا کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔

اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے مہدی نے معتزلہ وغیرہ کو متفق کے رد کے لئے ابھارا تاکہ وہ دلائل سے زنادقہ کو بکڑیں۔ ان کے شبہات دور کریں اور ان کی گمراہیوں کے پردے چاک کر کے رکھ دیں۔ چنانچہ معتزلہ نے تن دہی سے یہ کام سرانجام دیا۔

خلفاءِ نبوی عباس کی تائیدِ معتزلہ | ۴۴ - معتزلہ کا ظہور عصرِ اموی میں ہوا۔ امویوں کی طرف سے ان سے کوئی تعارض نہیں کیا گیا۔ اس لئے

کہ معتزلہ نے بھی نہ شہر انگیزی سے کام لیا نہ حرب و بیکار کا اعلان کیا بلکہ یہ ایک فکری گروہ ہے اس کی ساری سرگرمیاں نظر و فکر تک محدود تھیں۔ حجت سے حجت توڑنا۔ دلیل کا دلیل سے مقابلہ کرنا۔ قیاس صحیح سے کام لے کر امور و مسائل کا موازنہ کرنا۔ بنو امیہ نے نہ معتزلہ کا ساتھ دیا نہ ان کے راستے میں روٹے اٹکائے۔

جب دولتِ عباسیہ برپا ہوئی اور الحاد و زندقہ کا طوفان پوری شدت سے ابھرا تو انہوں نے غم و غم کیا کہ اس طوفان کا مقابلہ معتزلہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ زندقوں کے ہاتھوں میں شمشیر بے تیام الحاد کے سر پر تقدیر میرم ثابت ہو گئی۔ یہاں تک کہ ماموں کا دور آیا۔ اس نے ان کی پذیرائی کی انہیں مقرب بنایا۔ پھر جب اس نے فقہاء اور معتزلہ کے مابین اختلافات دیکھے تو فریقین میں مناظرے کرائے تاکہ فیصلہ کن طور پر ایک رائے قائم کی جاسکے۔ ماموں نے ایسی فاش اور ڈبل غلطی کھائی جو اس کے شایانِ شان نہ تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے حوالے میں فقہاء و محدثین کو طاقت کے بل بوتے پر معتزلہ کا ہم لہجہ بننے کی ٹھان لی۔

حالانکہ طاقت و شوکتِ آراء کے منوانے اور لوگوں کو کسی عقیدہ کا جبراً پابند بنانے میں ہوتی۔ پھر جبکہ دین میں جبر و تشدد حرام ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے یہ کس طرح جا سکتا تھا کہ لوگوں پر ایسا عقیدہ تھوپا جائے جس کی مخالفت بہر حال کفر نہ تھی۔ ماموں نے فقہاء سے خالقِ قرآن کا قول تسلیم کرنے کی پوری کوشش کی لیکن جہاں بعض

نے خون کے مارے تھے کر کے چارو ناچار ہاں کر لی۔ گو حقیقت یہ ہے کہ یہ تسلیم دل سے ہرگز نہ
 نی۔ وہاں ایسے باہمت بھی تھے جنہوں نے ہر سخت اٹھائی۔ ہر دھمکی سہی۔ طویل المیعاد قید و بند
 مصیبتیں نہایت استقامت سے برداشت کیں مگر وہ بات نہ مانی جو ان کے عقیدہ کے خلاف تھی
 فتنہ ماموں کے دور میں شروع ہوا تھا اور معتصم اور واثق کی خلافت تک موجود رہا۔ کیوں کہ
 موم نے اس کی وصیت کر دی تھی۔ واثق کی روش بھی یہی رہی بلکہ اس نے ایک اور مسئلہ یعنی
 نبوت باری تعالیٰ پر جبر و اکراہ کا بھی سلسلہ شروع کر دیا جو معتزلہ کا پیدا کردہ تھا۔ جب
 توکل مندشین خلافت ہوا تو اس نے جو روتشدد کا یہ سلسلہ ختم کر دیا اور لوگوں کو فکر و نظر
 ی پوری آزادی دے دی۔

عاصرین کی نگاہ میں معتزلہ کا مقام | ۴۸۔ محدثین و فقہاء نے معتزلہ کے خلاف

میدان کارزار گرم کر دیا۔ اب صورت حال یہ تھی
 معتزلہ دو دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور دونوں قوی اور توانا تھے۔ ایک طرف سے زناد
 واران کے ساتھی حملہ آور تھے۔ دوسری طرف سے محدثین و فقہاء میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے
 تھے۔ فقہاء کے مجادلات و محاورات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معتزلہ
 سخن کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ امام شافعی۔ امام احمد بن حنبل۔ ابو یوسف
 و محمد جب علم کلام کی ندرت کرتے نظر آتے ہیں تو ان کا نشانہ معتزلہ ہوتے ہیں۔ اور وہ طریق
 تکلم میں پرتیز تنقید کرتے ہیں تو ان کا مطلب معتزلہ کے طریق تکلم کا رد کرنا ہوتا ہے۔
 سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جماعت فقہاء اور فرقہ معتزلہ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا
 یعنی حمایتِ دین۔ پھر کیا وجہ تھی کہ فقہاء معتزلہ کو اس وجہ ناپسند کرتے تھے جو میرے خیال میں
 کے متعدد وجوہ تھے۔ جن میں سے چند یہ ہیں :-

۱۔ دین حنیف کے فہم عقائد میں معتزلہ طریق سلف صالح سے الگ راستہ اختیار کرتے تھے سلف
 صالح کے نزدیک نہا قرآن ہی سے صفاتِ الہی کے تعارف اور تعریف سے متعلق معلومات
 حاصل ہو سکتے تھے اور یہ کہ ان میں سے کس چیز پر از روئے عقیدہ ایمان واجب ہے؟
 قرآن کے علاوہ اس باب میں وہ کسی اور مصدر و ماخذ کے قائل نہ تھے نہ اس سے مطمئن
 ہو سکتے تھے فہم عقائد کے لئے وہ صرف آیات قرآن پر اکتفا کرتے تھے جو اپنے مفہوم میں
 صاف ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان میں اشتباہ واقع ہو جاتا تو انہیں اسالیب لغت سے سمجھنے

کی کوشش کرتے تھے جس کا انہیں ملکہ حاصل تھا۔ پھر بھی اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو توجہ سے کام لیتے۔ فتنہ سے دور رہتے ہوئے سکوت اختیار کرتے۔ راہِ سچ کی طرف راغب نہ ہو اور جادۂ مستقیم کے راستہ سے منحرف نہ ہوتے۔

عرب کے لئے یہی طریقہ مناسب اور کافی تھا۔ اس لئے کہ یہ ایک امتی قوم تھی۔ نہ اسے علوم مروجہ سے تعلق تھا نہ منطق سے نہ فلسفہ سے۔ جب علوم میں کثرت پیدا ہوئی۔ فلسفہ میں وسوسہ آئی تو معتزلہ نے اگر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ انہوں نے ہر معاملہ میں عقل کی رہنمائی تسلیم اور اسی کو اساسِ بحث بنایا۔ ان کی عقل پرستی ہر بات کی تہ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ یہ چیز فقہاء کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اس سے مانوس نہ تھے۔ چنانچہ شمشیرِ زبان بے نیام کر کے میں اتر آئے اور بری باتیں ان کی طرف منسوب کر کے ان کی اشاعت کی۔

۴۔ معتزلہ کی افکارِ زنادقہ سے تاثر پذیری | ۴۹۔ معتزلہ نے زنادقہ اور ثنویہ (خدائی کے قائل) وغیرہ سے مجادلات کئے۔ جدائے

مناظرہ بھی حرب و پیکار کی ایک قسم ہے۔ حریف کا مقابلہ اسی کے ہتھیاروں سے کیا جاتا ہے۔ بالیسی اختیار کی جاتی ہے۔ حریف کے داؤدِ حریف کے خلاف کام میں لائے جاسکتے ہیں۔ حریف مقصد کو بھانپنے اور اس کے نصب العین کی نگاہ لگائی جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا ہے کہ حریف ایک دوسرے کے طور طریقوں سے اثر قبول کر جاتے ہیں۔ یہی معتزلہ کے بارے میں سمجھا جاتا ہے۔ وہ زنادقہ وغیرہ الحاد پرستوں سے مناظرات کرتے ہوئے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے افکار و نظریات سے خود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ "یہ برج" نے کتاب الاقتصار کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"جو شخص کسی عظیم دشمن سے چوکھی جنگ کرتا ہے وہ اس سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اسی کے طریقہ پائے جنگ اس کو اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ دشمن کے تبدیلی احوال بلکہ اس کے حرکات و سکنات وغیرہ سب کچھ اس کی نظر میں رہتے ہیں۔ اس کے ضبط کا ایسا اوقات نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دشمن کی روح اس پر اثر کرتی ہے۔ اس کی چالوں سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ بالکل یہی حال معرکہ افکار ہے۔ یہاں بھی حریف مقابل سے نبرد آزما ہونے کے باوجود افکار کے بنتے بنانے میں ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اور تاثر و تاثر کے اعتبار سے دشمن کے

اثرات میں دوست و حلیف کے اثرات سے کم نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے بعض جنابہ کو اپنے ان اصحاب کے خلاف یہ شکایت پیدا ہو گئی جن کو ملحدین کے رد کی طرف پوری توجہ نے الحادہ کے دروازے تک پہنچا دیا تھا۔ پھر کیا تعجب ہے اگر بعض آراء معتزلہ میں مجادلہ باہمی کے باعث زیادہ اور ثنویہ کے بعض افکار مزوج ہو گئے ہوں۔

۵۰۔ معرفت عقائد میں معتزلہ بالکل عقلی انداز اختیار کرتے تھے یص پر اعتماد نہیں کرتے تھے

بجز اس صورت کے کہ موضوع کلام کوئی حکم شرعی ہو یا حکم شرعی سے اس کا کوئی تعلق ہو۔ باقی مسائل میں وہ عقل پر بھروسہ کرنے کے عادی تھے اور عقل کا یہ خاصہ ہے کہ اس میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی عقلیت خالصہ کی بناء پر بعض معتزلہ بڑی فاش غلطیوں کے مرتکب ہوئے مثلاً معتزلہ کے رئیس و امام جہائی کا یہ قول کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کی دعا قبول کرتا ہے تو وہ گویا بندے کی اطاعت کرتا ہے۔ جہائی کو یہ قول اس لئے لازم آیا کہ ایک مرتبہ امام ابو الحسن اشعری نے اس سے پوچھا تمہاری رائے میں "طاعت" کسے کہتے ہیں؟

جہائی نے کہا: "ارادہ کی موافقت کرنے کا نام طاعت ہے جو شخص بھی دوسرے کی مراد کو پورا کرتا ہے۔ وہ اس کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔"

امام اشعری کہنے لگے: "اس سے لازم آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کی مراد کو پورا کر دیں تو وہ بھی بندے کی اطاعت ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کا مطیع ہو سکتا ہے تو اس کے سامنے جھک بھی سکتا ہے۔ تعالیٰ اللہ من ذالک علواً کبیراً

(والفرق بین الطرق للبعداوی)

اسی طرح مشہور معتزلی امام ابو الہذیل کا قول ہے۔

"اہل جنت اختیار سے محروم ہونگے کیونکہ اگر وہ مختار ہوتے تو خدا نے انہیں مکلف بھی

کیا ہوتا۔ پس آخرت دار جزا ہے نہ کہ دار تکلیف۔"

لیکن یہ عقل کے استعمال میں افراط ہے اس لئے کہ "اختیار" تکلیف کو مستلزم کب

ہے، خیاط کہتے ہیں کہ ابو الہذیل نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

(الانتصار فی الرد علی ابن الروندی)

غرض بعض معتزلہ میں اس قسم کے عجیب و غریب خیالات پائے جاتے تھے اور وہ لوگوں میں

شائع ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ معتزلہ کے بارے میں علی الاطلاق ناگوار الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیئے جلتے۔

۵۱۔ معتزلہ نے بڑے بڑے عالی مرتبہ لوگوں کے خلاف بازار حروب و پیکار گرم رکھا اور ان کے خلاف درشت افوا

استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ چنانچہ محدثین و فقہاء کے بارے میں جا حظ کا قول ہے۔
 ”اصحاب حدیث اور عوام سرتاسر مقلد ہیں عقلی دلائل کے مقابلہ میں تقلید انہیں زیادہ
 مرغوب ہے۔ حالانکہ از روئے قرآن وہ ممنوع ہے۔ باقی رہا ان حضرات کا یہ کہنا کہ ہم میں
 عبادت گزار اور زاہد و متقی لوگ پائے جاتے ہیں تو جہاں تک عبادت گزاروں کا تعلق
 ہے صرف ایک فرقہ تو الٰہ کے عبادت گزار ان حضرات کی پوری جماعت سے تعداد میں زیادہ
 ہیں۔ حالانکہ خواجه کا فرقہ بہت زیادہ قلیل التعداد ہے۔ مگر بایں ہمہ وہ بڑے نیک بنیاد
 حلال و طیب خوراک ظاہری ٹیپ ٹاپ سے دور صاحبِ ورع و تقویٰ پابند طریق جلالت
 بخل و امساک سے گریزاں اور سیکر ذہب و جہد تھے۔“

(الفصول المختارہ من کتب الجاحظ)

جن علماء کے بارے میں جا حظ نے یہ باتیں کہیں انہیں عام و خاص لوگوں میں بڑی مقبول
 حاصل تھی۔ یہ اور اسی طرح کی دوسری طعن آمیز باتیں ہیں جنہوں نے جمہور امت کو معتزلہ سے متنفر
 دیا۔ اگرچہ حقائق مجرّمہ کے متلاشی انہیں عزت کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔

۵۲۔ بہت سے محدثین نے معتزلہ میں اپنا گھونڈ
 بنا رکھا تھا جس میں اپنی کج رویوں اور فاسد نظر

کے انڈیپےچے دیتے تھے اور اسلام و مسلمین کے متعلق دسیہ کاریوں کا ان میں بیج بونے
 تا آنکہ ان کے اغراض و مقاصد منظر عام پر آگئے۔ اس وقت معتزلہ نے انہیں اپنے سے
 ہٹایا۔ ابن الراوندی کا شمار انہی لوگوں میں ہے۔ نیز ابو عیسیٰ الوراق احمد بن حنبل اور
 بن حنفیہ بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سب لوگوں نے اسلام میں نئی چیزیں پھیلائی
 اور منکرات کی اشاعت کی۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو یہود سے روپیہ لے کر مسلمانوں
 کے عقائد کے بگاڑنے کی جدوجہد میں لگے رہتے تھے۔ معتزلہ کو جب بھی ایسے عناصر کا پتہ چلا
 وہ ان سے علیحدگی اختیار کر لیتے اور ان کا افعال قبیحہ سے بیزاری ظاہر کرتے۔ لیکن بات یہ

تہام برأت سے زیادہ تیز رفتا ہوتا ہے۔

محمد شین فقہاء پر خلفاء بنی عباس کے مظالم | ۵۳۔ بعض عباسی خلفاء ایسے تھے جنہوں نے معتزلہ کی خوب آؤ بھگت کی اور ان کی پیٹھ ٹھونکی اور اس درجہ متعصبانہ پاسداری کی کہ لوگوں کو معتزلی بنانے کے درپے لگے۔ اور اس سلسلہ میں فقہاء اور محدثین کو نشانہ ستم بنانے تک نہ چو کے۔ ان پر طرح طرح کی سبتیں نازل کیں جن کو وہ تو صبر و استقامت کی پٹھان بن کر سہہ گندے مگر دیکھتے والے پ اٹھے اور ان کی ہمدردیاں اس جماعت سے وابستہ ہو گئیں اور معتزلہ اس لئے مبعوض ریائے کہ محمد شین و فقہاء کے اس ابتلاء کا اصل سبب وہی ہوئے تھے۔ اور اس طرح محمد شین فقہاء پر یہ آلام و مصائب معتزلہ کے لئے وبال جان بن گئے اور ان کی شہرت کو اس سے نقصان پہنچا کیونکہ محن و ابتلاء اور جو رسو و ستم کا یہ دور معتزلہ ہی کی تائید و تدبیر سے رو ع ہوا تھا۔ گو معتزلہ میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو خلفاء کی ان ستم رانیوں اور دراز دستیوں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

جا حظ خلفاء بنی عباسیہ کی صفائی پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”ہم کسی ایسے شخص کی تکفیر نہیں کرتے جس تک ہم اپنی حجت نہ پہنچالیں صرف انہی لوگوں کو مورد امتحان بنانا پسند کرتے ہیں جو اہل ہمت و مشکوک ہوں لیکن کسی عہتم کی پردہ دری تجسس نہیں اور نہ کسی کی آزمائش اس کی رسوائی ہے اگر ہر کشف حقیقت پردہ دری ہو اور ہر امتحان تجسس کو سب سے زیادہ پردے فاش کرنے والا قاضی (جج) ہوگا“

(الفصول المختارہ من کتب الجاحظ)

حقیقت یہ ہے کہ جن آراء و افکار کی پشت پناہی مادی طاقت کر رہی ہو تو ان کا شکست ما جاننا یقینی امر ہے۔ کیونکہ مادی طاقت اور اقتدار کا نشہ اور ظلم و زیادتی اور خدا اعتماد سے باوز آہیں میں لازم و ملزوم ہیں۔ جس منکر کو طاقت کے بل بوتے پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائیگی اس کا نتیجہ الٹ ہی نکلے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں کہ اس فکر کے دلائل میں قوت ہو تو قدرت سلطانی کی کیا ضرورت ہے؟

۲۴۔ معتزلہ پر محدثین و فقہاء کے فتاویٰ

۵۴۔ جاہظ کے کلام میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ معتزلہ فقہاء پر بہتان طرازی کرتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے

معتزلہ کے اوصافِ خصوصی

کہ امام احمد بن حنبل جیسے لوگوں کو دینی اعتبار سے وہ مہتمم قرار دے چکے تھے۔ لہذا اس کا ردِ عمل ناگزیر تھا۔ معتزلہ کی محدثین و فقہاء کے خلاف بہتان طرازیوں کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب عباسی دور میں انہیں سیاسی قوت حاصل ہوئی اور اس کا ردِ عمل بھی اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا۔ محدثین و فقہاء نے معتزلہ میں ہر دینی عیب ثابت کرنا چاہا۔ امام ابو یوسف نے فتویٰ دیا کہ معتزلہ زندقہ ہیں۔ امام مالک اور شافعی کسی معتزلی کی شہادت قبول نہیں کرتے تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی نے فتویٰ دیا کہ اگر کوئی شخص کسی معتزلی کے پھینچا ہوا پڑھ لے تو اسے نماز کا اعادہ کرنا چاہیے۔ معتزلہ کے خلاف لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں فاسق و فاجر قرار دے دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی خصومت کے دوران سب و شتم تک نوبت آجائے تو اس کا تحقیر و تذلیل تک پہنچ جانا ضروری ہے اور حق و باطل ہر قسم کی باتیں مخالف کے ذمے لگا دی جاتی ہیں۔ بنا بریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ معتزلہ کے خلاف اکثر اتہامات ملتی ہیں عدل و انصاف نہ تھے اور اس کا باعث وہ تعصب تھا جو ان کے خلاف پیدا ہو گیا تھا اور تعصب کی یہ خاصیت ہے کہ وہ مسامح اور اک کو کسی نہ کسی حد تک تو بند کر ہی دیتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ معتزلہ غلط کارہوں یا راہی تھی و صواب و دین کی حدود سے باہر نہیں نکلے۔ ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ دفاعِ اسلام کے لئے سب سے پہلے میدان میں اترنے والا یہی فرقہ تھا۔ واصل کے اتباع اکتافِ ارضی میں پھیل گئے جو اہل بدعت کا رد کرتے تھے۔ عمرو بن عبید نے زنادقہ سے بڑی صبر آزمائی لڑی جن کی گرنی میں کمی نہ آئی۔ عمرو بن عبید اور بشار بن برد میں بڑی گہری دوستی تھی لیکن جب عمرو کو معلوم ہوا کہ بشار میں زندقہ اور گمراہی موجود ہے تو اس نے بشار کو بغداد سے جلا وطن کر کے لیا اور جب تک عمرو کا انتقال نہیں ہو گیا بشار بغداد واپس نہیں آیا۔ عمرو بڑا عابد و زاہد تھا۔ جا

کی طرف داری کرتے ہوئے کہا کرتا تھا :

”دعم و کی عبادت عام محدثین و فقہاء کے زہد و تقویٰ کے ہم پلہ ہے۔“

تاریخ کے ہر دور میں معتزلہ کے یہاں ایسے لوگ موجود رہے جو زہد و عبادت میں
بالمثل تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو زہد و تقویٰ کے باعث سلطانی تحائف قبول نہیں کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ واثق باللہ نے اپنے وزیر احمد بن داؤد سے کہا :

”تم دوسروں کو منصبِ قضا دیتے ہو لیکن میرے اصحاب (معتزلہ) کو یہ ذمہ داری کیوں نہیں سونپتے“

احمد بن ابی داؤد نے جواب دیا :

امیر المؤمنین! آپ کے اصحاب قبول نہیں کرتے۔ یہ جعفر بن بشر ہیں۔ میں نے ان کے پاس دس ہزار
درہم بھیجے لیکن قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر میں خدمت میں حاضر ہوا۔ اجازت طلب کی تو
اجازت نہ ملی۔ آخر بلا اجازت میں حاضر خدمت ہو گیا۔ مجھے دیکھتے ہی تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے
اور کہا۔ ”اب تیرا قتل میرے لئے جائز ہو گیا۔“ آخر میں لوٹ آیا۔ فرمایا ایسے آدمی کو قاضی کیسے بناؤں۔“

عجیب بات ہے کہ انہی جعفر کے پاس ان کے بعض اصحاب نے دو درہم بھیجے تو انہوں نے

نہیں لیں و پیش کے قبول کر لئے۔ کہا گیا۔ ”آپ نے دس ہزار درہم لوٹا دیئے اور دو درہم قبول

کر لئے۔“ تو جعفر نے جواب دیا جن لوگوں نے یہ دس ہزار درہم میرے پاس بھیجے تھے۔ وہ مجھ

سے زیادہ اس رقم کا استحقاق رکھتے تھے۔ میرے لئے تو اس یہ دو درہم کافی ہیں۔ اللہ تعالیٰ

نے بغیر کسی سوال کے میری ضرورت مجھ تک پہنچا دی اور ان درہموں کی برکت دیکھو کہ انہوں نے

مجھے اس رقم سے بے نیاز کر دیا۔ جو شہ اور حرام کی آمیزش سے پاک نہ تھی۔“

یہ تھا نفسِ قوی جو شہات کے سبب دروازے بند کر دیتا تھا۔ جعفر نے مشتبہ مال لینا

نوارا نہ کیا اسے خیال تھا کہ یہ جائز طریقہ سے فراہم نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ عطیہ ٹھکرا دیا۔

اور دو درہم جو علالِ طیب تھے قبول کر لئے۔

۲۵۔ معتزلہ کے مناظرات

معتزلہ کا طریق جدل و بحث اور ان کے فرقے | ۵۵۔ فرقہ معتزلہ نے اپنے خصوم و اعداء وجود میں آیا۔ مقابلہ میں خواہ مخواہ ہوں یا شہید یا رافضی یا اہل بدعت یا رجال فقہ و حدیث تقریباً تین صدیوں تک امت مسلمہ کو معتزلہ نے مناظرات و مجادلات میں الجھائے رکھا۔ مرکز دائرہ وہی تھے اور یہ چکی انہی کے گرد گھومتی رہی۔ امراء کی مجلسوں میں وزراء کے محلوں میں علماء کے زاویوں میں مناظرے برپا ہوتے رہے۔ اختلافِ فکر و نظر کا چکر چلتا رہا۔ نئے نئے مذہب فرقے اور مسلک عالم وجود میں آتے رہے اور فکرِ اسلامی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ تیز فاریت یونانیت اور ہندیت کے دلکش خول بھی اس پر چڑھا دیئے گئے۔ معتزلہ کا اسلوبِ جدل و پیکار چند مخصوص امتیازات کا حامل تھا۔ اگرچہ وہ اپنا ایک منفرد رنگ رکھتا تھا۔ لیکن مقتضیاتِ دین سے متخالف نہ تھا۔ گو ان کا طریق استنباط جمہور امتِ اسلامیہ کے مقدماتِ استنباطیہ سے متباہن تھا۔

اس کے چند نمیزات یہ ہیں :-

آزادی = ۱۔ یہ لوگ بحث و تحقیق و زینِ اولہ اور امور میں بزرگ خود سوچ بچار کے عادی تھے۔ دوسروں کے پیچھے چلنے اور تقلید کے قائل نہ تھے۔ یہ آراء کا احترام کرتے تھے ناموں سے مرعوب نہ ہوتے تھے۔ ان کو حقیقت سے غرض نہ تھی۔ قائل اس کا کوئی ہوا یہی تو بات تھی کہ آپس میں ایک دوسرے کی تقلید بھی نہ کرتے تھے۔ ان کی روش کا محور یہ تھا کہ اصولِ دین میں اجتہاد سے کام لینے کا ہر شخص مکلف ہے۔ شاید یہی باعث ہوا کہ یہ فرقہ بہت سے ذیلی فرقوں میں بٹ گیا۔

وہ فرقے یہ ہیں :-

- (۱) واصلیہ :- یہ واصل بن عطاء کے پیرو تھے جو معتزلہ میں بڑی نمایاں شخصیت تھے
- (۲) ہذیلیہ :- ابوالہذیل علاف کے اتباع جو دوسری صدی ہجری میں معتزلہ کا پیشوا تھا۔
- (۳) نظامیہ :- یہ ابوالہذیل علاف کے شاگرد ابراہیم بن سيار نظام کی پیروی کرتے تھے

- (۴) حاطیہ - احمد بن حاطط کے اتباع
 (۵) بشریہ = ان کا شیخ بشر بن معتمر تھا۔
 (۶) معمریہ = معمر بن عباد سلمی کے پیرو۔
 (۷) مزادریہ = عیسیٰ بن صبیح کے پیرو جس کی کنیت ابو موسیٰ اور لقب مزادار تھا۔
 (۸) ثمامیہ = ثمامہ بن اشرس کے پیرو۔
 (۹) ہشامیہ = اصحاب ہشام بن عمر فوطی
 (۱۰) جاحطیہ = یہ مشہور ادیب اور عالم جاحظ کے پیرو تھے۔
 (۱۱) خیاطیہ = یہ ابو الحسن خیاط کی پیروی کرتے تھے۔
 (۱۲) جبائیہ = یہ امام ابو الحسن اشعری کے استاد جبائی کے اتباع تھے جو تیسری صدی ہجری میں معتزلہ کے امام تھے۔

(۱۳) ہشیمیہ = یہ امام جبائی کے بیٹے ابو ہاشم عبدالسلام کے معتقد تھے۔

۲۔ عقلی علوم سے استفادہ | ۵۶۔ معتزلہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اثبات عقائد میں عقل پر اعتماد رکھتے تھے۔ تاہم

قرآن سے بھی مدد لیتے تھے تاکہ جاوہ اعتدال سے ہٹنے نہ پائیں۔ حدیث پاک کو وہ زیادہ جانتے ہی نہ تھے۔ اس لئے کہ نہ وہ عقائد میں حدیث سے حجت لاتے تھے۔ نہ اس سے استدلال کرتے تھے۔

معتزلہ کی عقل پرستی کا یہ تقاضا تھا کہ وہ ان علوم سے بھی استفادہ کرتے تھے جن کا عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا بلکہ وہ خود بھی ان علوم میں حصہ لیتے تھے۔ دشمن کو پچھاڑنے اور دلیل کو مضبوط کرنے کے لئے جو کچھ ان علوم سے حاصل ہو سکتا تھا وہ لیتے تھے وہ کلام کے میدان میں حریفوں سے لڑے اور انہیں چت کر دیا اور ہر وہ مسلمان ان کے جھنڈے تلے آگیا جس نے کسی اجنبی ثقافت کو عقل عربی سے ہم آہنگ خیال کر کے قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو معتزلہ کے نظریات دینی روح فکر تیز پہ باری (جو معتزلہ کے دماغوں پر بری طرح مسلط تھی) اور عقل کو غذا دینے والے افکار فلسفہ کے جامع نظر آئے۔

اسی باعث معتزلہ میں ممتاز انشا پر دائر بلند پایہ عالم ماہر فلسفہ اور صاحب فہم اور آکا

لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ معترض کی تعداد میں بلاغت۔

۳۔ معترضہ کی فصاحت و بلاغت | ۵۷۔ معترضہ کی تیسری خصوصیت ان کی زیادتی اور ی شیریں بیانی اور قادر الکلامی تھی۔ اور

میں ایسے لوگ تھے جو بلند آہنگ خطیب تھے۔ جدل و پیکار کے فن سے واقف تھے اور کوزک دینے کے تمام پہلوؤں سے باخبر تھے۔ دشمن کو پھانسی دینا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ مثلاً واصل بن عطاء فرقہ معترضہ کے ایک نمایاں شخص تھے۔ یہ ٹہمے پایہ کے خطیب تھے۔ ان کی خطابت دل کے گوشوں تک پہنچتی اور اپنا اثر کرتی تھی۔ حاضر جوابی اور برہنہ میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے۔

نظام بھی معترضہ کے چوٹی کے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ نہایت ذہین اور نکتہ رس زبان کا فصیح ادیب اور شاعر تھا۔

ابو عثمان عمرو الجاحظ جس کے بارے میں ثابت بن قرہ صابی نے کہا تھا کہ «ابو عثمان جاحظ خطیب المسلمین شیخ المتکلمین اور رئیس المتقدمین والمتأخرین، جب بولتا تو بلاغت میں سبحان نظر آتا۔ مناظرہ میں نظام کا ہمسر تھا وہ ادب کا شیخ اور عربوں کی زبان تھا۔ اس کی تصنیفات علم و ادب کے سرسبز و شاداب باغات ہیں۔ اور اس کے خطوط پھل پھولوں سے لدی ہوئی ہنسیاں۔ جو اس سے بحث کرتا منہ کی کھاتا اور جو سامنے آتا عجز و نیاز بجالاتا۔»

۵۸۔ معترضہ جن فرقوں سے برسر پیکار ہے مجادلات میں معترضہ کے حرلیف

میں مجوس، ثنویہ، جبریہ اہل بدعت اور محدثین فقہاء تھے۔ وہ اشاعرہ اور ماتریدیہ سے بھی نبرہ آزمایا ہوئے تھے۔

کفار اہل بدعت اور محدثین و فقہاء وغیرہ کے ساتھ ان کے مجادلات کا ذکر ہم پہلے کرتے ہیں پھر مناسب جگہ پر اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مناظرات پر روشنی ڈالیں گے۔

مجادلات میں معترضہ کے حرلیف

۲۶۔ کفار اور اہل بدعت سے معتزلہ کے مناظرات

معتزلہ کے مناظرات کی خصوصیتیں | ۵۹۔ آخری عہد اموی اور صدر دور عباسی میں زنادقہ اور دوسرے اہل اہواء (بدعات) بہت زیادہ بڑھ گئے کبھی ظاہر ہو جاتے اور کبھی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اور پیراہن اسلام میں بلبوس ہو کر پوشیدگی کے ساتھ اپنی تعلیمات کو مسلمانوں میں رائج کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ ملت اسلامیہ کے جسم میں زہر داخل کر رہے تھے لیکن اس چابک دستی کے ساتھ کہ محسوس نہ ہوتا تھا اور متدین حضرات تک اس کے اثر سے بچ نہ سکتے۔ یہ لوگ اسلام کے بدترین دشمن تھے اور اس کو سخت نقصان پہنچانے والے تھے سازشی لطرائف کے ڈھنگ جانتے تھے اور دام بھرتنگ کے باعث کامیاب ہوتے تھے۔ ان حالات میں معتزلہ نے مقابلہ کی مٹانی اور ہر اس میدان میں ان کو چیت گرایا جس میں محاربہ اسلام کی غرض سے وہ نکلے۔

چنانچہ واصل نے زنادقہ کے محاربہ کے لئے متعدد شہروں میں اپنے رفقاء اور شاگرد پھیلا دیئے اور خود بھی اسلام کی طرف سے دفاع کیا۔ اس نے مانویہ کے رد میں ہزار مسئلہ نامی ایک کتاب بھی لکھی۔ اس کام کو اس کے بعد جانشینوں نے بھی جاری رکھا۔ ان کا طریق بحث زور دار اور دلیل پر مبنی ہوتا تھا۔ فصاحت و بلاغت ان کا خصوصی وصف تھا۔ علماء میں مہارت و مزاولت سے مخاطب کو قائل کرنے کی ان میں قابلیت تھی جس کا اثر یہ تھا کہ معتزلہ کے یہ مخالف ان کو دیکھتے ہی تلوار میدان میں ڈالتے اور سپر انداز ہو جاتے تھے۔ ایسے مخالف بھی تعداد میں کم نہ تھے جو مناظرہ و مجادلہ کے بعد مسلمان ہو جاتے۔ صرف ابو ہذیل غلاف کے ہاتھ پرتین ہزار سے زائد مجوس وثنویہ مشرف باسلام ہوئے جو نتیجہ تھا ابو ہذیل کی مناظرہ میں صداقت و پراعت اور موضوع بحث کی قوت کا۔ نیز اس بات کا بھی کہ ان زنادقہ کی باتیں کمزور اور بیوج ہوتی تھیں۔

اب ہم یہ بتانے کے لئے کہ معتزلہ کا طریق مناظرہ کیا تھا بعض واقعات یہاں نقل کرتے ہیں۔

”الاتصار میں لکھا ہے:-

” ایک مرتبہ مانوی مذہب کے ایک شخص اور ایک معتزلی کے مابین مناظرہ پایا ہوا۔ جس کی تفصیلات یہ ہیں۔ مانی مذہب والے سمجھتے تھے کہ صدق و کذب ایک دوسرے کی عین ہیں۔ صدق خیر ہے اسے نور نے پیدا کیا۔ کذب شر ہے اور وہ ظلمت کی مخلوق ہے۔ ابراہیم نظام نے اس کے جواب میں کہا۔

” یہ بتائیے کہ اگر کوئی آدمی جھوٹ بولتا ہے تو جھوٹا کون ہے؟“
 مانویہ نے کہا۔ ”ظلمت“

نظام کہنے لگا: ”لیکن اگر یہ شخص جھوٹ بولنے کے بعد نادام ہو اور کہے کہ میں نے جھوٹ بولا اور بُرا کیا۔ یہ لفظ کہ میں نے جھوٹ بولا کہنے والا کون ہے؟“
 اس بات پر مانویہ پریشان ہو گئے اور کچھ سمجھ نہ پائے کہ کیا کہیں۔ پھر نظام نے کہا:

”اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ مقولہ ”میں نے جھوٹ بولا اور بُرا کیا“ نور کا ہے تو یہ کذب ہے اس لیے کہ نور نے نہ بات کہی نہ اس سے اس کا صدور ممکن ہے۔ کذب تو شر ہے۔ بنا جس نور سے صدور شر ثابت ہوگا اور اس طرح تمہارا قول باطل ہو جاتا ہے۔ اور اگر تم یہ کہو کہ وہ ظلمت تھی جس نے کہا کہ میں نے جھوٹ بولا اور بُرا کیا تو اس نے سچ کہا اور صدق خیر ہے۔ لہذا ظلمت بے یک وقت حال صدق و کذب ہوئی اور یہ دونوں تمہارے نزدیک الگ الگ چیزیں ہیں، خیر الگ اور شر الگ۔“

دیکھئے معتزلہ کا طریق بحث و جدل! کہ مخالف کا پیچھا کیسے کرتے تھے اور مناظرہ پر کس طرح سب راستے بند کر کے لا جواب کر دیتے تھے۔

شرح العیون کے مصنف نے نظام اور صالح بن عبد القدوس کے ایک اور مکالمہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ صالح کا تعلق فرقہ سوفسطائیہ کے ساتھ تھا جو ہر چیز کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ حقائق الاشیاء کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ صالح کے لڑکے کا انتقال ہو گیا تھا۔ ابو ندیل عذاف اس کے یہاں تعزیت کے لئے گیا۔ نظام ابھی بچہ ہی تھا وہ بھی ہندیل کے۔

لے مانویہ جس کے ایک فرقے کا نام ہے۔ یہ فرقہ عجمی اور نصرانی عقائد کا مجموعہ مرکب تھا ان کی نسبت حکیم مانی کی جانب کی گئی ہے۔ یہ دیکھو جس کی طرح نور کو خالق خیر اور ظلمت کو خالق شر قرار دیتے تھے۔

کے پیچھے ہو لیا۔ ابو یزید نے اپنے دوست صالح کو غزوہ دیکھ کر کہا:
 ”جب تمہارے نزدیک ہر چیز ذہن انسانی کی پیداوار ہے تو تمہارے پریشان
 ہونے کا سبب کیا ہے؟“

صالح نے کہا:
 ”مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ مرنے والا میری تصنیف ”کتاب الشکوہ“ کا مطالعہ
 بھی نہ کر سکا۔“

ابو یزید نے کہا:
 ”کتاب الشکوہ کیا چیز ہے؟“

صالح نے کہا:
 ”میری ایک کتاب کا نام ہے جو اسے پڑھے گا وہ ہر چیز کو مشکوک نگاہ سے دیکھنے
 لگے گا۔ اس کی حد یہ ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں ان کے متعلق اس کا گمان یہ ہو گا کہ وہ
 موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح وہ غیر موجود اشیاء کو موجود تصور کرے گا۔
 یہ سن کر ناام نہ کیا:
 ”تو اپنے بیٹے کی موت میں بھی شک کیجئے اور سمجھ لیجئے کہ وہ راہیں اگر وہ فوت
 ہو چکا ہے۔ اسی طرح یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ کتاب کا مطالعہ کر چکا ہے۔ اگرچہ اس نے
 کتاب بالکل نہیں دیکھی۔“

آخری واقعہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ معتزلہ اپنے زنادقہ دشمنوں سے بہت اچھا
 سلوک کرتے تھے اور علماء کا اخلاق ہونا بھی ایسا ہی چاہتے تھے کہ ان کی فرائض لی خالصتاً دین
 تک کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں راہ ہدایت
 دکھا دیتا ہے۔

معتزلہ کے مجادلات زنادقہ اور مرتدین کے ساتھ | ۶۰۔ اس بحث کو ختم کرتے
 سے پیشتر ہم معتزلہ کے
 دو مجادلات و مناقشات بیان کرنے چاہتے ہیں جو انہوں نے زنادقہ اور مرتدین سے
 انجام دیئے۔ اس ضمن میں ہم بعض مناظرات کی تفصیلات بیان کریں گے۔

خلیفہ ماموں کا ایک مرتد خراسانی سے مناظرہ | ۶۱۔ خلیفہ ماموں کو معتزلی تصور کیا

جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معتزلہ کو "اصحابنا" (ہمارے رفقاء) کہہ کر پکارتا تھا۔ ان کے مناظرات بھی بڑی حد تک معتزلہ کے مناظروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ماموں کے دورِ خلافت میں ایک خراسانی مرتد ہو گیا۔ اسے جب مامونی دربار میں پیش کیا گیا تو یوں مناظر کا آغاز ہوا۔

ماموں: "میرے نزدیک تمہیں قتل کرنے سے یہ زیادہ اچھا ہے کہ تم زندہ رہو اور حق کی پیروی کرو۔ بری الذمہ ہو چکی بنا پر تمہیں معاف کرنا میرا نزدیک تمہیں تمہیں کرنے سے زیادہ قدر قیمت رکھتا ہے۔ پہلے تم عیسائی تھے پھر اسلام لائے جس سے تمہاری عزت میں اضافہ ہوا۔ تمہاری عمر اور طویل ہو گئی۔ پھر جس چیز سے تم مانوس ہو گئے تھے اس سے وحشت زدہ بھی ہو گئے اور ہم سے متنفر ہو کر چل دیئے۔ اچھا یہ بتائیے کہ جس چیز سے تمہیں الفت و محبت ہو گئی تھی پھر اس سے نفرت کیونکر ہوئی؟ اگر تمہارے خیال میں ہمارے یہاں تمہاری بیماری کا علاج موجود ہے تو وہ دوا کھا لو۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے کہ مریض طبیب سے مشورہ کرے۔ اور اگر تمہارا مرض لا علاج ہے تو کم از کم تم اپنے آپ کو معذور تصور کرو گے اور اپنے نفس کو ظامت بھی نہ کر سکو گے۔ اس صورت میں اگر تمہیں قتل بھی کریں گے تو وہ حکمِ شریعت ہوگا۔ یا تمہیں ہوش آجائے گا اور تم سمجھ لو گے کہ غور و خوض کرنے میں تم سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی اور حزم و احتیاط کا دروازہ کھٹکھٹانے میں تم سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔" مرتد: "میں مسلمانوں کا باہمی اختلاف دیکھ کر وحشت زدہ ہو گیا تھا۔"

ماموں:۔ ہمارا اختلاف دو قسم کا ہے (۱) وہ اختلاف جو اذانِ جنازہ کی تکبیر و تشہد نماز عید و تکبیرات تشریحی اور فتویٰ کے طرق و وجوہ میں پایا جاتا ہے ایسا اختلاف یا صحیح ہے بلکہ یہ دینی وسعت و سہولت کی دلیل ہے۔ جو شخص اذان و اقامت کے کلمات دو دفعہ کہے وہ ایسا کر سکتا ہے۔ جو اذان کے کلمات دو دفعہ اور اقامت کے ایک مرتبہ کہے تو وہ بھی گنہ گار نہ ہوگا۔ تم پچھتم خود دیکھتے ہو کہ مسلمان ان سبھی امور پر عمل کرتے ہیں اور کسی پر نکتہ چینی نہیں کرتے۔

(۲) دوسری قسم کا اختلاف وہ ہے جو کسی آیت قرآنی یا حدیث نبوی کی تفسیر و توضیح میں رونما ہوتا ہے جب کو عین آیت و حدیث پر سب کا اتفاق ہوتا ہے۔ اگر اس سے متنفر ہو کر تم نے اصل کتاب ہی کو خیر باد کہہ دیا تو پھر تورات و انجیل کی کسی

بیت کی تاویل و تفسیر میں سرے سے اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں (حالانکہ ایسی
 دنی زبان دنیا میں موجود نہیں) اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو اپنی کتاب کلام انبیاء اور آثار
 مجاہدہ کو تفسیر و توضیح سے بے نیاز کر دیتے۔ مگر دین و دنیا میں ایسی کوئی کتاب دیکھنے
 میں نہیں آئی۔ اگر مہاری بات تسلیم کر لی جائے کہ تاویل کتاب میں اختلاف نہیں ہوتا
 چاہئے) تو علمی محنت و کاوش کی بساط ہی الٹ دی جائے اور علمی میدان میں جو ٹکڑے دو
 باری ہے اس کا سلسلہ ہی ختم ہو کر رہ جائے۔ کسی کو کسی پر علمی تفوق حاصل ہو نہ ذہنی
 برتری۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایسا بنایا ہی نہیں۔

مرتد:- "میں شہادت دیتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ واحد و یگانہ ہے اور کوئی اس کا
 شریک نہیں۔ مسیح علیہ السلام اس کے بندے تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ نبوت و
 رسالت میں سچے تھے اور آپ بھی سچے امیر المؤمنین ہیں۔"

۲۷۔ افشین کا محاکمہ

دیار مشرق میں الحاد و تردقہ ۶۲۔ ہم تاریخ ابن جریر طبری سے یہ محاکمہ

دین کس طرح چکے چکے اسلام دشمنی میں مصروف رہتے اور معتزلہ ان کا دفاع کرتے اس سے یہ راز بھی طشت از بام ہوا کہ دشمنان دین کے ایک فرد (افشین) نے سپہ سالار کے منصب جلیل پر فائز ہونے کے باوصف بھی اپنے سینہ میں کفر کو جاگزیں رکھا اور ظاہر نہ ہونے دیا۔ اگرچہ اس کے اعمال نے اس کا بھانڈا بھوڑ دیا۔

محاکمہ کی تفصیلات کو حوالہ قرطاس کرنے سے قبل کسی حد تک ہم اس الحاد و پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ جو مشرقی بلاد اسلامیہ میں پسند والی ان فارسی اقوام کی بھوٹ پڑا تھا جو فارسی اقتدار کو بحال کرنے کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ اسی طرح مشرقی بلاد کے کچھ بت پرست خلافت عباسیہ کے عصر و عہد میں اپنے قدیم اصول و مبادی کو اجیاء کرنا چاہتے تھے۔ بلاد ایران و فارس کو جو حکومتیں ظہور اسلام کے بعد طیار ہو گئیں تھیں ان کے باقی ماندہ افراد ہمیشہ شیخ اسلام کو گل کر دینے کے لئے ہمہ تن رہے۔ جب بزور شمشیر وہ اپنے اقتدار کو بحال نہ کر سکے تو انہوں نے چاہا کہ اہل اسلام میں دینی جوش و خروش کے جذبہ کو امکانی حد تک کمزور کر دیں اور اس طرح لوگوں میں اپنے قدیم عقائد پھیلادیں۔

مثلاً اہل فارس نے مانوی مذہب کے اصول و مبادی کو زندہ کرنا چاہا جو عبائت کا مجموعہ مرکب تھا۔ اگرچہ کسی حد تک اس میں ہندی فلسفہ کی آمیزش بھی تھی۔ اہل فارس عبائت کے باقی و ناظم زردشت کے افکار کی نشر و اشاعت کے ہی خواہاں تھے۔ وہ دلہن مرقیون اور مزدک کے افکار و آراء کی نشر و تبلیغ کے بھی دلدادہ تھے جس کا زاویہ نکالنا یہ تھا کہ تمام مالی وسائل و ذرائع اور عورتیں کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں بلکہ سب لوگ ان میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کا مقصد و عہد یہ تھا کہ جس طرح ظہور اسلام سے یہ دنیا دیار فارس میں مٹ گئی تھی اسی طرح اسلامی سلطنت کو بھی نہیں ہنس کر دیا جائے۔

ماموں کے عہد خلافت میں بائک خرمی منظر عام پر آیا اور مزدکی مذہب کی دعوت دینے لگا۔
 دل نے سیف و سنان سے اس کا مقابلہ کیا اور اس کے اصحاب ز معتر لہا قلم و زبان سے
 کے نظریات کا ٹوڑا جھیا کرنے لگے۔ مزدکی مذہب کی تردید میں مشاہیر معتر لہ مثلاً محمد بن
 الملک الزیات احمد بن ابی داؤد اور دیگر اکابر نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ
 سب معتر لہ ارباب حکومت کے یہاں بڑے مقرب تھے۔ مزدکی مذہب کی مخالفت میں وہ
 مز لہ بھی پیش پیش تھے جنہیں پارگاہ سلطانی میں چننا اور در سوخ حاصل نہ تھا۔ مثلاً بشر
 معتر۔ جعفر بن مبشر جاحظ وغیرہ۔

خلیفہ ماموں نے اپنے بھائی معتر کو وصیت کی تھی کہ وہ سیف و سنان سے بائک خرمی
 کا مقابلہ جاری رکھے معتر نے مروج بھائی کی وصیت پوری کر دی اور اپنے ایک ممتاز فوجی
 سپہ سالار افشین کو یہ خدمت سپرد کی جس نے لڑ کر بائک خرمی کو تہ تیغ کر دیا۔
 حیرت ناک بات یہ ہے کہ افشین مسلمان نہ تھا بلکہ بظاہر مسلمان و بیاطن کافر تھا۔
 اور اسلام سے قبل سمرقند کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ افشین بھی عقیدۂ بت پرست
 تھا۔ بائک خرمی پر فتیاب ہونے کے بعد اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا اور اس کو دو
 تہذیبی علماء کے سامنے حاضر ہونے کے لئے کہا گیا تھا۔ چنانچہ ہم تاریخ طبری سے یہ حکم
 لے کرتے ہیں۔

۶۳۔ افشین کو حاضر کیا گیا۔ ابھی اسے قید یا ہشتت کی سزا
 نہیں دی گئی تھی۔ چند روٹا کو بھی اسے لعنت و ملامت کرنے

لے لئے بلایا گیا۔ دربار میں جتنے خواص تھے سب آ موجود ہوئے۔ افشین سے بات چیت کرنے کے
 لیے محمد بن عبد الملک زیات کو مقرر کیا گیا۔ جن لوگوں کو حاضر کیا گیا ان میں یہ لوگ شامل تھے۔

(۱) مازیار صاحب طبرستان (۲) موہب (جوس کا پادری) (۳) مرزبان بن ترکش والی سفد
 سفد سمرقند کے نواح میں ایک علاقہ کا نام ہے) (۴) سفد کے رہنے والے دو شخص۔

محمد بن عبد الملک نے ان دونوں آدمیوں کو بلایا یہ بوسیدہ کپڑوں میں لبوس تھے۔
 محمد نے ان سے دریافت کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ انہوں نے اپنی پشت سے کپڑا اٹھایا تو دیکھا کہ
 پشت پر گوشت و پوست تدار ہے۔

محمد بن عبد الملک نے افشین کو مخاطب کر کے پوچھا "ان دونوں کو پہچانتے ہو؟"

افشین :- ” ہاں! یہ موذن ہے اور دوسرا شخص امام ہے۔ انہوں نے اکثر دمنہ کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی تھی۔ میں نے ان کو ایک ایک ہزار درہ لگایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے والی سفد سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ ان کے مذہبی امور میں دخل اندازی نہیں کروں۔ یہ دونوں آدھی اہل سفد کے بت خانہ پر جا کر دسے اور وہاں سے تلوں کو نکال کر اسے مسجد بنا لیا۔ اس ظلم و تعدی کی بنا پر نیز اہل سفد کو ان کی عبادت گاہ کے روکنے کے جرم میں میں نے ان کو ایک ایک ہزار درہ مارا۔

محقق :- یہ کونسی کتاب ہے جسے آپ نے زرو جو اہر اور ویساج سے مزین کر رکھا ہے؟ حالانکہ اس میں کفریہ کلمات بھی ہیں۔“

افشین :- یہ کتاب مجھے اپنے والد سے ورثہ کے طور پر ملی تھی۔ اس میں علمی و ادب مذکور ہے۔ آپ نے جن کفریہ کلمات کا ذکر کیا میں بڑے احترام سے انہیں سنتا اور دیگر کلمات کو دیا کرتا تھا۔ یہ کتاب جب مجھے ملی اسی وقت زور سے آراستہ تھی۔ چونکہ میں زیورات بے نیاز تھا لہذا میں نے اسے جوں کا توں رہنے دیا اور زور کو دور نہ کیا۔ آخر آپ گھر میں بھی تو ”کلیلہ و دمنہ“ اور مزدک کی کتاب موجود ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کتابوں کی وجہ سے آپ مسلمان نہیں رہے۔“

پھر موبد آگے بڑھا اور کہنے لگا :

”افشین گلا گھونٹے ہوئے جانور کھایا کرتا تھا اور مجھے بھی اس پر مجبور کرتا۔ اس کا خیر ہے کہ یہ ذبح کردہ جانور سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ یہ ہر بدھوار کو سیاہ رنگ کی بکری درمیان سے کاٹ دیتا اور اس کا گوشت کھا جایا کرتا تھا۔ ایک دن افشین نے مجھ سے کہا ”میں نے ان (عربوں) کی سب باتیں مانیں جو مجھ پر ناگوار تھیں۔ زیتون کا تیل میں نے کھایا۔ اونٹوں پر سوار ہوا۔ جوتے پہنے۔ البتہ ان کی ایک بات سمجھی گوارا کی اور وہ یہ ہے کہ میرے سینے کا ایک بال بھی گرنے پایا۔“ افشین کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک غیر مختون ہے۔“

افشین :- ”اچھا یہ بتا بیٹھا کہ یہ شخص جو گفتگو کر رہا ہے۔ اپنے مذہب کے اعتبار سے قابل بھی ہے؟“ موبد ابھی تک مجھ سے گفتگو کر رہا تھا یہ خلیفہ متوکل کے عہد خلافت میں اسلام لایا۔ حاضرین نے کہا ”یہ قابل اعتماد نہیں۔“

افشین: پھر ایک ناقابل وثوق آدمی کی شہادت قبول کرنے کا کیا مطلب؟ بعد ازاں موبد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: "تمہیں ان حالات کا علم کیوں کر حاصل ہوا؟ کیا میرے اور تمہارے گھر کے درمیان کوئی دروازہ یا شکاف تھا جس سے جہانکرم تم یہ حالات معلوم کر لیا کرتے تھے؟"

موبد: "نہیں"

افشین: کیا میں اپنی زبان میں یہ باتیں تمہیں خود نہیں بتایا کرتا تھا؟"

موبد: "ہاں"

افشین: اس سے معلوم ہوا کہ تم بھروسہ کے آدمی نہیں۔ اس سے بڑھ کر تم بدعہد بھی ہو کیونکہ تم نے میرے ان بھیدوں کا بھانڈا بھوڑ دیا۔"

پھر موبد رخصت ہوا اور مرزبان بن ترکش آگے بڑھا۔ حاضرین نے افشین سے پوچھا: "اسے جانتے ہو؟"

افشین: "نہیں"

حاضرین نے مرزبان سے پوچھا: "اسے پہچانتے ہو؟"

مرزبان: "یہ افشین ہے۔"

حاضرین: "یہ مرزبان ہے۔"

مرزبان: "اجتہاداً! ملیح سازی سے کیوں اپنی جان بچا رہے ہو؟"

افشین: "ارے لمبی داڑھی والے کیا کہ رہے ہو؟"

مرزبان: "تمہارے اہل وطن تم سے کیا خط و کتابت کر رہے ہیں؟"

افشین: "جیسے میرے باپ دادا کو لکھا کرتے تھے۔"

مرزبان: "پھر بتا دیجئے۔"

افشین: "ہرگز نہیں"

مرزبان: "اشردمنہ زبان میں کیا انہوں نے فلاں فلاں باتیں نہیں لکھیں؟"

افشین: "ہاں"

مرزبان: "کیا عربی میں اس کا یہ مفہوم نہیں کہ 'یہ خط عہد سے اس کے الہ کی جانب ارسال ہے۔'"

افشین: "کیوں نہیں؟"

محمد بن عبدالملک :- یہ بات مسلمان کب گوارا کرتے ہیں؟ پھر فرعون کا گناہ کیا تھا
کہا کرتا تھا " اَنَّا رَقِيبٌ عَلَيْكُمُ الْاَعْلٰی "۔

افشین :- "ظہور اسلام سے قبل ہماری قوم کے لوگ ایسے الفاظ میرے باپ دادا کے
شان میں کہا کرتے تھے۔ میں نے چاہا کہ یہ سلسلہ باقی رہنے دیا جائے تاکہ وہ
میرے نافرمان نہ ہو جائیں۔

اسحاق بن ابراہیم :- ہم تمہاری قسم کا اعتبار کیونکر کریں۔ جب کہ ہم تجھے مسلمان سمجھتے ہیں اور تم
فرعون جیسا دعویٰ کر رہے ہو۔
پھر مازیا رطبرستانی آگے بڑھا۔

حاضرین :- "اسے پہچانتے ہو؟"

افشین :- "نہیں"

حاضرین : مازیا سے :- "اسے (افشین کو) پہچانتے ہو؟"

مازیار :- "جی ہاں ! یہ افشین ہے"

حاضرین افشین سے :- "یہ مازیا ہے"

"افشین :- "ہاں ! میں نے پہچان لیا"

حاضرین :- "تم نے اس سے خط و کتابت کی ہے؟"

افشین :- "نہیں"

حاضرین مازیا سے :- "کیا افشین نے تمہیں کوئی خط لکھا؟"

مازیار :- "افشین کے بھائی جاشن نے میرے بھائی قویہیار کو لکھا تھا کہ میرے تیرے

اور بابک کے سوا اس مذہب کی امداد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بابک نے تو اپنی حماقت

کیوجہ سے جان دی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اس کی جان بچ جائے۔ مگر اس نے ایک

نہ مانی۔ اگر تم (قویہیار) بغاوت کر دو تو میرے سہائم سے لڑنے والا کوئی نہ ہوگا

سب شہسوار جنگجو اور بہادر میرے ساتھ ہیں۔ اگر میں ان کو تمہارے خلاف

نبرد آزما ہونے کے لئے بھیج دوں تو ہم سے لڑنے والے صرف تین قسم کے لوگ

ہوں گے۔ (۱) عرب (۲) مغاربہ (۳) ترک۔ عرب تو کشتوں کی طرح ہیں کہ ان

کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈالو اور لاشی سے سر کھل دو۔ اور یہ مکھیال (مغاربہ) ان

تو (جانوروں کے) سر کھانے سے غرض ہے اور کسی بات سے سروکار نہیں۔ یہ ترک شیاطین تو بس ایک گھڑی ہیں ابھی ان کے تیر ختم ہو جائیں گے۔ اور ہمارے گھوڑے ان کو اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں گے مسلمانوں کی ہزیمت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محی دین کا بول بالا ہو جائے گا۔“

شہین :- ”یہ شخص اپنے بھائی اور میرے بھائی کے متعلق جو دعویٰ کر رہا ہے اس سے مجھے کیا سروکار؟ گہذات خود میں اسے خط لکھتا اور یہ مجھ پر اعتماد بھی کر لیتا تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی؟ جب میں عملی طور پر خلیفہ کی مدد کرتا ہوں تو حیلہ گری کے ذریعہ اس کی مدد کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ میں اس کی گردن پکڑتا اور خلیفہ کی بارگاہ میں حاضر کر دیتا اور اس طرح مجھے اس کا تقرب حاصل ہو جاتا جس طرح عبداللہ بن طاہر خلیفہ کا مقرب بنا ہوا ہے۔“

اتنے میں مازیار ایک طرف کوچل دیا۔

جب افشین مرتزبان اور اسحاق بن ابراہیم سے بات چیت کر چکا۔ تو ابن ابی داؤد نے افشین کو ڈانٹنا شروع کیا۔

شہین :- ”ابو عبداللہ! تم معمولی سی بات پر لوگوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔“

ابن ابی داؤد :- ”کیا تم ختنہ کر لچکے ہو؟“

شہین :- ”نہیں۔“

ابن ابی داؤد :- ختنہ کرانے سے کونسی چیز مانع تھی؟ حالانکہ اس سے اسلام کی تکمیل ہوتی ہے۔

افشین :- ”کیا اسلام میں تقیہ کی اجازت نہیں؟“

ابن ابی داؤد :- ”کیوں نہیں؟“

افشین :- ”مجھے موت کا ڈر تھا۔“

ابن ابی داؤد :- میدان جنگ میں تم نیزہ اور تلوار سے زخمی ہو جاتے ہو اور پھر بھی لڑائی سے باز نہیں آتے۔ مگر ختنہ کرانے میں تمہیں موت کا ڈر تھا؟

افشین :- ”یہ تو ضرورت کا تقاضا ہے۔ جس پر صبر کرنا پڑتا ہے اس کے برعکس ختنہ

خود کرایا جاتا ہے اور اس سے مجھے موت واقع ہونے کا خطرہ تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ

تھا کہ ختنہ کرانے بغیر اسلام مکمل نہیں ہوتا۔“

ابن ابی داؤد: "افشین کا معاملہ واضح ہو گیا پھر اسے قید کرنے کا حکم صادر کیا۔
یہ ہے افشین کے محاکمہ و مناظرہ کا واقعہ!

افشین کا واقعہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ معتزلہ کس طرح زلیغ و سلال سے متہم
کئے جانے والے لوگوں کا محاسبہ کرتے تھے یہ واقعہ اس عہد کی منظر کشی کرتا ہے کہ بعض لوگ
ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا کرتے تھے مگر بیاطن وہ کافر بنا کرتے تھے۔ اور
اگر افشین کی طرف مشوب کردہ سب جرائم درست ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دور
میں بہت سے لوگ اندرونی کھوٹ اور نفاق کے باوصف قیادت و قوت سے بہرہ ور
ہو گئے تھے۔

مذکرہ صدر محاکمہ سے تین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ افشین مومن نہ تھا البتہ اس کی شجاعت و لسانت شک و شبہ سے پاک ہے
وہ نہ بتوں پر ایمان رکھتا تھا اور نہ اللہ تعالیٰ پر۔ اس کا مقصد و حید حکومت
میں کسی اعلیٰ منصب کا حصول تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسے بابک خرمی کی ہم سر
کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ بچکچا پانہ متردد ہو گیا یہاں تک کہ اسے ملک عدم کا راستہ
دکھایا تاکہ اسے خلیفہ کا لقب حاصل ہو سکے۔

۲۔ بابک خرمی کے طرف داروں کو افشین کی یہ حرکت (بابک کو قتل کرنا اور شکست دینا)
پسند نہ آئی اور وہ اس کے خلاف خلیفہ کے کان بھرنے اور اس کے راز کو طشت ازبان
کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افشین کے خلاف شہادت دینے والے
غیر مسلم تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ کیونکہ قاری کے ذہن میں طبعاً یہ سوال ابھرتا ہے
کہ مخالف اسلام ہونے کے باوصف انہوں نے افشین کے خلاف کیوں شہادت دی؟

۳۔ محاکمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افشین بڑا سنگدل اور قاسی القلب تھا۔ اس کا دل
عربوں کے بغض و کینہ سے بھر پور تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ امام اور ہودن کو اتنی
سنگ دلانہ سزا نہ دیتا جو اس کے انسانیت و ایمان سے عاری ہونے کی عجزی
کرتی ہے۔

۲۸۔ مسئلہ خلق قرآن

مسئلہ خلق قرآن کی مختصر تاریخ | ۳۴۔ خلق قرآن کا مسئلہ تاریخ معتزلہ سے وابستہ ہے۔ جو نہیں معتزلہ کا ذکر آتا ہے یہ مسئلہ

ذہن میں ابھرتے لگتا ہے۔ معتزلہ ہی نے اسے خلافت عباسیہ میں اٹھایا اور پھیلایا۔ اس کے افکار سے متاثر ہو کر عباسی خلفاء نے محدثین و فقہاء کو جبراً اس کا قائل کرنا چاہا اور بعض کو آلام و شدائد میں بھی مبتلا کیا۔ خلفاء ثلاثہ مامون معتصم اور واثق کے عہد ہائے خلافت میں یہ مسئلہ لوگوں کے ذہنوں پر مسلط رہا اور ان کے نفوس و عقول کی پریشانی کا جب بتا رہا۔ اس دور میں آزادی فکر و نظر نے رخت سفر باندھا۔ نصوص کتاب و سنت کے دائرہ میں محدود رہنے والے اور الفاظ میں احتیاط برتنے والے شدید مصائب و آلام شکار ہوئے۔ ان کا جرم اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ وہ ہر آن کتاب و سنت پر جھگڑتے رہتے۔ مبادا ان کی فکر و نظر اور عقل و شعور میں کجی و انحراف واقع ہو جائے اور وہ جادہ مستقیم سے ہٹک جائیں۔

خلق قرآن کا مسئلہ متذکرۃ الصدور میں خلفاء سے قبل متعمد شہود پر جلوہ افروز ہوا۔

بعد بن درہم نے جب اس کا اظہار کیا تو خالد بن عبداللہ قسری والی کوفہ نے اسے موت لے کھاٹ اتار دیا۔ جہم بن صفوان نے بھی اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا۔ فرقہ جبریہ کا حال بیان کرتے ہوئے ہم نے بتایا تھا کہ جہم صفت کلام کی نفی کیا کرتا تھا۔ اس سے اس کا مقصد عبادت کی مشابہت سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس تھا اسی وجہ سے اس نے یہ نظریہ اخترع کیا کہ قرآن قدیم ہے اور مخلوق نہیں ہے۔

صفت کلام کی نفی اور معتزلہ | ۶۵۔ جب معتزلہ کا دور آیا تو وہ صفات معنوی کی نفی کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ارادہ سمع و بصر

کلام اور دیگر صفات کو صفات معنوی کہا جاتا ہے۔ جن صفات کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان کی تاویل انہوں نے یہ کی کہ یہ ذات باری کے اسماء ہیں صفات نہیں۔ نفی صفات کے ضمن میں جب انہوں نے صفت کلام کا انکار کر دیا تو اس سے باری تعالیٰ کے متکلم ہونے کی بھی

نفی ہو گئی۔ قرآن کریم کی جن آیات میں کلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ مثلاً کلم اللہ موسیٰ تکلیماً معترکہ اس کی تاویل یہ کرتے تھے کہ دیگر اشیاء کی طرح اللہ تعالیٰ نے درخت میں کلام کرنے کی قدرت پیدا کر دی تھی۔

معترکہ کا یہ قول کہ ”کلام اللہ کی پیدا کردہ ہے“ اور ”قرآن خدا کی مخلوق ہے“ اسی پر مبنی ہے۔ عباسی دور میں معترکہ اسی مسئلہ کے ہو رہے۔ یہاں تک کہ بعض فقہاء بھی ان کے ہم نوا بن گئے۔ چنانچہ بشر بن عیاض مرسی ایک عظیم فقیہ ہونے کے باوجود قرآن کے مخلوق ہونے پر بڑا زور دیتے تھے۔ ان کے محترم استاد ابو یوسف صاحب ایام ابی حنیفہ نے انہیں اس سے روکا بھی تھا۔ مگر وہ باز نہ آئے یہاں تک کہ ابو یوسف نے انہیں حلقہ درس سے نکال دیا۔

ہارون الرشید کے عہد خلافت میں خلق قرآن کے مسئلہ نے بڑا زور پکڑا۔ ہارون عقائد میں جدل و بحث کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ فلاسفہ کا انداز ہے۔ اس کے برعکس اس نے عقائد میں مجادلات برپا کرنے والوں کو قید خانہ میں بھی ڈال دیا تھا۔ معترکہ کا شمار بھی اپنی فرقوں میں ہوتا تھا جنہوں نے اعتقاد کی جدلیاں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ ہارون نے قرآن کو مخلوق یا غیر مخلوق کہنے والوں سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ جب ہارون کو بشر مرسی کے اس عقیدہ کا پتہ چلا تو کہنے لگا ”بچھا اگر میرا بس چلا تو میں اسے قتل کر دوں گا“ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بشر ہارون کے عہد خلافت میں منظر عام پر نہ آسکا اور پوشیدہ رہ کر زندگی کے ایام بسر کرتا رہا۔

ماموں کی معترکہ تواری | ۶۶۔ جب ماموں کا دور آیا تو اس نے اپنے گرد معترکہ کا ایک حلقہ جما لیا اور ان کے اکرام و احترام میں بے حد مبالغہ کرنے لگا۔

روایات میں مذکور ہے کہ جب مشہور معترکہ ابوشام قوطی دربار میں حاضر ہوتا تو ماموں اس کے احترام میں سر و قد کھڑا ہو جاتا اور کسی کے ساتھ یہ رویہ اختیار نہ کرتا اس کی وجہ یہ تھی کہ ماموں نے ابو یزید علق سے ادیان و مذاہب کا علم حاصل کیا تھا۔ علق معترکہ کے امہ میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ ماموں نسبت تلمذ اور علمی مشاغل کے باعث معترکہ مشہور تھا۔

ماموں ادیان و مذاہب پر بحث و تحقیق کرنے کے لئے مجلس مناظرہ منعقد کیا کرتا تھا

معتزلہ اس میدان کے شہسوار تھے اور علوم عقلیہ کی مہارت و مزادلت کے بل بوتے پر
 یہ دوسروں پر فوقیت رکھتے تھے معتزلہ کو خود بھی اپنی برتری و تفوق کا احساس تھا
 جب ماموں نے اپنے خواص اور حاشیہ نشین معتزلہ میں سے چن لئے تو اس سے معتزلہ کے
 احساس تفوق کو مزید شہ ملی۔ احمد بن ابی داؤد ماموں کا مقرب خصوصی تھا۔ جب ماموں کا
 عقیدہ بتایا تو اس نے اپنے بھائی معتصم کو وصیت کرتے ہوئے کہا۔

”ابو عبد اللہ بن ابی داؤد کو سفر و حضر میں ساتھ رکھنا اور ہر مشورہ میں شریک
 کرنا وہ اس کے ہر طرح اہل ہیں۔“

خلیفہ ماموں اور معتزلہ کی عقلی مقاربت اور خاص و عام امور میں مشارکت
 و مساوات کا انجام یہ ہوا کہ ماموں خلقِ قرآن کے عقیدہ کا اعلان کرنے پر اتر آیا۔ چنانچہ
 ۲۱۲ھ میں اس نے سرکاری طور پر اس کا اعلان کر دیا اور مجلس مناظرہ میں شرکت کرنے
 والوں سے جدل و بحث کا آغاز کیا مجلس مناظرہ میں وہ امکانی حد تک اپنے نظریہ کی
 تائید میں دلائل دیتا۔ تاہم اُس نے عقائد و آراء میں لوگوں کو آزاد رہنے دیا اور جن نظریات
 مانپانے کے لئے وہ تیار نہ تھے انہیں ان کے قبول کرنے پر مجبور نہ کیا۔

ماموں کا انتقال ۲۱۵ھ میں ہوا۔ اسی سال معتزلہ نے اس کے قلب و ذہن میں
 یہ وسوسہ ڈالا کہ لوگوں پر جبراً یہ عقیدہ لٹھو لٹھا جائے۔ ماموں ان دنوں رقبہ میں مقیم تھا
 اس نے وہاں سے اسحاق بن ابراہیم کے نام خطوط لکھے کہ محدثین و فقہاء کو خلقِ قرآن
 کے عقیدہ پر مجبور کر کے انہیں ابتلاء میں ڈالا جائے۔ اسحاق بن ابراہیم بغداد میں ماموں
 کے نائب کی حیثیت سے تعینات تھا۔ ماموں نے اس جہم کا آغاز سرکاری حکام سے کیا جو
 حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے یا حکام و احکام سے ان کے گہرے روابط تھے
 چنانچہ ماموں نے اپنے پہلے خط بنام اسحاق بن ابراہیم کے اخیر میں لکھا:

”سب قاضیوں کو حاضر کر کے انہیں امیر المؤمنین کا حکم نامہ سنائیے! ان کی
 آزمائش کیجئے اور خوب معلوم کیجئے کہ خلقِ قرآن کے بارے میں ان کی رائے کیا
 ہے۔ یہ بات ان کے ذہن نشین کر دیں کہ امیر المؤمنین جس شخص کے دینی عقائد سے
 مطمئن نہیں۔ نہ اس کی کوئی خدمت قبول کریں گے۔ نہ امور رعیت اسے تفویض کریں
 گے۔ جب یہ بات تسلیم کر لیں اور اس ضمن میں امیر المؤمنین کے ہم خیال ہوں تو مجمع عام

میں لوگوں کے روبرو ان سے پوچھے کہ خلقِ قرآن کے نظریہ سے وہ کہاں تک متفق ہیں؟ انہیں بر ملا کہہ دیں کہ جو شخص اس کا اعتراف نہیں کرے گا اس کی شہادت قابل قبول نہیں ہوگی۔ پھر امیر المؤمنین کو قضاۃ کے ماجرا سے آگاہ کیجئے۔ ان کے احوال و کوائف کی کڑی نگرانی کیجئے۔ تاکہ خدا کے احکام کو نافذ کرنے کی سعادت صرف انہی لوگوں کے حصہ میں آئے جو دین میں بصیرت رکھتے اور توحید خالص سے بہرہ ور ہیں۔

ماموں کا یہ خط اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ خلقِ قرآن کے نظریہ کو تسلیم نہ کرنے والوں کو وہ صرف دوسرا میں دیا کرتا تھا۔ (۱) مناصب سے محرومی (۲) عدول قبول شہادت۔ ماموں نے دوسرے خط میں کارپورازان حکومت کے ساتھ محدثین و مفتیان اور ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا جو مسند افتاء کی زینت تھے یا تعلیم و ارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ماموں نے حکم دیا کہ ان کو ابتلاء میں ڈالا جائے اور خلقِ قرآن کے بارے میں ان کا نقطہ نظر معلوم کیا جائے۔

خلقِ قرآن کے مسئلہ میں ماموں کا سچا و تشدد | ۶۷ - تیسرے خط میں ماموں نے

تشدد کا اظہار کیا۔ جو جوابات اس میں ہیں موصول ہوئے ان کا مذاق اڑایا اور اپنی تنقید شدید کے تیروں سے انہیں چھلنی کر دیا۔ اور پھر اسی پریس نہیں بلکہ مخالفین کے لئے شدید ترین سزائیں تجویز کیں۔ ماموں نے تیسرے خط میں "جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے جو ان کے ہم خیال ہوں اور اس سے باز نہ آئیں ان کو بیڑیاں پہنا کر امیر المؤمنین کے لشکر کی جانب بھیج دیجئے۔ ان کے ساتھ اپنے آدمیوں کا ہوتا ضروری ہے جو ان کی نگرانی کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ لشکر میں پہنچ جائیں۔ محافظین کا یہ دستہ انہیں پھر ان لوگوں کی سپرد کر دے جو صحیح و سالم انہیں امیر المؤمنین تک پہنچادیں۔ تاکہ امیر المؤمنین انہیں دلائل و براہین سے خلقِ قرآن کا قائل کر سکیں۔ اگر پھر بھی وہ توبہ نہ کریں تو انہیں نہ تیغ کر دیا جائے۔" یہ خط اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ ماموں تدریجی طور پر منکرینِ خلقِ قرآن کی سزائیں اضافہ کرتا رہا۔ پہلے اس کی سزا صرف مناصبِ جلیلہ سے محرومی تجویز کی پھر اس میں اضافہ کر کے سزائے موت دینے لگا۔

اسحاق بن ابراہیم نے بلا تحقیق و مراجعت اولین فرصت میں ماموں کی تعمیل ارشاد کر دی۔
فقہاء و محدثین اور اصحابِ فتویٰ کو بلا کر دھمکی دی کہ اگر انہوں نے خلقِ قرآن کے عقیدہ کو نہ مانا
تو انہیں شدید آلام و حوادث سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ سب نے بلا روک ٹوک یہ نظریہ
سلیم کر لیا اور اعلیٰٰ علیہ خلقِ قرآن کے قائل ہو گئے۔

فقہاء و علماء میں سے چار حضرات اس کڑی آزمائش میں ثابت قدم رہے اللہ تعالیٰ
نے انہیں سکون و اطمینان سے نوازا وہ حکمِ خداوندی پر قانع رہے اور ان کے پایہ استقلال
میں ذرا بھر لغزش نہ آئی۔ وہ چار بزرگ یہ تھے: (۱) امام احمد بن حنبل (۲) محمد بن نوح
(۳) قوایری (۴) سجادہ خوری

ان چاروں کو پابجلاں قید خانہ بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے بیڑیاں پہنے ہوئے عبادت
سیر کی۔ جب صبح نمود ہوئی تو سجادہ نے معتزلہ کی دعوت پر لبیک کہہ دی۔ بس کے نتیجے میں اس
کی بیڑیاں کھول کر اسے رہا کر دیا گیا۔ باقی اسی طرح محبوس و مقید رہے۔

اگلے روز پھر پوچھا گیا کہ خلقِ قرآن کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟
قوایری کا عقیدہ معتزلہ ہو گیا اور اس نے خلقِ قرآن کا نظریہ تسلیم کر لیا۔ اب اسے
بھی رہا کر دیا گیا اور صرف دو مردانِ خدا قید و بند کی صعوبتیں بھیلنے کے لئے باقی رہ گئے۔ ان
کو پابجلاں ماموں کی طرف بھیجا گیا جو ان دنوں "طرسوس" میں مقیم تھا۔ محمد بن نوح نے
راستہ ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جو علماء اس نظریہ کو تسلیم کر چکے تھے وہ آزادانہ طور
سے بخوشی خاطر طرسوس پہنچ کر ماموں سے ملے۔

۶۸۔ ابھی یہ قافلہ راستہ ہی میں تھا کہ
ماموں کی موت اور معتصم کا عہدِ خلافت

پہلے اپنے بھائی معتصم کو یہ وصیت کر گیا کہ وہ قرآن کے بارے میں اپنے بھائی کے مسلک سے
والبتہ رہے اور قوت و اقتدار کے بل بوتے پر لوگوں کو اس طرف دعوت دیتا رہے۔ گویا ماموں
کے اندر اس احساس نے کروٹ لی تھی کہ خلقِ قرآن کا عقیدہ ایک واجب الاتباع دین ہے
جس کی پیروی کرنا اس کی دعوت دینا اور بزورِ جبر لوگوں کو اس کا قائل بنانا اس کے فرائض
میں سے ہے۔ ماموں نے اپنے بھائی کو ان الفاظ میں وصیت کی تھی۔

”ابو اسحاق! آئیے میری نصیحت قبول کیجئے اور خلقِ قرآن کے بارے میں میری ہموار کردہ

راہ پر گامزن رہتے۔“

اسی وصیت کی کرشمہ سازی تھی کہ ماموں کی موت سے اس ابتلاء کا استیصال نہ ہو سکا۔ بلکہ اس کے دائرہ میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور حوادث و آلام کا سلسلہ پہلے بڑھ گیا۔ زیاد و عباد علماء و فضلا محدثین و فقہاء اور اہل فتویٰ خصوصی طور پر اس کا شکار ہوئے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی استقامت | ۶۹۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

مقبور و مقرب رہے آپ کا جسم کوڑوں سے زخمی تھا مگر آپ یہ سب کچھ برصحاء و رغبت برداشت کرتے رہے اور اپنے عقیدہ کی اہمیت منحرف نہ ہوئے۔ آپ اٹھارہ ماہ تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ معتزلہ سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے بھانپ لیا کہ آپ اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ چنانچہ آپ کو رہا کر دیا گیا اور آپ حسب سابق پھر افتاء و تحدیث کے مشاغل میں منہمک ہو گئے۔ اسی دوران معتصم نے وفات پائی۔

جب واثق باللہ مستند خلافت پر متمکن ہوا تو وہ بھی اسی ڈگر پر چلا جس پر اس کا والد اور چچا گام زن تھے جو لوگ خلقِ قرآن کے عقائل نہ تھے ان کو بڑی تکلیفیں پہنچائیں مگر امام احمد کو مزید نہیں ستانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو شہر بدر کرنے اور فتویٰ سے روکنے پر اکتفا کیا۔ واثق نے امام احمد سے کہا۔

”تہ اپنے یہاں لوگوں کو جمع کیجئے۔ نہ میرے شہر میں بود و باش رکھئے۔“

امام احمد اس کے بعد پوشیدہ رہے اور نماز کے لئے جانا بھی بند کر دیا۔ اپنی حال میں آپ خالقِ حقیقی سے بامیلے۔

عہدِ واثق کی فتنہ سامانی | ۷۰۔ واثق کے عہدِ خلافت میں یہ فتنہ امام احمد تک پہنچا

محدوم نہ رہا۔ بلکہ اور لوگ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان دنوں بڑے بڑے فقہاء کو پابہ زنجیر تقشیر و شجسس کے لئے بغداد بھیجا جاتا تھا۔ واثق کے عہد میں جو لوگ اس فتنہ کی بھینٹ چڑھے ان میں مصری فقیہ صاحب الامام الشافعی۔ یوسف بن یحییٰ جو لبطی بھی تھے۔ ان کو خلقِ قرآن کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کو پابہ زنجیر بغداد حاضر ہونے کے لئے کہا گیا اسی

یہ پائی کے عالم میں آپ نے وفات پائی اور اجر و ثواب کے مستحق قرار پائے۔
 نعیم بن حماد کا شمار بھی انہی خوش قسمت لوگوں میں ہوتا ہے جو عہد و اثن میں محتوب
 ہے۔ آپ نے قید و بند ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

احمد بن نصر خزاعی بھی انہی بزرگوں میں شامل تھے۔ انہوں نے جب خلق قرآن کے
 یہ کو تسلیم نہ کیا تو اثن نے انہیں مصلوب کر دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ ثمامہ بن اثرس معتزلی
 ان کے خلاف واثق کے کان بھرے تھے۔ روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ واثق ان کے
 پر نادم ہوا تھا اور ثمامہ اور ان تمام لوگوں پر عتاب نازل کیا جنہوں نے اسے ان کے
 کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

۱۷۔ اسی اندھا دھند فتنہ کے زمانہ میں جب دانش و
 حکمت کی آواز دب کر رہ گئی اور رحمت و رافت نے

نتیجہ خلق قرآن کا اختتام

موشی اختیار کر لی تھی۔ حتیٰ پرست علماء و جوں توں زندگی کے دن کاٹتے رہے۔ خلق
 قرآن کے عقیدہ سے سکوت اختیار کرنا اس دور میں ایک عظیم جرم تصور کیا جاتا تھا۔ جس
 سے ہوتے ہوئے کسی مومن کو سابقہ نیک اعمال صلاح و فلاح حسن سیرت و کردار اور اکرام و
 شرام کے بل بوتے پر معذور نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالات نے بڑی نازک صورت اختیار کر لی۔
 سادات کی وہ گرم بازاری رہی کہ لوگ اس صورتِ حال سے اکتا گئے۔ اس کی حد یہ ہے
 خود معتزلہ بھی اس سے نالاں تھے۔ بعض لوگ اس مذہبی جنون کو ایک مذاق سمجھنے لگے۔

روایات میں منقول ہے کہ ایک مسخر و اثن کے دربار میں حاضر ہوا اس کا نام عبادہ تھا
 وہ بولا: "امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ آپ کو قرآنی خدمت کا اجر عطا کرے۔"

واثق: "قرآن توفانی ہے۔"

عبادہ: "کو کونسی چیز فانی نہیں؟ میں تو حیران ہوں کہ قرآن جب فنا ہو جائے گا تو لوگ
 نماز تراویح کیسے ادا کریں گے؟"

واثق ہنس پڑا۔ کہنے لگا: "خدا تجھے غارت کرے چپ رہے!"

علامہ دمیری حیاۃ الحیوان میں لکھتے ہیں:-

"خلیفہ واثق نے آخر کار منکرین خلق قرآن کو سزا دینا ترک کر دیا تھا۔ انہی دنوں

ایک بوڑھا واثق کے پاس حاضر ہوا یہ بھی اس سلسلہ میں تکلیف اٹھا چکا تھا۔ وہ

واثق کو مخاطب کر کے کہنے لگا:

”جس عقیدہ کی دعوت نہ آنحضرت نے دی اور نہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی نے تم
اسی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہو اندریں صورت دوہی باتیں ہو سکتی ہیں یہ عقیدہ ان
کو معلوم تھا یا نہیں تھا۔ اگر آپ یہ شق اختیار کریں کہ وہ خلق قرآن کے نظر سے
واقف تھے مگر دانستہ خاموش رہے۔ تو میں آپ سے کہوں گا جس بات پر وہ خاموش
رہ سکتے تھے اس پر میرے اور آپ کے لئے بھی خاموشی کی گنجائش موجود ہے۔ اگر
آپ کہیں کہ وہ اس سے نا آشنا تھے اور صرف تم ہی اس سے آگاہ ہو تو یہ بات
بڑی حیرت ناک ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین
کو جو بات معلوم نہ تھی وہ آپ کو معلوم ہو گئی۔“

جب وثاق نے یہ بات سنی تو اپنی نشست گاہ سے کود پڑا بار بار ان الفاظ
کو دہراتا رہا اور بوڑھے کو معاف کر دیا۔ وثاق کا بیٹا جہدی باللہ ساوی ہے کہ اس
کے پیر میرے والد نے سابقہ طریقہ ترک کر دیا۔

۲۹۔ مسئلہ خلیق قرآن میں نقطہ اختلاف

۷۲۔ خلیق قرآن کا مسئلہ ایک طرف سے
 معتزلہ اور دوسری جانب سے محدثین و فقہاء

مسئلہ خلیق قرآن میں محل نزاع کی تعیین

کے مابین مہرکتہ الآراء بنا ہوا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے اور اسے فراہوش کرنا قرین
 عقل و دانش نہیں کہ مسئلہ زیر بحث تھا بھی بڑا دقیق و عولص! امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ
 موضوع زیر بحث میں محدثین و فقہاء کے ہموا تھے۔ لہذا ہم ان کی زبان سے اس مسئلہ کی عقدہ
 کشائی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے بیان سے محدثین کے نقطہ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے۔

امام احمد اور معتزلہ کے تند و تیز مسلک و منہج پر روشنی ڈالنے سے قبل ہم یہ بات بتا دینا
 چاہتے ہیں کہ مسئلہ خلیق قرآن میں جن علما کی رائے کو قدرت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے
 امام احمد بن حنبل کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ سیاسی بات پر متفق المراد تھے
 ہیں کہ تلاوتِ حادث (قدیم نہیں) ہے۔ لہذا قرآن کے حروف کا تلفظ بھی حادث ہے
 اس لئے کہ وہ قاری کا ایک وصف ہے اور اس کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ بلاشبہ
 انسان کے تمام اعمال حادث ہیں۔

سب علماء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ قرآن کے حروف جو سیاہی سے لکھے ہوئے
 ہیں، حادث ہیں۔

علماء کا قول ہے کہ قرآن پر دو مختلف اعتبارات سے نگاہ ڈالنا چاہئے۔ (۱) اس
 کے مصدر و ماخذ کو دیکھا جائے جو ذاتِ باری تعالیٰ اور موصوف بالکلام ہے۔ یہ قرآن
 اس کا کلام پاک ہے۔

(۲) دوسرا یہ کہ قرآن کے حروف پر نگاہ ڈالی جائے اور ان کلمات کو دیکھا جائے جو
 حروف سے ترکیب پاتے ہیں۔ پھر معانی و مفہام کی جانب توجہ مبذول کی جائے جن پر یہ
 کلمات دلالت کرتے ہیں۔

یہی دونوں امور مسئلہ خلیق قرآن میں مرکز اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں:
 امر اول = جہاں تک امر اول کا تعلق ہے معتزلہ اللہ تعالیٰ سے صفتِ کلام کی نفی کرتے ہیں

کیونکہ یہ حوادث کی صفات میں سے ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے کلام کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلام کو ایک جگہ خلق کر دیا اور وہاں سے اس کا ظہور ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو مکالمہ ہوا اس کی اصلیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذرخت میں کلام کی قدرت پیدا کر دی تھی۔ اس کے برعکس محدثین و فقہاء اللہ تعالیٰ کے صفت کلام کا اثبات کرتے ہیں۔

نبیائے ان کی رائے میں قرآن کریم خدا کا کلام ہے اور اس کی دیگر مخلوقات کی طرح ایک مخلوق نہیں ہے۔ معتزلہ کا قول ہے کہ قرآن کریم خدا کا پیدا کردہ کلام ہے جو بذریعہ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

امر ثانی = معتزلہ پڑھے جانے والے حروف اور ان کے معانی کو بھی مخلوق قرار دیتے ہیں جب کہ امام احمد بن حنبل اور اہل سنت ان کو اس لئے مخلوق تصور نہیں کرتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا مظہر ہیں۔ مگر یہ بات محل نظر و فکر ہے کہ کیا یہ ذات باری کی طرح قدیم بھی ہیں یا نہیں؟

امام احمد کے نظریات کا جو یا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ آپ پہلے اس مسئلہ میں توقف کرتے تھے پھر اعلانیہ اس پر اظہار خیال کرنے لگے آپ سے یہ الفاظ منقول ہیں۔

”جو قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہے وہ جہتی ہے اور جو اسے غیر مخلوق کہتا ہے وہ بدعتی ہے۔“

جب مسئلہ خلق قرآن میں عجم بلوئی ہوا تو آپ بمطابق اس رائے کا اظہار کرنے لگے کہ قرآن کے الفاظ و معانی ہر دو غیر مخلوق ہیں۔ آپ نے اپنے مکتوب تمام تالیف متوکل میں صراحت لکھا تھا:-

”مستعد بزرگان سلف سے مروی ہے کہ وہ قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے تھے میرا ذاتی خیال بھی یہی ہے۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بات وہی قابل اعتماد ہے جو کتاب اللہ میں مذکور ہو یا نبی کریم صحابہ اور تابعین سے منقول ہو۔ جو بات ان دلائل سے ثابت ہو اس میں کلام کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔“

امام احمد کے یہ بیانات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ متاثر رہنے کے بعد آپ اعلانیہ قرآن کو غیر مخلوق کہنے لگے تھے۔ مگر بایں ہمد امام احمد نے کبھی قرآن کو قدیم نہ کہا

اور اس میں ہمیشہ متوقف رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدامتِ قرآن کا مسئلہ خالص ایک کلامی مسئلہ ہے جس میں آپ کو چنناں جہارت نہ تھی۔

معتزلہ کے جور و تشدد کے اسباب

۱۳۰۔ ابیہم معتزلہ کے معارضین و مقابل نظریہ تھا معتزلہ جس کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ ہم نے معتزلہ کا زاویہ نگاہ بھی مبرہن کر دیا ہے کہ وہ قرآن کو حادث و مخلوق سمجھتے تھے اور اس کی قدامت کے قائل نہ تھے۔

یہ دونوں نقطہ ہائے نظر اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ دلیل و برہان رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے قائل کو بھی کافر نہیں کہہ سکتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ معتزلہ نے اہلِ جدل و نظر ہونے کے باوصف مسندِ اقتدار کی زینت بننے کے بعد اپنے مناظرات و مجادلات کو حرب و پیکار کی صورت میں کیوں بدل دیا؟

جہاں تک تینوں عباسی خلفاء، ماموں معتصم اور واثق کا تعلق ہے وہ چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت صرف مظاہر کی تھی۔ اہلِ الزائے دراصل معتزلہ ہی تھے۔ تمام خطوط و صحایا احمد بن ابی داؤد کے گوشہ ہوتے تھے۔ عین ممکن ہے کہ ماموں کے مرض الموت کے دوران احمد بن ابی داؤد نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور اس کی طرف سے از خود یہ خطوط لکھ دیئے۔ اس کی سب سے روشن دلیل یہ ہے کہ جور و ستم کے سب مظاہرے اور خطوط وغیرہ اسی زمانہ میں لکھے گئے۔ جب ماموں بغداد سے باہر من الموت میں مبتلا تھا۔

انہی وجوہات کی روشنی میں ہمارا یہ سوال معتزلہ پر وارد ہوتا ہے اور ہم ان کی برأت کے لئے کچھ عذرات بھی تلاش کرتے ہیں۔ یا (کم از کم) صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ ان عذرات کے پیش نظر معتزلہ کے طعن و ملامت میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس سے معتزلہ کے جور و ستم کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ امام احمد بن حنبل جینیہ صلحاء و اقیاء پر ظلم و تشدد کے جواز کی کوئی صورت ہی نہیں۔

جن عذرات کی بناء پر معتزلہ کے جرائم بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں یا طعن و ملامت کا کلیتہً ازالہ ہو جاتا ہے وہ اہل سنت کا یہ قول ہے کہ قرآن غیر مخلوق ہے اور اللہ کا کلام ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا کہ قرآن قدیم بھی ہے جس سے نہ ساری کو شکوک و شبہات پیدا

کرنے کا موقع مل سکتا ہے اور وہ مسلمانوں کو اس عقیدہ پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تھے یا اللہ کی طرح قدیم تھے۔ وہ جمہور مسلمانوں میں ان عقائد کی تشریح بھی کیا کرتے تھے۔ کتاب تراث الاسلام (LEGACY OF ISLAM) میں یوحنا دمشق سے منقول ہے جو ہشام بن عبد الملک کے زمانہ تک عہدہ ہائے حلیہ پر فائز رہا کہ وہ بعض عیسائیوں کو ایسی باتیں سکھاتا جن سے مسلمانوں کے عقائد میں بگاڑ پیدا ہو وہ کہا کرتا تھا:

”جب کوئی عرب تم سے پوچھے کہ تم مسیح کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو تو اسے کہو میں انہیں ”کلمۃ اللہ“ قرار دیتا ہوں۔ پھر مسلمان سے پوچھئے ”قرآن میں مسیح کو کس نام سے یاد کیا گیا ہے؟“ جب تک مسلم اس سوال کا جواب نہ دے آپ خاموش رہتے! مسلمان یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ ”مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول اس کا کلمہ و روح تھے جو اس نے مریم کے لطن میں پھونکی۔ پھر مسلم سے پوچھئے ”خدا کا کلمہ اور روح مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟“

اگر مسلمان جواباً کہے کہ مخلوق ہے۔ تو اس کی تردید میں یوں کہے ”کہ (روح ازل) ذات باری موجود تھی اور کلمہ و روح موجود نہ تھی۔ یہ سن کر عرب خاموش ہو جائے گا اور کچھ جواب نہ دے سکے گا۔ کیوں کہ ان عقائد کا حامل مسلمانوں کی نگاہ میں زندق ہے۔“

معتزلہ کے افکار غیرت ایمانی کے ٹینہ دار تھے | خلاصہ کلام! نصاب

کرتے تھے معتزلہ جو دیگر ادیان و مذاہب اور مذاقہ کے خلاف صفت آراء دہتے تھے۔ عیسیٰ ایسی باتوں سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے؟ یہی وجہ تھی کہ جو قرآن کو غیر مخلوق کہتا معتزلہ اسے قدامت قرآن کا قائل گردانتے جس سے نصاریٰ کے عقیدہ کو شہ طعی ہے نظر بریں معتزلہ کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ اس قول سے اجتناب واجب ہے تاکہ نصاریٰ سے مسلمانوں کے خلاف احتجاج نہ کر سکیں اور دین اسلام میں رخنہ اندازی کا یہ باب مسدود و مقفل رہے۔ مزید برآں معتزلہ صدق دل سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ انہی کے عقائد قرین صدق و یقین ہیں۔ معتزلہ کا گمان تھا کہ قرآن کے بارے میں محدثین کا زاویہ نگاہ بعینہ وہی ہے۔ جیسا نصاریٰ کا عقیدہ مسیح کے بارے میں! اور ان

یہ سب سے کوئی فرق ہی نہیں۔ علاوہ ازیں اس سے تعددِ قدام بھی لازم آتا ہے۔ نیز قیاحت لازم آتی ہے کہ ذاتِ باری کی طرح قرآن بھی قدیم ہے۔ جب معتزلہ کے افکار و راء یہ ہیں تو ان کا یہ موقف اسلامی غیرت و خودداری کا آئینہ دار ہے اور اس کا محرک بذبہ ایمان و ایقان ہے۔

اگر ایک طرف امام احمد بن حنبل اور ان کے انخوان کرام محدثین و فقہاء اسلام کے لفظ و دفاع کا فریضہ انجام دیتے تھے تو دوسری طرف معتزلہ کا مطمح نظر بھی یہی تھا۔ جو بی اسلام کو زک پہنچانے کے درپے ہوتا۔ معتزلہ آگے بڑھ کر یہ رخصت بند کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کا خارج از اسلام ہونا لازم نہیں آتا۔ ہاں! یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں شغول نہ ہونا زیادہ بہتر تھا جیسا کہ امام احمد اور دیگر محدثین کرام کا نقطہ خیال تھا۔ مگر اسلام کے اعداء و خصوم نے یہ باتیں پھیلا دی تھیں۔ ان حالات میں دفاعِ اسلام کا فریضہ ادا کرنا حقیقت کو اہم نشرح کرنا اور اس کی دعوت دینا ہر مسلمان کے لئے بعد ناگزیر تھا۔

۵۔ خلیفہ ماموں کی طرف سے جو خطوط انصاف و اطراف میں بھیجے گئے ان میں معتزلہ نے ان باتوں کی تصریح کی تھی اور قائلینِ قدامت

معتزلہ کی نگاہ میں جمہور اہل اسلام کے عقائد مسیحی ذہن کی پیداوار تھے!

قرآن کی اس اعتبار سے تردید کی کہ یہ نظریہ بعینہ اسی طرح ہے جیسے نصاریٰ مسیح کے بارے میں کہتے تھے ایک خط میں تحریر تھا:

”قرآن کو غیر مخلوق قرار دینے کا عقیدہ عیسائیوں کے اس نظریہ سے ہم آہنگ ہے کہ

”مسیح علیہ السلام خدا کی مخلوق نہیں بلکہ کلمۃ اللہ ہیں۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ معتزلہ اس بات سے آگاہ تھے کہ نصاریٰ قرآن کے اس

بیان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ مسیح ”کلمۃ اللہ“ تھے۔ شاید اسی وجہ سے معتزلہ کے ذہن میں

اس وسوسہ نے گروٹ لی کہ قدامتِ قرآن یا اس کے غیر مخلوق ہونے کا عقیدہ جو قدیم قرآن

کی جانب مودی ہے۔ مسیحی ذہن کی پیداوار ہے اور یہ ان افکار میں سے ہے جو مسلمانوں میں

نشر کئے گئے اور جمہور مسلمانوں نے تقدسِ قرآن کے نقطہ خیال سے اسے قبول کر لیا۔

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ نصاریٰ نے اہل اسلام کے اس نظریہ سے بھی فائدہ اٹھایا

تھا کہ قرآن کے حدوث و قدامت کی بحث نہ چھڑی جائے وہ اس پر قیاس کرتے ہوئے کہتے

تھے کہ مسیح مقام الوہیت پر فائز تھے اور ان کے اس مرتبہ و مقام کو زیر بحث نہیں لانا
مشہور معتزلی ادیب جاحظ نے اپنے ایک مکتوب "النصاری نامی میں لکھا ہے کہ اعداؤ اس
قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے نظریہ سے بڑے خوش ہوتے ہیں اور محدثین و فقہاء کے خیالات
کمان میں فرحت و انبساط کی ہر دوڑ جاتی ہے اور وہ دل سے اس بات کے آرزو مند ہوتے
ہیں کہ یہ نظریات لوگوں میں پھیل جائیں۔

۷۶۔ یوحنا مشقی اور اس کے ہمہوا مسلمانوں
قدامت قرآن سے تعدد الہ کا لزوم | جن عقائد کو پھیلاتے تھے اگر ان کو معتزلہ کے

جدد و استبداد سے بے تعلق بھی سمجھ لیا جائے تو ہم لکھتے ہیں کہ محدثین و فقہاء کے اقوال
ڈانٹے نصاریٰ کے نظریات سے جاتے ہیں۔ کتابوں میں عام طور سے اس امر کی صراحت
ملتی ہے کہ قدمت قرآن کو تسلیم کرنے سے الہ کا تعدد لازم آتا ہے۔ نصاریٰ اسی ڈگر پر
پہلے قدمت مسیح کا دعویٰ کیا۔ پھر انہیں الہ بنایا اور ان کی عبادت شروع کر دی۔ معتزلی
یہ خطرہ دامنگیر تھا کہ عوام میں یہ عقیدہ پھیل جائے اور ایک زمانہ وہ آئے جب لوگ حضور
عیسیٰ کی طرح قرآن کی پوجا کرنے لگیں۔ مزید خطرہ کا باعث معتزلہ کا یہ احساس تھا کہ عوام
فقہاء کے گردیدہ تھے اور ان کی ہر بات پر اعتماد کرنے کے عادی تھے۔

۷۷۔ ہمارے خیال میں ان عذرات کی بناء پر معتز
معتزلہ کے ظلم و جور کے ثمرات | کا جرم بڑی حد تک خفیف ہو جاتا ہے۔ اگرچہ کلید
اس کا ازالہ نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معتزلہ کا جور و تشدد کیسا رنگ لایا اور کیا
سے خاطر خواہ نتائج و ثمرات برآمد ہوئے یا نہیں؟

معتزلہ کے ظلم و جور کا نتیجہ یہ ہوا کہ نشاۃ ستم بننے والوں کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھ
جانے لگا۔ ان کے عقائد و افکار لوگوں میں خوب پھیلے معتزلہ جبر و تشدد سے جو باتیں منوان
چاہتے تھے۔ کوئی انہیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا بلکہ لوگوں نے محدثین کے اقوال کو مبالغہ
آمیزی کی حد تک تسلیم کیا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ان حروف و کلمات کو قدیم نہیں کہتے
تھے جن کی روزمرہ تلاوت کی جاتی ہے اور انہیں زبان سے ادا کیا جاتا ہے۔ آپ کے فقہاء و
اتباع بھی ان کی قدمت کے قائل نہ تھے۔ جب متاخرین کا دور آیا تو مسئلہ زیر بحث میں تبد
پیدا ہوئی۔ بہت سے مفکرین اسلام معتزلہ کے ہمہوا بن گئے۔ مگر یہ ظلم و تشدد کے نتیجہ میں نہیں

اس کی وجہ وہ مجادلات و مناقشات تھے جو فریقین میں برپا ہوا کرتے تھے معتزلہ کے رسائل
مطوطے بھی اس میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا۔ اگر ظلم و تشدد کی کار فرمائی نہ ہوتی تو معتزلہ کے
مآخذ اس سے کہیں زیادہ پھلتے پھولتے اور ان کی تاریخ بھی خون کے دھبوں سے طوٹ نہ ہو پاتی۔

۷۸۔ یہ میں معتزلہ کے افکار و آراء اور ان کے مجادلات
کا معتزلہ کا خلاصہ اور اسات پر مشتمل چند اوراق! ان سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ معتزلہ ہی دراصل حکماء اسلام تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے
عقل و فکر کی روشنی میں اسلامی عقائد کا مطالعہ کیا اور پھر اسلامی حقائق ہی میں
حدود و محصور رہے۔ ان کے زیر سایہ چلنے پر اکتفاء نہ کیا۔ معتزلہ عقائد سے متعلق
نصوص قرآنیہ پر فلسفیانہ نگاہ ڈالتے اور ان حقائق کے فہم و ادراک میں غوطہ زن ہوتے
تھے جو ان سے مستفاد ہوتے۔ اس طرح نہ شریعت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پاتا نہ
نصوص کی پیروی میں فرقا آتا۔

۲۔ دوسرا یہ کہ اس دور میں معتزلہ ہی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا
کیا تھا۔ وہ معتزلہ ہی تھے جو دفاع اسلام کی خاطر زنادقہ ملاحدہ اور کفار کے سامنے
سینہ سپر ہو گئے اور اس طرح اعداء دین کے حملوں سے اسلام کو بچایا۔ عباسی خلافت کے
انہام میں الحاد و زندقہ کا جو طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سدباب کرنے کے لئے معتزلہ
کا وجود از نس ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اولین عباسی خلفاء معتزلہ کی حوصلہ افزائی کیا
کرتے تھے خلیفہ ہارون الرشید نے پہلے پہل ان کی بڑی مخالفت کی تھی اور بعض کو قید و بند
کی صعوبتوں سے بھی دوچار کیا۔ آخر کار جب دیکھا کہ معتزلہ بت پرست فرقوں مثلاً سمینیہ وغیرہ
کے خلاف صف آراء رہے اور اس طرح دین اسلام کی مدافعت کرتے ہیں تو انہیں رہا کر دیا۔
۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ معتزلہ میں علمی اور فکری شد و ذہن پایا جاتا ہے۔ مگر فکری
شد و ذہن کا ہر اس شخص میں پایا جانا ضروری ہے جس نے عقل کی باگ ڈور کو ڈھیلا
چھوڑ دیا ہو۔ اگرچہ وہ نصوص کا دامن بھی تھامے رہتا ہو اور ان کے سایہ سے جدا
ہونا اسے گوارا نہ ہو۔

۳۰۔ اشاعرہ

اشعری مکتب خیال کا پس منظر | ۷۹۔ محدثین و فقہاء معتزلہ کے مظالم کی خصوصیت
آماجگاہ تھے۔ چنانچہ کوئی مشہور محدث و فقیہ

ان کے تیز ظلم سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ انہیں نفرت و حقارت کی نگاہ
سے دیکھنے لگے۔ ان کے خلاف بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور لوگ اس بات کو مطلقاً
بھول گئے کہ انہوں نے کوئی نیکی کا کام بھی انجام دیا۔ اسلام کی مدافعت کی اہم ذمہ داریوں اور اہل بدعت
کے سامنے سینہ سپر ہوئے تھے۔ لوگوں کے ذہن میں صرف یہ بات محفوظ رہی کہ معتزلہ نے سلاطین
وقت کو ہر متقی امام اور نیک بنیاد محدث کے خلاف بھڑکانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

جب خلیفہ متوکل کا زمانہ آیا تو اس نے معتزلہ کو بارگاہِ خلافت سے نکال کر ان کے مخالفین
کو شرفِ باریابی عطا کیا۔ متوکل نے علماء کی بیڑیاں کھول کر ان کو قید و بند کی صعوبتوں سے
آزاد کیا۔ فقہاء اور وہ لوگ جو عقائدی مسائل میں ان کے بھنوا تھے خم ٹھونک کر معتزلہ کے خلاف
میدانِ کارزار میں نکل آئے۔ جو علماء معتزلہ کے خلاف برسرِ پیکار تھے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو مناظرات میں معتزلہ کی طرح ماہر اور
رکھتے تھے مگر ان کا وہ آرا میں معتزلہ کے ہم خیال نہ تھے یہ معتزلہ کے حق میں شمشیر آبدار سے کم نہ تھے
عام و خاص سب ان کی حمایت و نصرت کا دم بھرتے اور خلفاء بھی ان کا ساتھ دیتے تھے
تیسری صدی ہجری کے اخیر میں دو آدمیوں نے بڑا نام پایا ایک ابوالحسن اشعری تھے
جو بصرہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ دوسرے ابومنصور ماتمیدی تھے جو سمرقند میں منظرِ عام
پر آئے یہ دونوں باہمی اختلافات کے باوجود معتزلہ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ ہم پہلے امام
ابوالحسن کا حال لکھیں گے۔ بعد ازاں امام ابومنصور ماتمیدی پر تبصرہ کریں گے۔

امام اشعری کی ولادت و وفات

۸۰۔ ابوالحسن اشعری سنہ ۲۶ھ میں
بصرہ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۳۳ھ کے لگ بھگ

وفات پائی۔

امام اشعری معتزلہ کے ساختہ پر داختہ اور معتزلہ کے شیخ العصر ابوعلی جبائی کے شاگرد
تھے امام اشعری کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ زمانہ شاگردی میں اپنے استاد کی

صرف سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔

اگرچہ اشعری معتزلہ کے دسترخوانِ علم و فضل سے فیض یافتہ تھے مگر ان کا رجحان و بیان محدثین و فقہاء کی جانب بڑھتا گیا اور وہ تدریجی طور پر افکارِ معتزلہ سے دور و تے چلے گئے۔ حالانکہ نہ وہ کبھی حلقہء حدیث میں شامل ہوئے اور نہ محدثین کے طرز پر انہوں نے عقائد کا مطالعہ کیا تھا۔

۸۱۔ امام اشعری کچھ عرصہ تک کنج خلوت میں مقیم رہ کر امام اشعری کی تقریر پر فریقین کے دلائل کا موازنہ کرتے رہے اور آخر کار ایک نتیجہ پر پہنچے۔ چنانچہ لوگوں کو حاضر ہونے کے لئے کہا اور بروز جمعہ برسر منبر جامع مسجد میں لوگوں سے یوں مخاطب ہوئے:

ارے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میرا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے برا کیا اب اس سے توبہ کرتا اور معتزلہ کی تردید کے درپے ہوں۔ اب میں معتزلہ کی فضیحت و رسوائی کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کروں گا۔

لوگو! میں کچھ عرصہ غائب رہ کر دلائل کا موازنہ کرتا رہا اور مجھے ان میں کچھ فرق نظر نہ آیا۔ میری نگاہ میں سبھی دلائل یکساں نوعیت کے تھے۔ کسی دلیل کو دوسری کے مقابلہ میں ترجیح حاصل نہ تھی۔ میں نے بارگاہِ ایزدی میں التجاء کی کہ مجھے راہِ حق پر گامزن کرے۔ چنانچہ جو ہدایت مجھے دربارِ ربی سے ارزانی ہوئی اسے میں نے اپنی کتابوں میں ودیعت کر دیا۔ سابقہ عقائد کے بارہ کو میں نے یوں اتار پھینکا جیسے یہ لباس اتار رہا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا کپڑا جیسے اوڑھ رکھا تھا اتار دیا۔ اور اپنی کتابیں جو محدثین و فقہاء کی طرز پر لکھی تھیں لوگوں کے حوالہ کر دیں۔

(امام ابو الحسن اشعری نے اپنی کتاب الابانتہ کے مقدمہ میں اپنے مسلک و منہج کی تفصیلات ذکر کی ہیں اور معتزلہ پر اپنے اعتراضات ذکر کئے ہیں۔ حمد و ثنا کے بعد ذکر کرتے ہیں:-

”اما بعد بہت سے معتزلہ و قدریہ اپنی خواہشات کی بنا پر اپنے پیش رو اکابر کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ قرآنی آیات کی تاویل و تفسیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ نہ خدا نے اس کا ذکر کیا نہ اس کی حجت و برهان واضح کی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول اور نہ سلف صالحین سے مذکور ہے۔ صحابہ کرام نے روایت یا بالبصائر کے بارے میں آنحضرت سے جو روایات نقل کی ہیں معتزلہ ان کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ روایات مختلف الجہات اور متواتر ہیں معتزلہ شفاعت نبوی کے بھی منکر ہیں اور اس ضمن میں سلف صالحین کی نقل کردہ روایات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ معتزلہ عذاب قبر کو بھی تسلیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس بات کے قائل ہیں کہ کفار کو قبروں میں عذاب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوصف کہ یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے جس پر سب صحابہ و تابعین متفق ہیں۔

معتزلہ کا عقیدہ خالق قرآن سے متعلق ان مشرکین عرب کے افکار سے میل کھاتا ہے جو قرآن کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ ”ان هَذَا اِلَّا كَوَلُّوا لِبَشَرٍ“ (یہ تو بس ایک انسان کا کلام ہے) وہ یہ سمجھتے تھے کہ قرآن انسانی کلام ہے جس طرح نجومس کے نزدیک خالق دو ہیں ایک خالق خیر و دوسرا خالق شر ^{fireworshippers}۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے وہ اسے چاہتا نہیں۔ بخلاف اذیں جمہور مسلمانوں کا اعتقاد یہ ہے کہ وہی چیز عالم وجود میں آتی ہے جس سے خدا کی مشیت متعلق ہوتی ہے۔ بدوں مشیت کوئی چیز منصفہ ^{شہود پر چلوہ گریں ہو سکتی}۔ معتزلہ اس آیت کو بھی ٹھکرا دیتے ہیں جس میں ارشاد ہوتا ہے:-

”وَمَا نَشَاءُونَ اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ“
نیز فرمایا: وَلَوْ نَشَاءُ لَاتَيْنَاكُمْ
نَفْسًا هَدًا هٰذَا۔
تم نہیں چاہتے جب تک اللہ نہ چاہے۔
اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت
دے دیتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا: ”فَقَالَ لِمَا يُرِيدُ“ (وہ جو چاہے کرتا ہے) حضرت شعیب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:- ”وَمَا يَكُونُ لَنَا اَنْ نَعُوذَ بِهَا اِلَّا اَنْ يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّنَا“ (جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے ہم اس لبتی میں لوٹ کر نہیں آسکتے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدریہ کے اقوال و عقائد کی بنا پر انہیں امت محمدی کے نجومس قرار دیا۔ یہ بھی نجومس کی طرح خیر و شر کے دو جدا گانہ خالق قرار دیتے ہیں۔ نجومس کی

طرح ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر بھی شر کا صدور ہو جاتا ہے۔ وہ آیت قرآنیہ کے عین برخلاف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نفع و ضرر ان کے اپنے ہاتھ میں ہے قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

«قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا | آپ فرمادیں کہ میں اپنے آپ کے لئے نفع و
إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ» | ضرر کا مالک نہیں۔ مگر یہ کہ خدا چاہے۔

ان کا یہ نظریہ قرآن کریم اور مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے۔

(وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی کے علاوہ بھی ان میں اعمال کی قدرت پائی جاتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ذاتِ خداوندی سے بے نیاز سمجھتے اور ان امور پر بھی قادر تصور کرتے ہیں جن پر خدا بھی قادر نہیں ہے۔ اسی طرح مجوس کا نقطہء نظر یہ ہے کہ شیطان میں جن اعمال قبیحہ کی قدرت پائی جاتی ہے وہ ذاتِ خداوندی میں بھی موجود نہیں۔ بنا بریں ان کو امت محمدی کے مجوس قرار دینا بالکل قرین قیاس ہے۔ یہ مجوس کے مذہب پر عامل اور انہی کے عقائد و افکار سے متک کرتے تھے۔ یہ مجوس کے گمراہانہ اقوال پر سرد ہنستے اور لوگوں کو رحمتِ خداوندی سے مایوس گردانتے تھے۔ یہ معصیت پیشہ لوگوں کو ابدی جہنمی تصور کرتے تھے۔ باوجودیکہ قرآن میں وارد ہے۔

«وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ» (وہ شرک کے سوا دوسرے گناہ اگر چاہے معاف کر دیتا ہے) ان کا نقطہء نگاہ یہ ہے کہ جو شخص جہنم میں ایک مرتبہ داخل ہو گیا وہ اس سے کبھی باہر نہیں نکلے گا۔ اس کے عین برخلاف حدیث نبوی میں ارشاد ہوتا ہے۔

«اللہ تعالیٰ دوزخ میں سے ایسے لوگوں کو بھی نکالیں گے جو جل کر کوئلہ بن چکے ہوں گے»

وہ ذاتِ باری سے ”وجہ“ (چہرہ) کی نفی کرتے ہیں حالانکہ قرآن میں فرمایا ہے:-

«وَيَسْقِي وَجْهَهُ مِنْ رَبِّكَ ذُؤَالِجَلَالٍ وَإِلَّا تَكْفُر»

وہ خدا کے دو ہاتھ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ قرآن میں فرمایا:-

«لَمَّا خَلَقْتُ بَيْدَتِي» (جیسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا)

وہ خدا کی آنکھوں پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ حالانکہ قرآن میں ارشاد ہوا:-

«تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا» (ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی)

«دوسری جگہ فرمایا: «وَلَمْ يَخْلُقْ عَلَيَّ عَيْنِي» (تا کہ میری آنکھوں کے سامنے تجھے پالا جائے)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں آسمانِ اول پر
نزولِ اجلال فرماتے ہیں (مگر معتزلہ اس کی نفی کرتے ہیں میں آگے چل کر اسکی تفصیلات ذکر کروں گا)
وَاللّٰهُ التَّوْفِیْقُ -

اگر معترض یہ کہے کہ تم معتزلہ قدریہ جہمیہ خوارج شیعہ اور مرجئیہ کے اقوال کو تسلیم نہیں
کرتے۔ یہ بتائیے کہ تمہارا اپنا مذہب و مسلک کیا ہے؟
ہم جو ابائے گے کہ ہم کتاب و سنت کی پیروی کرتے اور ان اقوال و آثار سے منکر
کرتے ہیں جو صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث سے منقول ہیں۔ ہم امام احمد کی ہمارے کردہ راہ پر
گام زن ہیں خداوند کریم انہیں شادمان رکھے ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کا اجر و
ثواب بڑھائے۔ ہم امام احمد کے مخالفین کے اقوال سے احتراز کرتے ہیں اس لئے کہ آپ ہی
امامِ فاضل اور رئیسِ کامل تھے۔ جب کفر و ضلالت کا چرچا ہوا تو آپ کی بدولت اللہ تعالیٰ
نے حق کو واضح فرمایا مبتدعین کی بدعات کا استیصال کیا۔ کج رویوں کی کج روی دور کی۔
جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کے شکوک کا ازالہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس امامِ جلیل اور
عالمِ نبیل پر رحم فرمائے اور سب ائمہ کرام پر بارانِ رحمت ہوسائے۔

حنبلی و اشعری افکار و عقائد کی یگانگت | ۸۲۔ امام اشعری کا یہ بیان اس حقیقت
کی پردہ دری کرتا ہے کہ ان کا مقصد ہی حنبلی

عقائد کی نشر و اشاعت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حنبلی طرزِ فکر و نظر کو اپنا مسلک و منہج قرار دیتے
دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”ہمارے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم ذاتِ باری تعالیٰ اس کے فرشتوں کتابوں اور رسولوں
پر ایمان لائیں اور جو کچھ بھی اس کی طرف سے ہماری جانب بھیجا گیا ہے اسے تسلیم کریں۔ اسی طرح
بروایت ثقات جو اقوال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں ہم ان پر ایمان رکھتے اور کسی
قول کو بھی رد نہیں کرتے۔ ہم ذاتِ خداوندی کو واحد یکتا اور بے نیاز قرار دیتے ہیں۔ اس
کے سوا کوئی معبود نہیں۔ نہ وہ بیوی رکھتا ہے نہ اولاد۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور
رسول تھے۔ جنت و دوزخ حق ہیں۔ قیامت ضرور برپا ہوگی۔ جو لوگ قبروں میں دفن ہیں انہیں
حیات تو بخشی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قرار پکڑا جیسا کہ خود فرمایا:-

”الْمَرْحَمِیْنَ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی“

خدا کا چہرہ بھی ہے جیسا کہ ارشاد ہے: "وَيَتَقَىٰ وَجْهَ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ"

اس کے ہاتھ بھی ہیں اس کی دلیل یہ آیت ہے: "بَلْ يَدَاكَ مَبْسُوطَتَانِ"

اس کی آنکھیں بھی ہیں جن کی کیفیت معلوم نہیں: "يَخْرُجُ بِأَعْيُنِنَا"

وہ علم بھی رکھتا ہے۔ جیسا کہ خود فرمایا: "أَشْرَكَهُ بِعِلْمِهِ"

وہ صاحب قدرت بھی ہے۔ فرمایا: "هُوَ أَشَدُّ مِنْهُمْ شَوْقًا"

ہم خدا کے لئے سمع و بصر کا بھی اثبات کرتے ہیں اور معتزلہ اور جہمیہ کی طرح ان کی نفی نہیں کرتے۔ ہم اس کے کلام کو غیر مخلوق سمجھتے ہیں وہ جس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے وہ کون کب سے عالم وجود میں آجاتی ہے۔ دنیا کی ہر چیز خیر ہو یا شر اس کی مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہے بلکہ اشیاء کی یہی حالت ہے۔ کوئی شخص خدا سے پہلے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نہ ہم خدا سے بے نیاز ہیں اور نہ اس کے دائرہ علم سے باہر نکل سکتے ہیں، اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ ہندوں کے اعمال خدا کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

"وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ" (خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا)

بندے کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے بلکہ خود اس کے پیدا کردہ ہیں۔ ارشاد یاری تعالیٰ ہے:

"أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمْ الْخَالِقُونَ؟"

ایسی آیات قرآن کریم میں بہت ہیں۔ خدا نے مومنوں کو عبادت کی توفیق عطا فرمائی یہ عین

عنایت ربانی ہے۔ اگر وہ انہیں صالح بنا تا ہے تو سب صالح ہو جاتے ہیں اور اگر ہدایت

سے بہرہ ور کرتا ہے تو ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: "وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ"

ہم خدا کی تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں خیر ہو یا شر تلخ ہو یا شیریں! ہم اس حقیقت سے

سے بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ جو تکلیف ہمیں پہنچی وہ ٹلنے والی نہ تھی اور جو مصیبت رخص ہو گئی وہ

ہم پر آنے والی نہ تھی۔

ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق قرار دیتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں خلق قرآن کا

عقیدہ رکھنے والا کافر ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ برواقیامت خدا کو اس طرح دیکھا عدلے

کا جیسے چودھویں کا چاند نظر آتا ہے۔ مومن اس کا زیارت مقدسہ سے مشرف ہوں گے

جیسا کہ روایات میں مذکور ہے۔ کفار زیارت خداوندی سے محروم رہیں گے۔ اس کی دلیل

یہ آیت ہے :- کَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ

ہم گناہوں کی بناء پر اپنی قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے۔ مثلاً زنا کاری چوری اور شراب نوشی کی پر کوئی شخص واسطہ اسلام سے نکل نہیں جاتا۔ جیسا کہ خوارج کا نظریہ ہے۔ البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص محرمات کی تحلیل کر کے ان کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت کی شفاعت کی بنا پر بہت سے لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ ہم عذاب قبر پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ایمان ہے اور وہ کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ ہم ان بزرگانِ سلف کو دل سے چاہتے ہیں اور ان حضرات کی محبت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے رسول پاک کی صحبت کے چن لیا۔ ہم ان کی تعریف و توصیف انہی الفاظ سے کرتے ہیں۔ جو ان کی شان میں وارد ہوئے۔ ہم کہتے ہیں کہ آنحضرت کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ امام حق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں دین اسلام کا بول بالا کیا اور اسے مرتدین پر غلبہ عطا کیا۔ حضرت ابو بکر کے بعد پہلے حضرت عمرؓ اور پھر حضرت عثمان خلیفہ ہوئے۔ ظالموں نے از روہ ظلم و ستم آپ کو شہید کر دیا۔ حضرت عثمان کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ خلافت پر فائز ہوئے۔

آنحضرت کے بعد یہ ایمان دین تھے ان کی خلافت نیابت نبوت تھی۔ ہم عشرہ مبشرہ کے جنتی ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا۔ ہم جمیع صحابہ کرام سے انس و محبت رکھتے ہیں اور ان کے باہمی اختلافات کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے۔ چاروں ائمہ دین کو رہ و رشد و ہدایت کا سالک تصور کرتے ہیں اور کسی کو ان کا ہم پلہ (قرآن قرار نہیں دیتے ہم ایسی تمام روایات کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں جو شاہ میراٹھ نقل نے ان کی امامت کے اثبات کے سلسلہ میں بیان کی ہیں جو ان پر خروج کرتا ہے۔ اسے گمراہ تصور کرتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ تلوار لے کر ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ممنوع ہے۔ ہم قتل و فساد کے زمانہ میں ترک قتال کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم خروج دجال عذاب قبر اور منکر و نکیر پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم حدیث معراج کی تصدیق کرتے ہیں اور اکثر خوابوں کی صحت کے قائل ہیں۔ ہم فوت شدگان کی جانب سے صدقہ کرتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کو جائز سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس سے ان کو نفع پہنچتا ہے۔ ہمارے خیال میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو اپنی آیات سے مخصوص کر سکتے ہیں۔ (یعنی مومنین سے کرامات کا صدور ممکن ہے) مشرکین سے

ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ عالم آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کے لئے آگ جلا کر
 ان کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیں گے۔ ہمارا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ فتنہ جو اوراہیں بدعت
 سے الگ رہنا چاہئے ہم آگے چل کر اپنے اقوال کے دلائل ذکر کریں گے۔

کارِ اشعری کی تہذیب و تخلص | ۸۳۔ ہم نے امام اشعری کا یہ طویل اقتباس اس
 لئے نقل کیا ہے کہ یہ ان کے عقائد و افکار کے خلاصہ
 بتل ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل امور پیدا و نشئی پڑتی ہیں۔

۱۔ صلوات سے آیت (نشانی) کا صدور ممکن ہے علماء و ائمہ سے مجزہ سے تمیز کرنے کے لئے
 کرامت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میت کی طرف سے صدقہ کرتا اور اس کے حق میں
 دعا کرتا نہ صرف جائز بلکہ ان کے لئے نفع بخش ہے۔

۲۔ عقائدی مسائل میں احادیث سے احتجاج کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں احادیث
 متواترہ اور اخبار آحاد سب برابر ہیں جو عقائد و مسائل اخبار آحاد سے ثابت
 ہیں امام اشعری اعلانیہ ان کے معتقد ہیں۔

۳۔ جن آیات سے تشبیہ (خدا کے مشابہ مخلوقات ہونے) کا وہم پڑتا ہے۔ اشعری ان سے
 احتجاج کرتے ہیں اور اسے موجب تشبیہ قرار نہیں دیتے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خدا کا چہرہ
 اور ہاتھ بھی ہیں۔ مگر مخلوقات جیسے نہیں۔

۴۔ ابوالحسن اشعری امام احمد بن حنبل کو امام حلیل اور عالم نبیل تصور کرتے ہیں اور کہتے
 ہیں کہ ان (اشعری) کے عقائد عقائد حنابلہ سے ہم آہنگ ہیں۔

مسک اشعری میں استدلال | ۸۴۔ محدثین و فقہاء اور معتزلہ کے مابین جو اختلافات
 رونما ہو چکے تھے ان میں اشاعرہ معتزلہ کے عین برخلاف

محدثین و فقہاء کا ساتھ دیتے اور نصوص سے بلا تاویل اخذ و احتجاج کرتے تھے۔ مگر بایں ہمہ
 بدعت پرستوں سے ہمیشہ گریزاں و نفرت کناں رہتے تھے۔ دراصل امام اشعری کے افکار و
 عقائد لفظی و اثبات میں مبالغہ کرنے والوں کے بین بین تھے اور وہ نزاع و فساد میں کھینچا تانی
 کرنے والے فرقوں مثلاً معتزلہ حثوبہ اور جہریہ کی نسبت مسک استدلال سے زیادہ قریب تھے
 جو لوگ امام اشعری کی سیرت و سوانح سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ آپ ایک ایسے مسک کی
 بنا ڈالنا چاہتے تھے جو ہر قسم کے اغراق و غلو سے پاک ہو۔ آپ کی تصنیف لطیف "مقالات اسلامیہ"

اسلامی فرقوں کے اقوال و عقائد کا نادرجوع ہے۔ آپ فرق مختلفہ کے اقوال و آثار کے ذمہ نظر اور عمیق الفکر ناقل ہیں۔

جو فلسفیانہ آراء و افکار قرآن سے متعلق ہیں ان میں بھی امام اشعری کا نقطہ نگاہ توسط و اعتدال کا ترجمان ہے۔ تاہم جس مسئلہ میں کوئی اثر و آیت موجود ہو آپ اس میں ہمیشہ فقہاء کا ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے افکار و آثار کا متلاشی بڑی آسانی سے ایسے نظائر و امثال تلاش کر لیتا ہے جن سے اشعری مسلک کا توسط و اعتدال عیاں ہوتا ہے۔

مثلاً صفات باری کے مسئلہ میں امام اشعری کا زاویہ نگاہ ایک طرف معتزلہ و جہمیہ اور دوسری طرف حشوئیہ و مجسمہ کے بین بین واقع ہے۔ معتزلہ و جہمیہ قرآن میں وارد شدہ صفات کی نفی کرتے ہیں البتہ صفت وجود و قدامت بقاء اور وحدانیت کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ خدا کی ذاتی صفات مثلاً سمع و بصر اور کلام ذات باری کے سوا کچھ اور نہیں۔ جن و رحیم وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ ہیں۔

حشوئیہ اور مجسمہ صفات باری کو صفات حوادث کے مماثل قرار دیتے ہیں اور دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔ امام اشعری نے اگر قرآن و سنت میں وارد شدہ صفات کو ذات باری کے لئے ثابت کیا اور کہا کہ یہ صفات نشان ایزدی کے لائق ہیں اور ان صفات حوادث کے مماثل نہیں جو ان کی ہمنام ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات سمع و بصر اور کلام انسانوں میں پائے جانے والی قوت سمع و بصر اور کلام کی مانند نہیں۔ قدرت خداوندی اور افعال العباد کے مسئلہ میں امام اشعری کا مسلک جہمیہ اور معتزلہ کے نقطہ نظر کی نسبت مبنی بر توسط و اعتدال ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ خدا کی ودیعت کردہ قوت کے بل بوتے پر افعال کو جنم دیتا ہے۔ اس کے عین برعکس جہمیہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ بندہ میں کسی چیز کے احداث و کسب کی قوت سرے سے پائی ہی نہیں جاتی۔ جہمیہ کی رائے میں بندہ ایک پرہیزگار کی طرح ہے جو ہوا کے رخ اٹھنے لگتا ہے۔ امام اشعری فرماتے ہیں کہ بندہ احداث پر قادر نہیں البتہ کسب کی استطاعت رکھتا ہے۔

(بحوالہ تبیین کذب المفسری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری)

معتزلہ روایت باری تعالیٰ کا انکار کرتے اور اس ضمن میں وارد شدہ نصوص قرآنیہ کی تاویل کرتے ہیں۔ روایت باری میں نقل شدہ احادیث سے اس لئے استناد نہیں کرتے کہ وہ

خبر آحاد ہیں۔ مشتبہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو محدود و مکیف حالت میں دیکھا جائے گا۔ امام اشعری نے معتزل مسلک اختیار کیا اور کہا کہ اس کی زیارت ہوگی مگر وہ محدود و محلول نہ ہوگا۔ کتاب و سنت میں جو ہر وہ تشبیہ الفاظ وارد ہیں۔ معتزلہ ان کی تاویل کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں وارد ہے۔ "يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَسْبَابِهِمْ" معتزلہ کہتے ہیں "ید" سے غلبہ مراد ہے۔ حثویہ کے نزدیک "ید" سے ہاتھ مراد ہے۔

اس کے برخلاف امام اشعری فرماتے ہیں کہ ید سے مراد ہاتھ ہے جو ذاتِ خداوندی کے شایانِ شان ہو نہ کہ انسانی ہاتھ۔ "ید" خدا کی صفت ہے جس طرح سمیع اور بصیر اس کی صفت ہے (کتاب الایاتہ) امام اشعری اس کا ذکر ایک مفروضہ کی صورت میں کرتے ہیں۔ کہ یہ سبیل فرض ید سے ہاتھ مراد لیا جائے مگر یہ کہا جائے کہ اس کا ہاتھ انسانی ہاتھ کی طرح نہیں۔ مگر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اشعری نے اس نظریہ کا اظہار معتزلہ کو مخالفت کی بناء پر کیا تھا بعد ازاں اس سے رجوع کر لیا۔

مشہور کتاب "الملح" میں مذکور ہے کہ اشعری معتزلہ کی طرح "ید" سے قدرتِ خداوندی مراد لیتے تھے۔

قرآن کے بارے میں معتزلہ کی رائے یہ ہے کہ وہ مخلوق اور حادث ہے۔ حثویہ کہتے ہیں حروف مقطعات قرآن کے اوراق اور وہ روشنائی جس سے قرآنی الفاظ لکھے جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ قرآن کے دونوں گروہ پوش جس چیز پر بھی حاوی ہیں وہ غیر مخلوق ہے۔ امام اشعری متوسط راہ پر چلے اور فرمایا کہ قرآن خدا کا کلام ہے نہ اس میں تبدیلی کا امکان ہے۔ نہ یہ مخلوق ہے نہ حادث اور نہ جدید۔ البتہ حروف مقطعات قرآن کے اوراق والوان اور اصوات مخلوق اور تو پیدا شدہ ہیں۔

معتزلہ اصحابِ کبار کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایمان و امانت کے علی الرغم اگر اصحابِ کبار اپنے گناہوں سے تائب نہ ہوں تو وہ دائمی جہنمی ہوں گے۔ مرجئہ جو اہل سنت نہیں یہ کہتے ہیں کہ ایمان و اخلاص کے ہوتے ہوئے کبار کا وجود موجب ضرر نہیں۔ اس ضمن میں بھی امام اشعری نے میانہ روی کا شیوہ اختیار کیا۔ فرماتے ہیں:-

"ایک مومن جو موجد ہونے کے باوجود گناہوں کا مرتکب بھی ہو وہ مشیتِ ایزدی

کے تابع ہے اگر چاہے اسے معاف کر کے جنت میں داخل فرمائے اور اگر چاہے اسے کٹاہوں کی سزا دے کر پھر جنت میں لے جائے۔

شفاعت کے بارے میں فرقہ امامیہ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ امامان دین بھی رسولوں کی طرح شفاعت کریں گے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ بندوں میں سے کسی کو بھی شفاعت کا حق حاصل نہیں۔ اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط سے الگ ہو کر اشعری نے یہ موقف اختیار کیا کہ مستوجب سزا مومنین کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت مقبول ہوگی، آپ اذن خداوندی سے صرف انہیں لوگوں کے حق میں شفاعت فرمائیں گے جو اس کے اہل ہوں گے۔ اسی طرح دیگر انبیاء و رسل بھی شفاعت کریں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ امام اشعری جادۂ اعتدال پر گامزن رہ کر کجروی اور انحراف سے کنارہ کش رہے۔ فرقہ ماتریدیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم آپ کے آراء و افکار بیان کریں گے اور دیگر فرقہ جات کے اقوال سے ان کا موازنہ کریں گے۔

مسئلہ اشعری میں عقل و نقل کی ہم آہنگی | ۸۵۔ امام اشعری نے عقائد پر استدلال کرتے ہوئے عقل و نقل دونوں کی راہ اختیار کی۔

کتاب و سنت میں ذات باری اور انبیاء کے جو اوصاف مذکور ہیں نیز روزِ آخرت ملائکہ حساب اور ثواب و عقاب کو وہ دلائل عقلیہ اور برہان منطقیہ کی روشنی میں ثابت کرتے ہیں اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح بنا بر نقل ان کی تصدیق واجب تھی اسی طرح عقلی دلائل سے ان کی صداقت پر استشہاد کیا جائے۔ گویا امام اشعری عقل کو حاکم قرار دے کر نصوص کی تاویل نہیں کرتے بلکہ عقل انسانی کو طویل نصوص کا ایک ایسا خادم ٹھہراتے ہیں جو ہر جگہ ان کی تائید و توثیق کرتا ہے۔ عقل و نقل کی مطابقت و موافقت ثابت کرنے کے لئے آپ ان فلسفی و عقلی مسائل و تصانیف سے بھی مدد لیتے ہیں جن میں فلاسفہ و منطقہ غور و خوض کرتے رہے ہیں عقلیت کی راہ اختیار کرنے کے وجوہات حسب ذیل تھے۔

۱۔ اشعری معتزلہ کے تلمیذ رشید اور ان کے خوانِ علم و فضل کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ نے معتزلہ کے چشمہ علم و ادب سے اپنی علمی پیاس بجھائی اور اعتقادی مسائل میں اپنی کے طرز استدلال کو اپنایا۔ معتزلہ کا طرز استدلال فلاسفہ و منطقہ کے زیر اثر تھا۔ تاہم امام اشعری نے نصوص کتاب و سنت کے ہم و ادراک میں معتزلہ کے طرز و انداز کو اختیار

نہیں کیا۔

۲۔ امام اشعری نے معتزلہ کی تردید کو اپنا مسلح نظر بنایا تھا۔ بنا بریں ان کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ معتزلہ کا طرز استدلال اختیار کرتے ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور ان کے دلائل و براہین کو انہی کے خلاف استعمال کر کے ان کو خاموش کر دیتے۔

۳۔ آپ فلاسفہ قرامطہ اور باطنیہ کے خلاف بھی نبرد آزما تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو خاموش کرانے کے لئے منطقی قیاسات سے بہتر کوئی چیز نہ تھی اور ان میں اکثر فلاسفہ تھے جن کے لئے وجہ اطمینان صرف عقلی دلائل ہی تھے۔

امام اشعری کی خدمات جلیلیہ | ۸۶۔ حق بات یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اخیر اور چوتھی صدی کے آغاز میں معتزلہ کا زور

بڑی حد تک ٹوٹ چکا تھا۔ معتزلہ نے اعداء دین اور اصحاب بدعت کی تردید میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ جب ان کے رعب و داب کا طلسم ٹوٹ گیا تو اہل سنت کے علماء میں ایسے لوگوں کا وجود از بس ضروری ہو گیا جو یہ فریضہ ادا کریں۔ اندریں حالات اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے امام ابو الحسن اشعری آگے بڑھے کیونکہ وہ معتزلہ ہی کے ساختہ پرداختہ تھے اور اس ضمن میں ان کی مساعی جمیدہ کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ معتزلہ کے زوال پذیر ہونے کے بعد آپ ہی نے مسند علم و فضل کو زینت بخشی اور اس عصر و عہد میں اہل سنت کے مشہور امام قرار پائے۔

حمایت دین کے باعث امام اشعری کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا آپ کے اعوان و انصار لا تعداد تھے۔ سرکاری حکام بھی آپ کی تائید و نصرت کا دم بھرتے اور کفار و معتزلہ کو سزا میں دیتے تھے۔ آپ کے رفقاء اطراف و اکناف میں پھیل گئے اور اہل سنت کے مخالفین کے برخلاف سینہ سپر ہو گئے۔ علماء عصر نے ان خدمات جلیلیہ کے پیش نظر آپ کو "امام اہل سنت والجماعت" کا لقب دیا۔

اشعری کے مخالفین | ۸۷۔ بایں ہمہ امام اشعری کی وفات کے بعد ان کے مخالف

علماء بھی منصفہ مشہور ہوئے۔ مثلاً محدث ابن حزم ان کو جبریہ تصور کرتے تھے کیونکہ افعال العباد کے بارے میں اشعری نے حین رائے کا اظہار کیا ہے اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بندے کو کچھ اختیار بھی حاصل ہے۔ (کتاب الفصل ج ۳ ص ۲۲)

اسی طرح مرتکب کبائر کے بارے میں امام اشعری جو نظریات رکھتے ہیں ان کی وجہ سے ابن حزم ان کو مرعبہ قرار دیتے تھے۔
 (کتاب الفصل ج ۴ ص ۲۰۴)

ابن حزم نے ان کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی اشعری پر گرفت کی ہے۔ تاہم آپ کے اکثر مخالفین صفحہ ارضی سے مرٹ گئے اور تاریخ اسلام کے اوراق میں ان کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ آپ کے اعوان و انصار کا زور بڑھتا ہی چلا گیا وہ آپ کے نقش قدم پر چل کر معتزلہ و ملاحدہ کے خلاف صف آراء رہے اور اقوال و عقائد کے میدان میں ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے رہے۔

اس عزت و عظمت کے باوصف جو تاریخ اسلام کے اوراق میں ابد الابد تک زندہ جاوید رہے گی۔ کچھ لوگ امام اشعری کے خلاف بھی تھے جو خاصی شہرت کے حامل تھے اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ حتمیہ میں بھی آپ کے مخالف موجود تھے چنانچہ سلفی المشرب لوگوں کا ذکر کرتے وقت اس پر روشنی ڈالیں گے۔

۳۱۔ اشعری مسلک امام ابو الحسن اشعری کے بعد

۸۸۔ اشعری مسلک کے اعوان و انصار بھی کم نہ تھے
بلا و عراق اور مغربی دیار و امصار میں اسے اہل سنت

الجماعت کا مسلک و منہج تصور کیا جاتا تھا۔ امام اشعری کے بعد بڑے ممتاز علماء پیدا
کئے جنہوں نے اشعری کے افکار و آراء کی تائید میں بہت کچھ تحریر کیا۔ ان علماء نے صرف
ان نتائج کی ہی تائید نہیں کی تھی جن تک امام اشعری پہنچے بلکہ امام اشعری کے بیان کردہ
مقدمات کی بھی پر زور حمایت کی اور مقدمات و نتائج دونوں کی پیروی کو واجب قرار دیا
مگر وہ کے سرخیل ابو بکر باقلانی تھے۔

۸۹۔ باقلانی بڑے جمید عالم تھے۔ آپ نے امام
اشعری کی بحثوں کو شو و زوائد سے پاک صاف کر کے

نہیں نئے سمرے سے مرتب کیا۔ اثبات و حیدر کے لئے اشعری نے عقلی براہین کے جو
مقدمات ذکر کئے تھے باقلانی نے ان پر روشنی ڈالی جو پرو عرض پر گفتگو کر کے بتایا کہ عرض
باقیام عرض کے ساتھ ممکن نہیں اور نہ ہی اعراض و زمانوں تک باقی رہ سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علمی مسائل بیان کئے۔ باقلانی نے امام اشعری کے افکار
و معتقدات کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے صرف نتائج پر ہی اکتفا نہ کیا جن تک امام
اشعری کو رسائی حاصل ہوئی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اشعری نے جن مقدمات سے ان
نتائج کا استخراج کیا ہے ان کو معلوم کئے بغیر نتائج سے اخذ و استخراج درست نہیں۔

باقلانی کا یہ طرز و فکر اشعری مسلک کی نصرت و حمایت میں مباہلہ آمیزی کا ائینہ دار ہے
اس لئے کہ عقلی دلائل کتاب و سنت کی کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ اور پھر یہ کہ عقلی
میدان ایک صحرا ہے ناپیدا کنار ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے دروازے ہر شخص
کے لئے واپس اور اس کی شاہراہوں پر چلنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ عین ممکن
ہے کہ لوگ قضایا عقلیہ اور نتائج تجربیہ کی بناء پر ان دلائل و بیانات تک پہنچ جائیں
جن کی طرف اشعری کو رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ لہذا مقدمات سے استدلال کرتے ہیں کوئی

قباحت نہیں پائی جاتی۔ لیکن طیکہ وہ ان نتائج اور فکری نثرات کے خلاف نہ ہوں جو ان سے اخذ کئے گئے ہیں۔

امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ

۵۔ یا قلاتی کے بعد امام غزالی آئے۔ انہوں نے باقلانی کی ہوا کردہ راہ پر چلنے اور اس کی دعوت دینے سے انکار کر دیا۔ امام غزالی کا طرز فکر یہ تھا کہ باقلانی کے طریق استدلال کی مخالفت کرنے سے نتیجہ کا بطلان لازم نہیں آتا نیز یہ کہ دین اسلام نے عقیدل انسانی کو بحیثیت مجموعی مخاطب کیا ہے۔ اصل اطاعت کتاب و سنت کی واجب ہے۔ ان کی تائید و توثیق میں ہر طرح کے دلائل وارد کئے جاسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی ابو الحسن اشعری یا ابو منصور ماتریدی کے مقلد نہ تھے بلکہ آپ کی حیثیت ایک بالغ النظر اور حریت فکر و نظر سے بہرہ ور محقق کی ہے۔ آپ زیادہ تر ان کا ساتھ دیتے مگر بعض ایسی باتوں میں ان کی مخالفت کرتے ہیں جن کی حیثیت ان کی نگاہ میں واجب الاتباع دین کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام اشعری کے اکثر اتباع نے آپ کو کفر و زندقہ سے متہم کیا۔ امام غزالی کا مندرجہ ذیل بیان ان کی کتاب "فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة" میں قابل ملاحظہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

"اے برادر مشفق و جلیب مخلص جب تم نے دیکھا کہ حاسدوں کا ایک گروہ ہماری ان تصانیف پر معترض ہو رہا ہے جو ہم نے دین کے اسرار و رموز کے بارے میں لکھیں تو تم غصہ سے بھر گئے اور تمہارا قلب و ذہن پریشان ہو گیا۔ معترضین کا نقطہ استدلال یہ ہے کہ ہمارے نظریات معتدین اور مشائخ متکلمین کے افکار و آراء سے ٹکراتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اشعری کے مذہب و مسلک سے ہر موافق انحراف کرتا بھی کفر و ضلالت کا موجب ہے۔

میرے شفیع بھائی! یہ غم و غصہ چھوڑیے اور صبر و سکون سے کام لیجئے اور اگر ان سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں تو بھی بطریق احسن کیجئے جس شخص کا حاسد کوئی نہ ہو یا اس پر بہتان طرزی نہ کی جائے تو وہ معمولی درجہ کا آدمی ہوتا ہے۔ اسی طرح جس شخص پر کفر و ضلالت کا طعن نہ توڑا جائے وہ اہم آدمی نہیں ہوتا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کونسا داعی اکمل و اعقل ہو گا۔ اس کے باوصف آپ کو مجنون کہہ کر بکارا لیا۔ قرآن کو دیکھیے اس سے بڑھ کر سچا کلام اور کون ہو گا؟ مگر اسے "اساطیر الاولین" (پہلے لوگوں کے افسانے) کے لقب

سے تو ازا گیا۔

شفیق برادر! اپنے مخالف سے پوچھئے کہ کفر کسے کہتے ہیں؟ اگر وہ جواباً کہے کہ جو بات اشعری کے خلاف ہو وہ کفر ہے یا حبیلی اور معتزلی مذہب و مسلک کی خلاف ورزی کرنے سے کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے۔ تو یقین کیجئے کہ ایسا شخص کندہ ناتراش اور غبی ہے۔ وہ تقلید کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ایک اندھا شخص ہے لہذا اس کی اصلاح کی کوشش کرنا محض وقت کا ضیاع ہے۔ اسے خاموش کرنے کے لئے صرف یہی حجت و برہان کافی ہے کہ اس کے اعداء و خصوم اور اس کے دعویٰ میں سرسبز کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا غالباً آپ کے دوست کارچان و میلان زیادہ تر اشعری مسلک کی جانب سے اور وہ اس کی خلاف ورزی کو کفر صریح قرار دیتا ہے۔ آپ اس سے پوچھئے کہ حق و صداقت اشعری مسلک میں کیونکر محدود و منحصر ہو گئی۔ انحصارِ صداقت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ علامہ باقلانی کو بھی کافر قرار دینا پڑے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت بقاء میں وہ اشعری کے خلاف ہیں۔ ان کی نگاہ میں خدا کی کوئی صفت زائد علی الذات نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ باقلانی اشعری کی مخالفت کر کے کیونکر کافر ہو گئے جب کہ اشعری باقلانی کی خلاف ورزی کے باوصف کفر سے محفوظ رہے۔ چونکہ یہ ہے۔ نیز یہ کہ حق ایک مسلک و مذہب میں محدود ہونے کے بجائے دوسرے میں کیونکر منحصر و مقید نہ ہوا؟

اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ اشعری کو باقلانی کے مقابلہ میں تقدم زمانی حاصل ہے تو ہم کہیں گے کہ بہت سے معتزلہ بھی اشعری پر سبقت زمانی رکھتے تھے لہذا معتزلہ کا مسلک قابلِ نقد و ضوابط ہونا چاہئے اور اگر اس کی وجہ تعلیم و تحصیل میں لغات درجہات ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ علمی مراتب کو آخر کس ترازو میں تولایا گیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس کے نام و تشبوع سے فضل اور کوئی نہیں۔ اگر باقلانی اشعری کے سامنے سینہ سپر ہو سکتے ہیں تو آخر دوسرے لوگ اس حق سے کیونکر محروم ہو گئے؟ اس خصوصاً اجازت کی سند

کیا ہے؟

اگر اشعری کا طرف داریہ کہے کہ باقلانی و اشعری کے مابین صرف نزاع لفظی پایا جاتا ہے اور یوں بھی اشعری کے بعض مقلدین نے یہ تکلف کیا ہے کہ باقلانی و اشعری دو اہم وجود کے مسئلہ میں ایک زبان میں نقطہ اختلافات صرف یہ ہے کہ آیا یہ ذات کی بناء پر ہے یا کسی

وصف زائد علی الذات کے باعث ہر ظاہر ہے کہ یہ اختلاف شدید نوعیت کا نہیں۔ اندر
صورت ہم اشعری کے حامی سے یہ پوچھیں گے کہ پھر وہ نفی صفات کی بناء پر معتزلہ کی شدید
مخالفت کس لئے کرتے ہیں؟

آخر معتزلہ بھی تو یہ مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم جمیع معلومات پر حاوی اور جمیع ممکنات
پر قادر ہے اشعری کے ساتھ ان کا اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ بالذات
عالم و قادر ہے یا کسی صفت زائدہ کی بنا پر؟ اب بتائیے دونوں خلاقیات باطلاق و اشعری
کا اختلاف اور معتزلہ و اشعری کا اختلاف! میں آخر فرق کیا ہوا؟

امام غزالی کا یہ مکتوب گرامی اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ آپ عقائد میں کسی کی
تقلید کرتے اور نہ کسی مذہب و مسلک کے پیرو تھے۔ اگرچہ آپ اور امام اشعری کے مذہب
و مسلک میں چیزاں بعد نہیں پایا جاتا۔

اشعری مسلک کے علماء متاخرین | ۹۱۔ امام غزالی کے بعد بہت سے ائمہ دین پیدا

ہوئے جو نتائج میں اشعری مسلک کے پیرو تھے
اگرچہ ان کے دلائل وہ نہ تھے جو اشعری نے پیش کئے۔ وہ دلائل کے مقدمات میں اشعری کے
مقلد نہ تھے بلکہ ان کی پیروی صرف نتائج کی حد تک تھی۔

چنانچہ علامہ بیضاوی المتوفی ۸۰۰ھ کا شمار بھی انہی علماء میں ہوتا ہے آپ بڑے
کامیاب مناظر امام فقیہ اور دقیقہ رس عالم دین تھے۔ آپ شافعی المسلک تھے۔ آپ نے علم العقائد
میں "الطوالح" نامی ایک کتاب تصنیف کی۔

سید شریف جربانی المتوفی ۸۱۰ھ بھی اشعری مسلک رکھتے تھے آپ نے حنفی فقہ کے زبردست
عالم تھے اور علوم عقلیہ میں بہارت تامہ رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد نفع بخش کتب تصنیف کیں۔
متذکرۃ الصدور علماء سے قبل و بعد بڑے بڑے جہاںدہ فن اور یگانہ روزگار ائمہ و علماء
منصب شہود پر جلوہ گر ہوئے جو عقلی و نقلی علوم میں یکساں بہارت رکھتے تھے ان کے دلائل
و براہین اور معتزلہ پر ان کے اعتراضات و جوابات کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان جملہ تفصیلات کا اصل
مرکز و محور علم الکلام ہے جو ابھی تک پڑھا پڑھا یا جاتا ہے۔

۳۲۔ امام اشعری و جہائی کے مابین مناظرہ

مناظرہ کی تفصیلات | ۹۲۔ اب ہم امام اشعری اور ان کے استاد ابو علی جہائی معتزلی کے ایک مناظرہ کا ذکر کر کے اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ مناظرہ کا موضوع یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے اصلح کا صدور واجب ہے۔ مناظرہ کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:-

اشعری:- مومن کافر اور نابالغ بچے کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟
جہائی:- مومن جنت میں داخل ہو گا۔ کافر جہنم میں سزا پایا ہو گا اور بچہ عذاب سے نجات پائے گا۔
اشعری:- جب بچے کی وفات عالم طفولیت میں ہو جائے اور وہ جنت میں جانا چاہے تو کیا یہ ممکن ہے یا نہیں؟
جہائی:- یہ ممکن نہیں۔ بچے سے کہا جاسکتا ہے کہ مومن نے اللہ و رسول کی اطاعت سے یہ مرتبہ پایا مگر تم میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔

اشعری:- اس کے جواب میں بچہ کہہ سکتا ہے کہ میرا کیا قصور؟ اگر میں زندہ رہتا تو مومن کی طرح نیک اعمال بجا لاتا مگر مجھے یہ موقع ہی نہیں ملا۔

جہائی:- اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یہ کہہ سکتے ہیں مجھے معلوم تھا کہ اگر تمہاری زندگی درالہ ہوتی تو تم میری نافرمانی کرتے اور تمہیں اس کی سزا ملتی۔ لہذا میں نے تمہاری مصلحت کے پیش نظر تمہیں زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہنے دیا اور سن بلوغت کو پہنچنے سے قبل ہی تمہیں موت سے ہمکنار کر دیا۔

اشعری:- یہ سن کر کافر کہہ سکتا ہے کہ بار خدا یا تو میرے حال سے ہی واقف تھا۔ پھر تو نے میری مصلحت کو ملحوظ رکھ کر مجھے کیوں نہ موت دے دی؟
یہ سن کر جہائی خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

۳۳ - ماتریدیہ

امام ماتریدی کی سیرت و سوانح | ۹۳ - یہ فرقہ محمد بن محمد بن محمود المعروف ابو محمد ماتریدی کی طرف منسوب ہے۔ آپ سمرقند کے

محلہ ماتریدیہ میں پیدا ہوئے۔ سمرقند ماوراء النہر کے علاقہ میں واقع ہے۔ یہ بات بائیسویں صدی کو پہنچ چکی ہے کہ آپ کی وفات ۳۳۳ھ میں ہوئی۔ امام ماتریدی نے تیسری صدی ہجری کے آخری ثلث میں تعلیم حاصل کی۔ اس دور میں معتزلہ محدثین و فقہاء پر منظر ڈھانے کے جرم میں ہر جگہ مقہور و معتوب ہو چکے تھے۔

آپ کی تاریخ ولادت کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن و آثار معلوم ہوتا ہے کہ آپ تیسری صدی ہجری کے نصف میں پیدا ہوئے۔ حتیٰ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے حنفی فقہ اور علم الکلام کی تعلیم کے سلسلہ میں نصر بن عینی النخعی المتوفی ۲۶۸ کے آگے زانوئے تلمذتہ کیا۔

بلاد ماوراء النہران دونوں علم فقہ و اصول فقہ کے مجادلات و مناظرات کی آماجگاہ تھے۔ آئے دنوں احناف و شوافع کے مابین فقہی مجادلات کی گرم بازاری رہتی، مساجد میں بھی مجالس مناظرہ منعقد کرنے سے گریز نہ کیا جاتا۔

اس دور میں جب محدثین و فقہاء اور معتزلہ ایک دوسرے کے خلاف صرف آراء ہموں تو ان کی مناظرہ بازی کا مرکز و محور علم الکلام علم فقہ اور اصول فقہ کے علوم و فنون تھے۔ امام ماتریدی نظری و فکری مسابقت کے میدان میں پہلے بڑھے۔ آپ حنفی المسلك تھے لہذا آپ جو لانگاہ فکر و نظر زیادہ ترقی اصول فقہ و اصول دین کے علوم و معارف تھے۔ امام ماتریدی محدثین و فقہاء کی تائید و توثیق کے لئے کمر بستہ ہو گئے اگرچہ آپ کا طرز و انداز بڑی حد تک اشاعرہ سے جداگانہ نوعیت کا تھا۔ تاہم دونوں کے نتائج اکثر ہم آہنگ ہوتے ہیں اگرچہ ان میں کافی موافقت و مطابقت نہیں پائی جاتی۔ ہم آگے چل کر اس کی تفصیلات ذکر کریں۔

امام ماتریدی کا علم و فضل | ۹۴ - اکثر علماء احناف کا خیال ہے کہ امام ماتریدی کو جن آثار و نتائج تک رسائی حاصل ہوئی وہ بڑی حد تک

تک امام ابوحنیفہ کے افکار و عقائد سے ہم آہنگ ہیں۔ آپ اصول دین میں خصوصی اہمیت رکھتے تھے اور آپ کا شمار اس فن کے بگڑے روزگار علماء میں ہوتا تھا۔ آپ نے دینی اس کا اعتراف فرمایا ہے۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ عقائد ہی مسائل میں مناظرہ کرنے کے لئے بائیس مرتبہ بصرہ تشریف لے گئے یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب آپ ہمہ تن فقہ کی عیال میں منہمک نہیں ہوئے تھے۔ اس سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ آپ مناظرات کے دوران تحصیل علم سے کلیتہً غافل نہیں ہو گئے تھے۔ نیز یہ کہ اس دور میں نظری و فکری فقہ سامانی کو ہوا دینے والے زنادق و ملاحدہ تھے جن کا مقصد اسلامی عقائد میں بگاڑ پیدا کرنا تھا۔ علم الکلام میں امام ابوحنیفہ کے کچھ رسائل بھی نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔ یہ رسائل بن معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان کی نسبت نجیثت مجموعی آپ کی جانب صحیح ہے۔ اگرچہ علماء کے مابین یہ مسئلہ محل نزاع ہے کہ آیا آپ نے کوئی کتاب تصنیف کی تھی یا نہیں؟

ان میں مندرجہ ذیل رسائل شامل ہیں :-

۱۔ فقہ اکبر

۲۔ فقہ البسط

۳۔ مکتوب امام ابوحنیفہ بنام عثمان بنی

۴۔ آپ کا وصیت نامہ بنام آپ کے تلمیذ یوسف بن خالد سمعی

۵۔ آپ کی کتاب "العلم بربا و بحرا شرقا و غربا"

جو مسائل اس دور میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے یہ رسائل ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اس دور میں مندرجہ ذیل مسائل زیر بحث تھے :-

۱۔ صفات باری تعالیٰ۔

۲۔ حقیقت ایمان

۳۔ کیا خدا کی معرفت حاصل کرنا عقل کی بناء پر واجب ہے یا شرع کی روشنی میں؟

۴۔ کیا افعال میں ذاتی حسن و قبح پایا جاتا ہے یا نہیں؟

۵۔ افعال العباد کو بندے کی قدرت کی جانب منسوب کرنا قدرت خداوندی کے منافی نہیں۔

۶۔ قضاء و قدر کا مسئلہ

امام ابو حنیفہ اور ماتریدی کے افکار کی یگانگت | ۹۵ - فقہاء عراق کے سرخیل

امام ابو حنیفہ اور امام ابو منصور
ماتریدی کے افکار و آراء کا علمی موازنہ کرنے سے ان کی باہمی یگانگت و مماثلت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ بنا بریں علماء کی یہ بات اپنی جگہ پر درست معلوم ہوتی ہے کہ امام ماتریدی کے افکار و آراء کی اصل و اساس امام ابو حنیفہ کے اقوال و آثار تھے۔

سرتین عراق اور گرد و پیش کے علماء نے امام ابو حنیفہ کے فقہی آثار سے جو اعتناء کیا وہ وابستگی انہیں آپ کے بیان کردہ عقائدی مسائل سے نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام ابو حنیفہ کے پیش رو محدثین و فقہاء کے اقوال ادھر ادھر پھیل کر مقبول خاص و عام ہو چکے تھے۔ پھر ان کے بعد اشاعرہ کے اقوال کو قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔

اس کے عین برعکس بلاد ماوراء النہر کے علماء جہاں امام ابو حنیفہ کے فقہی اقوال کے گردیدہ تھے وہاں انہیں آپ کے بیان کردہ عقائدی مسائل اور ان کی تعلیق و توضیح سے بھی خصوصی لگاؤ تھا اور وہ عقلی دلائل اور منطقی قیاسات کی روشنی میں ان کی تائید و توثیق کرتے رہتے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ امام ماتریدی ہمیں اس مسئلہ میں قیاس آرائیاں کرنے کے لئے نہیں چھوڑ دیتے کہ آپ اور امام ابو حنیفہ کے افکار و آراء کے مابین کس نوع کا ربط و تعلق پایا جاتا ہے بلکہ وہ بڑی صراحت سے کتب امام کو روایت کرتے ہیں مثلاً فقہ البسط۔ مکتوب امام بنام بی۔ رسالہ عالم و متعلم۔ وصیت امام برائے یوسف بن خالد وغیرہ کتب کو اپنے اساتذہ ابو نصر احمد بن عباس بیاضی۔ احمد بن اسحاق جوزجانی اور نصر بن یحییٰ ابلیخی سے روایت کرتے ہیں یہ اکابر ان کتب کو ابو سلیمان موسیٰ جوزجانی تلمیذ محمد بن حسن شیبانی سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے استاد محمد بن حسن سے۔

اشارات المرام کے مصنف یہ سند بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :-

”ماتریدی نے قطعی دلائل کی روشنی میں ان اصولوں کو ثابت کیا اور یقینی

براہین کی بنا پر ان فروعات کو استحکام بخشا۔“

ہمارے مخلص دوست علامہ کوثری مرحوم ”اشارات المرام“ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

”بلاد ماوراء النہر بدعات کی آلودگی سے پاک صاف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلوں

پر بلا شرکت غیرے حدیث نبوی کا سکہ جاری تھا۔ احادیث و آثار کا یہ سلسلہ

سینہ لیبیہ منتقل ہوتا رہا۔ تا آنکہ ماوراء النہر کے امام السنن ابو منصور ماتریدی جن کو
امام ہدایت کے لقب سے پکارا جاتا تھا منظر عام پر آئے۔ انہوں نے اپنی تمام تر
صلاحیتوں کو مسائل و دلائل کی تحقیق و تدقیق کی تذکرہ دیا اور اپنی گراں بہا تصانیف
عقل و مذہب دونوں کو پیش نظر رکھا۔ (مقدمہ اشادات المرام ص ۹)

۹۶۔ یہ اقتباس اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ عقائد سے
ماتریدی کی تصانیف متعلق ماتریدی کے نظریات و فروعات امام ابو حنیفہ کے ان

اقوال پر مبنی تھے جو انہوں نے ان رسائل میں بیان کئے۔ امام تریدی نے افکار ابی حنیفہ کو عقلی
و منطقی دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیا جو قطعی طور پر شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔

ماتریدی جن موضوعات کے درس و مطالعہ میں منہمک رہ چکے تھے ان میں آپ نے بڑی
قابل قدر کتابیں تصنیف کیں۔ چنانچہ یہ کتب آپ کی جانب منسوب ہیں :-

کتاب تاویل القرآن۔ کتاب ماخذ الشرائع۔ کتاب المجدل۔ کتاب الاصول فی اصول الدین
کتاب المقالات فی الكلام۔ کتاب التوحید۔ کتاب رد اوائل الادلتہ للکعبی کتاب رد وعید لفسق
للکعبی۔ کتاب رد تہذیب المجدل للکعبی۔ کتاب رد الاصول الخمسة لابی محمد الیاسی۔
رد کتاب الامامة لبعض الروافض۔ الرد علی القرامطة۔

بعض علماء کا قول ہے کہ ماتریدی نے فقہ اکبر کی شرح بھی لکھی تھی جسے امام ابو حنیفہ
کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مگر علمی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ شرح مشہور حنفی فقیہ ابواللیث
سمرقندی کی تصنیف ہے۔

۳۳۔ امام ماتریدی کا طرز فکر و نظر

تفہیم ماتریدی کا طرز و انداز ۹۴۔ ابو منصور ماتریدی اور ابو الحسن اشعری باہم معاصر

تھے۔ دونوں کے غایات و مقاصد میں بھی چنداں فرق نہ تھا۔ البتہ اشعری کی بود و باش مرکز اعداء سے بہت قریب تھی۔ آپ بصرہ میں توطن پذیر تھے جو مسلک اعتزال کا مسکن و موطن بلکہ اس کی جنم بھومی تھا۔ محدثین و فقہاء اور معتزلہ کے مابین سر زمین عراق میں جو معرکہ آرائیاں ہو رہی تھیں بصرہ ان کا اہم ترین مرکز تھا جہاں تک ماتریدی کا تعلق ہے آپ ان معرکہ آرائیوں کی سر زمین سے دور بستے تھے۔ تاہم ان مجادلات کی صداقت بازگشت وہاں بھی سنائی دیتی تھی۔ چنانچہ ماوراء النہر میں بھی معتزلہ آباد تھے جو عراقی معتزلہ کے زور پاتھے اور ان کی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے رہتے تھے۔ ماتریدی نے انہی سے ٹکر لیا اور ان کے نظریات کا تار و پود پھیر کر رکھ دیا۔

اشعری اور ماتریدی دونوں چونکہ ایک ہی دشمن کے خلاف صف آراء تھے لہذا ان کے نظریات بھی بڑی حد تک متقارب تھے اگرچہ متحد نہ تھے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ اشاعرہ ماتریدیہ کے نظریات میں کوئی اساسی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ استاد امام شیخ محمد عبد العقائد العنصیریہ کے حواشی میں رقمطراز ہیں :-

”ماتریدیہ و اشاعرہ کا باہمی اختلاف دس مسائل سے متجاوز نہیں اور وہ بھی صرف نزاع لفظی کی حد تک ہے۔“

مگر امام ماتریدی کے اقوال و آراء اور امام اشعری کے آخری آثار و نتائج کا دقیق مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دونوں کا طرز فکر و نظر جداگانہ نوعیت کا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ دونوں قرآن کے ثابت کردہ عقائد کو عقل و بیان کی روشنی میں ثابت کرنا چاہتے تھے۔ عقائد قرآن کے دائرہ سے نکلتا دونوں کو گوارا نہ تھا۔ البتہ ایک فریق پر نسبتاً عقلیت کا زیادہ غلبہ تھا۔ مثلاً اشاعرہ کہتے ہیں کہ خدا کی معرفت حاصل کرنے شریعت کی بناء پر واجب ہے جب کہ ماتریدیہ امام ابو حنیفہ کی اتباع میں یہ کہتے ہیں کہ اس کا وجوب عقلی ہے۔

اشاعرہ کے نزدیک امر شرع کے بغیر اشیاء میں سرے سے کوئی حسن ذاتی نہیں پایا جاتا جس کا فہم و ادراک عقل انسانی بھی کر سکتی ہو۔ بخلاف ازیں ماتریدیہ کی رائے میں اشیاء میں حسن ذاتی موجود ہے جو مدرک بالعقل ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں میں بڑا نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

نظر میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ماتریدیہ کے مسلک پر عقلیت کی گہری پیمائش ہے اگرچہ اغراق و مبالغہ سے پاک ہے۔ بخلاف ازیں اشاعرہ نقلی دلائل کی چابکدہ بازی میں محصور رہتے ہیں اور عمل سے ان کی تائید کرتے ہیں۔ فریقین کے طرز فکر و نظر پر بحث کرنے والا یہ سوچنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ اشاعرہ کا مقام محدثین و فقہاء اور معتزلہ کے بین بین ہے۔ جب کہ ماتریدیہ کا درجہ معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ چاروں فرقے ایک ہی میدان میں مصروف جہد و سعی ہیں اور یہ سب ایمان و یقین سے بہرہ ور ہیں۔ گویا یوں سمجھئے کہ خط مستقیم کے ایک کنارہ پر معتزلہ اور دوسرے سر پر اہل حدیث ہیں۔ معتزلہ کی قریبی جانب جو ریح ہے۔ وہاں ماتریدیہ براہمن ہیں اور محدثین کے قریبی ریح پر اشاعرہ۔ اس کی صورت یوں ہوگی۔

معتزلہ | ماتریدیہ | اشاعرہ | اہل حدیث

امام ماتریدی کی عقلیت پسندی | ۹۸۔ امام ماتریدی عقل پر اعتماد کرتے ہیں بشرطیکہ وہ مشعل شرع سے مستنیر ہو۔ گویا وہ نظر

عقلی کے وجوب کے قائل ہیں۔ بخلاف ازیں محدثین و فقہاء کا اعتماد نقل پر ہے اور وہ اسی میں حق و محدود و محصور تصور کرتے ہیں۔ محدثین عقل سے اس لئے استناد نہیں کرتے کہ مبادا وہ جاوہ مستقیم سے بھٹک جائے اور زلیغ و ضلالت کی موجب ہو۔ ماتریدی کتاب التوحید میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ شیطانی و سوسہ ہے۔ اس لئے کہ عقل و نظر کے منکرین بھی عقل سے استدلال کرتے ہیں۔ لہذا نظر و فکر کی اہمیت گویا ان کے یہاں بھی مستم ہے۔ فکر و تامل سے انکار کیونکر ممکن ہے جب کہ خلاق عالم نے اپنے بندوں کو تدبیر و تفکر کی دعوت دی ہے اور عبرت پذیری کو ان کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ یہ اس امر کی

قطعی دلیل ہے کہ نظر و فکر علی مصادر و ماخذ میں سے ایک عظیم مصدر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علم العقائد کی طلب و تحقیق میں امام ماتریدی عقل نزاع کی تعمین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آیا اس کا مصدر و ماخذ صرف نقل ہے یا کچھ اور بھی؟ پھر خود ہی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ عقل و نقل الگ الگ دو مستقل ماخذ ہیں عقل کو ماخذ احکام قرار دینے کے باوجود آپ اس کی لغزش سے خائف و ہراساں بھی ہیں۔ تاہم آپ کا یہ خوف دہرا اس اس امر کا متقاضی نہیں ہوتا کہ محدثین و فقہاء کی طرح عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دیں۔ البتہ اس خوف کا تقاضا یہ ہے کہ عقل کے مقتضیات پر عمل کرنے میں حرم و احتیاط سے کام لیا جائے اور عقل کے ساتھ ساتھ نقل کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ ماتریدی فرماتے ہیں :-

”جو شخص نقلیات سے استدلال کر کے محتاط پہلو اختیار نہیں کرتا اور جو چیزیں عقل کی نگاہ سے اوجھل ہیں ان کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔ گو یا اس کا منشاء و مقصود یہ ہے کہ نبی کریم کے اشارہ کے بغیر اپنی ناقص عقل کی مدد سے حکمت ربوبیت کا احاطہ کرتے۔ تو وہ اپنی عقل پر ظلم ڈھاتا اور اس پر ایسی نازک ذمہ داری ڈالنا چاہتا ہے جس کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی۔“

اس اقباس کا حاصل یہ ہے کہ ماتریدی ان عقلی احکام سے استناد کرتے ہیں جو خلاف شرع تہ ہوں ان کے خلاف شرع ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک حکم شرع کے آگے گردن جھکانا ضروری ہے۔

عقل و نقل کی موافقت و مطابقت | ۹۹۔ عقل و نقل کی ہم آہنگی کا قانون تفسیر

قرآن میں امام ماتریدی کا ہادی و مرشد ہے اور

آپ ہمیشہ اسے پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر قرآن میں آپ متشابہات کو حکمت پر محمول کرتے ہیں۔ متشابہات کی تفسیر و تاویل حکمت کی روشنی میں کرتے ہیں۔ اگر کسی آیت کی تفسیر مومن کی طاقت سے بالا ہو تو اس کے علم کو خدا کی سپرد کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ماتریدی قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے ہیں اس لئے کہ قرآن میں تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا۔ البتہ قرآن اگر خدا کے سوا کسی اور کا نازل کردہ ہوتا تو اس میں کثرت سے اختلاف پایا جاتا۔

اس عقل پسندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماتریدی بعض عقلی مسائل میں معتزلہ کے ہمنوا بن گئے۔
 جب ان کے اکثر نظریات معتزلہ کے خلاف تھے۔ وہ ان مسائل میں معتزلہ کے ہم خیال تھے۔

- ۱۔ شرعی مسائل میں منکر و نظر ضروری ہے۔
- ۲۔ خدا کی معرفت عقل سے حاصل ہوتی ہے۔
- ۳۔ حسن و قبح کا مدار عقل انسانی پر ہے۔

۵۵ اقبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں کہ ماتریدی کے عقائد
 و افکار محدثین کی نسبت معتزلہ سے قریب تر تھے۔

ماتریدی بصری کے آغاز میں محدثین اور معتزلہ کے مابین معرکہ آرائی شروع ہوئی۔ ہمارے
 روم دوست علامہ کوثری فرمایا کرتے تھے۔

”اشاعرہ محدثین اور معتزلہ کے بن بن تھے۔ جب کہ ماتریدیہ معتزلہ اور اشاعرہ کے
 رقبوں کے وسط میں واقع ہوئے تھے۔“

ہماری رائے ہے کہ جن جوہری مسائل میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ان میں ماتریدیہ
 کا نقطہ نگاہ عقل و نقل کا حسیں مرکب نظر آتا ہے۔ بہت سے مسائل میں ماتریدیہ اشاعرہ
 کے ہم خیال ہیں اور بعض میں مخالف۔ اب ہم مختصراً افکار ماتریدی پر تبصرہ کریں گے۔ جس
 طرح قبل ازیں اشاعرہ کے خیالات اجمالاً بیان کئے تھے مزید براں ان دونوں میں محل
 نزاع و وفاق کی بھی نشان دہی کریں گے۔

۱۰۱۔ ماتریدی کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ عقل
 بنا بر عقل معرفت خداوندی کے
 وجوب کا ادراک ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں غور و فکر
 کا حکم دیا اور انسانوں کو کائنات عالم میں تفکر و تامل کی تلقین فرمائی۔ قرآنی
 تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل اگر جاوہ مستقیم پر گامزن رہے۔ اور تقلید و
 نقلت سے پاک رہے تو اس سے ایمان و معرفت کا حصول ممکن ہے۔ اس
 طرح قرآنی آیات محمول بہا ٹھہریں گی۔ فکر و نظر کو ترک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ احکام
 قرآنی کو ہل چھوڑ دیا جائے۔ عقل کو معرفت خداوندی کا ذریعہ قرار نہ دینے سے یہ لازم
 آئے گا کہ وہ نتائج و فوائد معطل ہو کر رہ جائیں جو اللہ تعالیٰ نے نظر و فکر پر مرتب

کہتے تھے۔ اگر نظر و فکر کے علی الرغم معرفت کا حصول ممکن نہ ہوتا تو وہ نتائج متقطع رہ جاتے جو اللہ تعالیٰ نے غور و خوض پر موقوف فرمائے تھے۔

اگرچہ ماتریدی کے نزدیک عقل معرفت خداوندی کے حصول میں آزاد ہے۔ تاہم مستقلاً اس سے شرعی احکام کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

معتزلہ کا نقطہ نگاہ بھی اس کے قریب قریب ہے۔ البتہ دونوں کے نظریات میں بڑا بڑا فرق پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک معرفت خداوندی کی تحصیل عقل کی رو سے واجب ہے۔ ماتریدیہ اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ عقل معرفت خداوندی کے وجوب کا ادراک کر سکتی ہے مگر واجب کرنے والی خدا کی ذات ہے۔

عقل اشیاء کے حسن و قبح کا ادراک کر سکتی ہے | ۱۰۲ - ماتریدیہ کا موقف یہ ہے کہ اشیاء کا حسن و قبح ذاتی ہوتا ہے اور عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک اشیاء کی تین قسمیں ہیں۔

- (۱) وہ اشیا جن کے حسن کا ادراک عقل انسانی کر سکتی ہے۔
 - (۲) وہ اشیا جن کی قباحت معلوم کرنا بنا بر عقل ممکن ہے۔
 - (۳) وہ اشیا جن کے حسن و قبح کا ادراک عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ شارع سے معلوم کیا جاتا ہے۔
- معتزلہ بھی اسی قسم کی تقسیم کرتے ہیں۔ جیسا کہ امام اشعری کے استاد شیخ ابو علی جبائی کے نقل سے ہم قبل آ رہے ہیں۔ تاہم دونوں کی تقسیم میں نقطہ امتیاز یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک جو چیز عقلاً حسن ہو وہ واجب الفعل ہوتی ہے اور جو قبیح ہو وہ حرام ہوتی ہے۔ مگر ماتریدیہ اس حد تک تجاوز نہیں کرتے بلکہ امام ابو حنیفہ کی اتباع میں یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ عقلاً اشیاء کے حسن و قبح کا ادراک ممکن ہے مگر آدمی اس وقت تک تکلف و مامور نہیں ہوتا۔ جب تک شارع حکم نہ دے۔ اس لئے کہ عقل بالاستقلال دینی احکام صادر نہیں کر سکتی۔ بلکہ احکام صادر کرنا صرف ذات باری تعالیٰ کو زیب دیتا ہے۔
- اشعری ماتریدیہ کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے کہ وہ اشیا کے ذاتی حسن و قبح کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک حسن و قبح کا معیار و مدار شارع کے اوامر و نواہی ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی کام حسن اس لئے ہے کہ وہ شرعاً مامور بہ ہے اور قبیح اس لئے ہے

کہ اللہ نے اس سے روکا ہے۔

یہ بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ امام ماتریدی کا نقطہ نگاہ معتزلہ و اشاعرہ کے نظریات کی نسبت متوسط ہے۔

۱۰۳۔ یہاں ایک تفسیر نقطہ بھی ہے جس کی بناء پر ماتریدی مسلک و منہاج اشاعرہ

معتزلہ سے متمیز ہو جاتا ہے اور وہ افعال اللہ کے معطل ہونے کا مسئلہ ہے۔ اشاعرہ کی رائے میں اللہ کے افعال معطل نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ کسی کے سامنے مسئول و جوابدہ نہیں۔ بخلاف ان میں معتزلہ کے نزدیک افعال خداوندی مقاصد و اغراض سے معطل ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ حکیم ہے۔ کوئی کام ظن و تخمین کی بناء پر نہیں کرتا بلکہ اس سے پہلے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا ہے۔ پھر اس سے نتیجہ نکالتے ہیں کہ صلاح و اصلاح پر عمل کرنا خدا پر واجب ہے۔ کیونکہ جب اشیاء کا حسن و قبح ذاتی ہے اور اللہ تعالیٰ وہی کام کرتے ہیں چو قرین حکمت و مصلحت ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ مجال ہے کہ وہ کسی غیر صالح فعل کا حکم صادر کرے اور صالح سے روک دے پس اس سے معلوم ہوا کہ صلاح و اصلاح اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔

ماتریدی کا نقطہ نظر معتزلہ و اشاعرہ سے مختلف ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبت سے منزہ ہے۔ اس کے افعال بقا صانع حکمت و مصلحت صادر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حسب بیان خود حکیم و علیم ہے۔ اس نے اپنے احکام تکلیفیہ اور افعال تکوینیہ میں حکمت و مصلحت کو ملحوظ رکھا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ حکمت و مصلحت کا قصد و ارادہ کرنے میں مجبور و مقہور نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ با اختیار صاحب ارادہ اور جو چاہے کرنے والا ہے۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ اس پر صلاح و اصلاح کا انجام دینا واجب ہے۔ کیونکہ اس کا وجوب اختیار و ارادہ کے منافی ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ اس پر کسی کا حق واجب الادا ہے۔ حالانکہ وہ بندوں پر فائق ہے اور اس سے کسی فعل کی باز پرس نہیں کی جاسکتی اور اگر اس پر کسی کام کو واجب ٹھہرایا جائے تو اس کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ بندوں کے آگے مسئول اور جوابدہ ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذلک علواً کبیراً۔

حق بات یہ ہے کہ مسئلہ زیر نظر میں ماتریدی و معتزلہ کا اختلاف اساسی و جوہری قسم کا نہیں۔

بلکہ تعبیر و بیان کا اختلاف ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ افعال خداوندی بتقاضاۓ حکمت مصلحت صادر ہوتے ہیں اور عبت نہیں ہوتے۔ معتزلہ اسے وجوب سے تعبیر کرتے ہیں جس مطلب یہ ہے کہ حکمت و مصلحت کی رعایت خدا پر واجب ہے۔ ماتریدیہ کے نزدیک اظہار و بیان کا یہ طریقہ محلی استبعاد ہے۔ اس لئے کہ وجوب کا تقاضا ہے کہ حکم عمل سے سابق ہو۔ حالانکہ فعل کے مطابق حکمت ہونے کا حکم وقوعِ فعل کے بعد صادر کیا جاتا ہے نہ کہ وقوع سے پہلے۔

جہاں تک معتزلہ و اشاعرہ کے باہمی اختلاف کا تعلق ہے وہ جوہری و اساسی اس اختلاف کا مبنی یہ ہے کہ آیا اشیاء میں حسن و قبح ذاتی ہوتا ہے یا غیر ذاتی ؟

۱۰۲۔ اشاعرہ و ماتریدیہ کے مابین افعال خداوندی کے بارے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی بنیاد

دیگر مسائل میں بھی اختلاف رہنا ہوا۔ یہ مسائل فرعی و غیر فرعی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً اشاعرہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو پیدا کرتے مگر انہیں شرعی احکام مکلف نہ کرتے۔ تکلیف احکام بھی خدا کا ارادہ تھا اور وہ اس کے سوا بھی ارادہ کر سکتا اس کے برعکس ماتریدیہ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکمت و مصلحت کے تحت شرعی احکام کا ارادہ کیا تھا اور وہ اس حکمت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

اشاعرہ کے نزدیک عقلاً یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اطاعتِ شکار کو سزا دے اور عاصی کو جزا دے۔ اس لئے کہ نیکیوں کو بتقاضاۓ رحمت خداوندی جزا دی جاتی ہے اور عاصی محض اس کے ارادہ کی بناء پر سزا ملتی ہے اور اس کے فعل و ارادہ پر کسی کو باز پرس کا حق نہیں۔ بخلاف ازیں ماتریدیہ کا قول ہے کہ نیکیوں کی جزا اور عاصی کی سزا خدا کی حکمت و ارادہ کے تحت ہے اس لئے کہ اللہ حکیم و عظیم ہے قرآن میں جہاں جہاں ثواب و عقاب کا ذکر آیا وہاں اس نے اپنی ذات کو حکمت سے بھی موصوف کہا ہے

مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے :-
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا
اَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَتْ ذَلَالًا مِنَ
اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

اور چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھ کاٹ دو
یہ ان کے کئے کی سزا اور خدا کی طرف سے عبرت
ہے اور اللہ تعالیٰ غالب اور صاحبِ حکمت

اشاعرہ کی رائے میں اللہ تعالیٰ اعتقلاً اپنی بیان کردہ وعید کی خلاف ورزی بھی کر سکتے ہیں
تاریخ یہ اسے جائز نہیں سمجھتے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے حکمت و مصلحت کے مطابق ہوتے
ہیں۔ قرآن میں ہے: **إِنَّ اللَّهَ لَا يُخَلِّفُ الْوَعْدَ** واللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا
اس آیت سے متفق ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے وعید میں تخلف کا امکان نہیں ہوتا۔

جبر و اختیار کے مسئلہ میں اختلاف | ۱۰۵۔ ان مسائل کی تفصیلات ذکر کرنے سے

قبل اب ہم ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ کی طرف
توجہ کرتے ہیں اور یہ جبر و اختیار کا مسئلہ ہے۔ ہم اس مسئلہ کے ضمن میں بتائیں گے کہ
مستزاد اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مابین کس طرح یہ مسئلہ ایک اکھاڑہ بنا ہوا تھا اور
اہم کھینچا تانی ہو رہی تھی۔

مسئلہ زیر نظر میں ہم مستزاد کا موقف بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بندہ خود اپنے
فعال کو جنم دیتا ہے۔ لہذا اسے احکام سے مخاطب و مکلف کرنا صحیح ہے۔ نیز یہ کہ خلق
فعال کی قدرت خدا کی ولایت کردہ ہے۔

اس ضمن میں اشاعرہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ فعال خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ بندہ سے
کسب کا سد و نہ ہوتا ہے اور اسی کے بل بوتے پر اسے مکلف بالاحکام کیا جاتا ہے
اور وہ ثواب و عقاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

امام ماتریدی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سب اشیاء کا خالق ہے۔ اس کا ثبات ارضی
یہ چیز اس کی پیدا کردہ ہے۔ خلق اشیاء میں اس کا کوئی شریک و ہمیم نہیں۔ خلق اشیاء
کے فعل کو کسی اور کے لئے ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کا شریک ہے۔ یہ بات نہ سمجھ
میں آتی ہے اور نہ تسلیم کی جاسکتی ہے۔ ماتریدی کی یہ بھی کہتے ہیں حکمت خداوندی اس امر
کی مقتضی ہے کہ بندہ صرف اپنی افعال میں جزا کا استحقاق رکھتا ہے جن میں وہ بااختیار ہو
سزا کو بھی اسی پر قیاس کیجئے بلکہ سزا دینا جہاں حکمت کا مقتضی ہے وہاں فرین عدل و
انصاف بھی ہے۔

تقریباً افعال العباد میں جہد فی سبیل اللہ کے لئے نذر خدا کے پیدا کردہ ہونگے۔
وَمَا يَلْمِزُكُمْ فِي مَا لَمْ تُحِزُوا (اللہ تعالیٰ نے تمہیں سزا دینا اور کوہنہ نہیں کرتا)
اس سے ماتریدیہ و مستزاد کے نقطہ نگاہ کا فرق و امتیاز کھل کر سامنے آتا ہے

ماتریدیہ کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ افعال العباد خدا کے پیدا کردہ ہیں اور اس کی دی ہوئی قوت سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف بندے کو فعل مختار قرار دیا جاتا ہے اور دوسری جانب یہ کہا جاتا ہے کہ افعال خدا کے پیدا کردہ ہیں اور اس کی قدرت سے انجام پاتے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے؟ شاعرہ کی طرح ماتریدیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بندہ افعال کا کاسب ہوتا ہے اور کسب افعال میں وہ بااختیار ہے اور اسی بناء پر وہ ثواب و عقاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس رائے کے اظہار میں شاعرہ و ماتریدیہ یک زبان ہیں۔ مگر آگے چل کر ان میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اشعری کہتے ہیں کہ خدا کے پیدا کردہ افعال اور بندے کے اختیار میں وجہ افتراق و اتصال بندے کا کسب ہے اگرچہ بندہ بذات خود کسب میں موثر نہیں۔ بنا بریں افعال کی طرح کسب بھی خدا کا پیدا کردہ ہوگا۔ علماء کا قول ہے کہ یہ نظریہ موذی الی الجبر ہے۔ کیونکہ بندہ جب فعل میں موثر نہیں تو اس کا بااختیار ہونا بے معنی ہے یہی وجہ ہے کہ علماء اسے جبر متوسط کے نام سے پکارتے ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور محدث ابن حزم اسے جبر کامل قرار دیتے ہیں جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

یہ ہے کسب امام اشعری کی نگاہ میں اور اس کے آثار و نتائج !

ماتریدی کے نزدیک کسب خدا کی ودیعت کردہ قدرت کی بناء پر معرض ظہور میں آتا ہے۔ ماتریدی کی رائے کے مطابق بندہ قدرت مخلوقہ کے بل بوتے پر کسب افعال اور عدم کسب دونوں پر قادر ہے۔ گویا وہ آزاد علی الاطلاق ہے اگرچہ کسی فعل کو انجام دے اور اگر چاہے چھوڑ دے۔ ثواب و عقاب کا مہبتی یہی ہے۔ اندر میں صورت خدا کے خالق افعال ہونے اور بندے کے اختیار میں منافات نہیں ہوگی۔

۱۔ اس سے یہ حقیقت واضح گاہ ہوتی ہے کہ ماتریدی کا نظریہ معتزلہ و اشاعرہ کے نقطہ ہائے نگاہ کی نسبت متوسط ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ افعال خدا کی ودیعت کردہ قدرت کی بناء پر صلا ہوتے ہیں۔

۲۔ اشاعرہ کی رائے ہے کہ بندے میں فعل کی قدرت نہیں ہوتی بلکہ اس میں کسب فعل پایا جاتا ہے جس میں بندہ بذات خود موثر نہیں۔

۳۔ ماتریدیہ کا قول ہے کہ کسب فعل بندے کی قدرت و تاثیر سے ہوتا ہے۔

بندے کی یہ قدرت جو تاثیر فی الکسب کی موجب ہوتی ہے اور اس کا اثر وجود فعل

کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اس کو استطاعت بھی کہتے ہیں جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک تکلیف احکام کا مدار و معنی ہے مائریدی کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے۔ یہ قدرت بندے میں وجود و فعل کے وقت پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ یہ قدرت متجددہ و حادثہ ہے جو وقوع فعل سے قبل وجود میں نہیں آسکتی۔ معتزلہ کے نزدیک استطاعت وقوع فعل سے قبل ہوتی ہے۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ بندے کو نفاطی کر کے تکلیف بالاعمال ظہور فعل سے قبل کیا جاتا ہے نہ کہ اس کے بعد۔ لہذا استطاعت کا ظہور فعل سے قبل پایا جانا ضروری ہے۔

مسئلہ صفات باری تعالیٰ | ۱۰۶۔ معتزلہ صفات باری کی نفی اور اشاعرہ ان کی اثبات کرتے ہیں۔ اشاعرہ کے نزدیک صفات خداوندی

غیر ذات ہیں۔ اشاعرہ صفات خداوندی مثلاً قدرت، ارادہ، علم، حیات، سمع، بصر اور کلام کا اثبات کرتے اور انہیں غیر ذات قرار دیتے ہیں۔ معتزلہ کے نزدیک غیر ذات کوئی چیز نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں خدا کی ذکر کردہ صفات مثلاً علیم، بصیر، حکیم، سمیع و بصیر اس کے اسماء ہیں۔

مائریدی نے اگر صفات باری کا اثبات کیا مگر ساتھ ہی یہ کیا کہ صفات میں ذات ہیں۔ نہ قائم بالذات ہیں اور نہ منفک عن الذات۔ گویا ذات سے الگ ان کا کوئی وجود بھی نہیں تاکہ یہ استحالیہ لازم آئے کہ ان کے تعدد سے قدام کا تعدد ثابت ہوتا ہے۔ مائریدی کا نظریہ معتزلہ کی رائے سے قریب تر یا یوں کہئے کہ ان کے نقطہ نظر سے متحد ہے مسلمانوں کے یہاں امرے سے اس بات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ قادر و علیم اور سمیع و بصیر ہے۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آیا صفات غیر ذات ہیں اور اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہیں یا نہیں؟ معتزلہ اس کی نفی کرتے ہیں۔ اشاعرہ انہیں غیر ذات مگر قائم بالذات قرار دیتے ہیں۔ مائریدی جب یہ کہتے ہیں کہ صفات ذات کے منغائر نہیں تو ان کا یہ نقطہ نظر معتزلہ سے ہم آہنگ ہے۔

کلام باری میں اختلاف | ۱۰۷۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی صفت کلام اور قرآن کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کا تعلق ہے معتزلہ خدا کی کسی

کلام نامی صفت کے قائل نہیں جو مستقل عن الذات یا غیر مستقل ہو۔ وہ قرآن کو مخلوق قرار دیتے ہیں۔ اشاعرہ اس ضمن میں محدثین و فقہاء کی راہ پر گامزن ہیں اور قرآن کو کلام اللہ

اور غیر مخلوق مانتے ہیں۔ تاہم وہ قدامتِ قرآن کا عقیدہ نہیں رکھتے۔

ماتریدی آئے تو انہوں نے اختلاف کی یہ خلیج پاٹ دی۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ کلامِ خدا کی ایک صفت ہے جو قائم بالذات ہے۔ اس اعتبار سے کلامِ گویا ان صفات میں سے ہے جو متصل بالذات ہیں اور اس کی طرح قدیم ہیں۔ کلامِ حروف و کلمات سے مرکب نہیں۔ اس لئے کہ حروف و کلمات حادث ہیں اور حادث کا قیام قدیم اور واجب الوجود کے ساتھ ممکن نہیں۔ کیونکہ حادث اعراض میں سے ایک عرض ہے اور قائم بالذات نہیں نظر میں وہ حروف و کلمات جو دال علی المعانی ہیں حادث ٹھہریں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن کریم جو عبارت ہے حروف و الفاظ اور ان عبارات سے جو معانی قدیم پر دلالت کرتی ہیں حادث ہوگا اور اس طرح معتزلہ و ماتریدی یہ ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ماتریدی نے بھی معتزلہ کی طرح قرآن کو حادث ٹھہرایا اگرچہ مخلوق نہیں کہہ کر خلاصہ کلام قرآن مجید کے بارے میں تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔

معتزلہ :- ۱۔ معتزلہ خالقِ قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اشاعرہ :- ۲۔ اشاعرہ محدثین و فقہاء کی طرح قرآن کو غیر مخلوق قرار دیتے ہیں مگر اسے قدیم تصور نہیں کرتے۔

ماتریدی :- ۳۔ ماتریدی یہ قرآن کو حادث مانتے ہیں مگر مخلوق قرار نہیں دیتے۔

یہ تینے محل نزاع! یہ اختلاف بے معنی ہے اور نزاعِ نقلی کے قبیل سے ہے۔

تاویل آیات اور ماتریدیہ ۱۰۸۔ ماتریدیہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ صفات و احوال کو تسلیم کرنے اور ان کی نفی نہ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ

کو تجسیم اور زمان و مکان سے منزہ قرار دیتے ہیں جن آیات میں خدا کے چہرہ ہاتھ اور آنکھ کا ذکر آیا ہے ان کی تاویل کرتے اور جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں ہمیشہ آیاتِ قرآن کو محکات پر مبنی سمجھتے ہیں۔ مثلاً استوی علی العرش کی تاویل و تفسیر وہ لوہے کے عرش کو درست حالت میں پیدا کیا۔ اسی طرح آیت ”مَنْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ مَّجْلِ الْوَرِيدِ“ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں خدا کے غلبہ و کمالِ قدرت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے مثالی ہذا القیاس ماتریدی فرقة معتزلہ کی طرح ایسی تمام آیات کی تاویل کرتے ہیں جن سے تشبیہ تجسیم یا زمان و مکان کا دہم پڑتا ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں اشعری سے دو قول منقول ہیں۔

ایک قول ان کی کتاب الايات میں مذکور ہے کہ ایسی آیات کی تاویل نہیں کرنا چاہئے بلکہ یوں کہتا زیادہ موزوں ہے کہ اس کے ہاتھ تو ہیں مگر مخلوق کی مانند نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ

دوسرا قول ان کی کتاب "اللمح" میں منقول ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو آیات مجسم تشبیہ و تجسیم ہیں ان کی تاویل اس انداز سے کی جائے کہ وہ آیات تنزیہیہ سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور اس کا طریقہ حسب بیان ماتریدی یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر قبول کیا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کی آخری رائے ہے۔ کیونکہ اشاعرہ اسی کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جو لوگ خدا کے اعضاء مثلاً ہاتھ چہرہ وغیرہ کا عقیدہ رکھتے ہیں وہ مشبہہ ہیں سے ہیں۔ امام اشعری کی یہ آخری رائے مکمل طور پر ماتریدیہ کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ | ۱۰۹۔ قرآن کریم کی بعض آیات سے روایت باری کا ثبوت ملتا ہے مثلاً

وَجِئْنَا بِقَوْمٍ تَوَلَّوْا بَعْدَ مَا نُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا اَعْمٰیۃً
نَٰظِرِيۃً | کچھ چہرے اس روز پر رونق ہونگے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہونگے۔

تساویں ماتریدیہ اشاعرہ کی طرح بروز قیامت دیدار خداوندی کا اثبات کرتے ہیں۔ معتزلہ روایت باری کے قائل نہیں کیونکہ روایت کے لئے رائی و مرئی کا کسی مکان میں ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے خدا کی مکانیت لازم آتی ہے۔ جس سے وہ اسی طرح معتزلہ جیسے انقلابات روزگار سے۔

ماتریدی بروز قیامت روایت باری کا اثبات کرتے اور کہتے ہیں کہ روایت باری قیامت کے کوائف و احوال میں داخل ہے۔ جن کا صحیح علم خدا کے لقمہ کسی کو نہیں۔ ہمیں صرف ان عبارات کا علم حاصل ہے جن سے روایت کا اثبات ہوتا ہے۔ مگر ہم اس کی کیفیت سے بیگانہ ہیں۔ مزید برآں معتزلہ زیارت خداوندی کو جہانی روایت پر قیاس کرتے ہیں۔ گویا ان کی نگاہ میں جو جہانیت سے پاک ہے اس کا دیدار بھی مجسم اشیا ایسا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قیاس ناقص قسم کا ہے۔ غائب کو حاضر پر قیاس کرنا اس وقت درست ہوتا ہے جب غائب بھی

حاضر کی جنس سے ہو۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں یہ قیاس نامکمل ہوگا اور اس کے ارکان ناکافی ہونگے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ زیارتِ خداوندی کا تعلق روزِ قیامت اور روزِ جزا و سزا کے ساتھ ہے اور یہ بھی اس روز کے احوال و کوائف میں سے ایک حال ہے جو شخص سلباً یا ایجاباً اس کی کیفیت معلوم کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے اور اس چیز کو تلاش کرنا چاہتا ہے جس کا علم اسے حاصل نہیں۔
اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

«وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عِنْدَهُ مُسْتَوْثِقًا»

جس چیز سے آپ آگاہ نہیں اس کے دور
تہ ہوں بے شک کان آنکھ اور دل خدا
سامنے جوابدہ ہونگے۔

۱۱۰۔ جمہور علماء اسلام کا اجماع ہے کہ مومن ابدی نہیں ہو سکتا۔ بنا بریں یہ مسئلہ متنازع فیہا رہا۔ کہ ایسا مومن کون ہے۔ خوارج کے نزدیک صغائر و کبائر کا ارتکاب کرنے والا کافر ہے۔ لہذا ان کی نظر میں نہ مسلم ہے نہ مومن۔

معتزلہ کہتے ہیں۔ مرتکب کبائر مسلم تو ہے مگر مومن نہیں۔ توبہ نہ کرنے کی صورت میں ابدی جہنمی ہوگا البتہ اسے کفار کی نسبت خفیف سزا دی جائے گی۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوارج و معتزلہ کی رائے میں اعمال جزو ایمان ہیں۔
بخلاف ازیں اشاعرہ و ماتریدیہ عمل کو جزو ایمان قرار نہیں دیتے۔ لہذا ان کے نزدیک معاصی کا ارتکاب کرنے والا ایمان کے دائرہ سے خارج نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کا حساب عقاب ہوگا اور اس کا بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے بخش دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماتریدیہ نزدیک کبائر کا ارتکاب کرنے والا ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ اگرچہ وہ تائب ہونے سے فوت ہو جائے۔ امام ماتریدی فرماتے ہیں:-

«اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ بدی کا بدلہ بدی کی صورت میں دیا جائیگا اور شلو ہوتا ہے:- «وَمَنْ جَاءَ بِالسَّبِيحَةِ فَلَا يَمْشِي إِلَّا بِمِثْلِهَا وَعَهْرًا يَطْلُمُونَ»
(جویرے اعمال لائے گا اسے ویسا ہی دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اس میں شبہ نہیں کہ جو شخص کفر و شرک کا ارتکاب نہیں کرتا اس کا گناہ کافر و شرک کے گناہوں سے کم درجہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفر و شرک کی سزا دائمی جہنم مقرر کی ہے اگر مرتکب کیا تو ایمان و تصدیق کے باوصف کافر حبسی سزا دی جاتی تو اس کی سزا اس کے جرم سے زیادہ ہوتی جو وعدہ خداوندی کے خلاف ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نہ بندوں پر ظلم کرتے اور نہ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کافر اور مؤمن عاصی کو برابر سزا دینا حکمت و عدلِ خداوندی کے بھی خلاف ہے اس لئے کہ گنہگار مؤمن سے بڑی نیکی انجام دے چکا ہے جو ایمان ہے اور اس نے بدترین شرک کا ارتکاب بھی نہیں کیا اور وعدہ کفر ہے اگر گنہگار مؤمن ہمیشہ دوزخ میں رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ افضل ترین نیکی یعنی ایمان کی جزا بدترین سزا یعنی کفر کی صورت میں دی گئی حالانکہ عدل و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جزا بااقتضای دی جائے نہ کہ زیادہ ملتیے ثواب میں صاف کیا جائے تو وہ خلاف حکمت نہیں۔

امام ترمذی مزید فرماتے ہیں :-

”حق بات یہ ہے کہ گنہگاروں کی سزا کا مسئلہ خدا کو سونپ دینا چاہئے اگر چاہے تو اپنے فضل و رحمت کی بنا پر بخش دے اور اگر چاہے ان کے گناہوں کو لقمہ سزا دے۔ البتہ وہ ابدی جہنمی نہ ہوں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان خوف ورجا کے بین بین ہیں۔ اللہ تعالیٰ اصغیرہ گناہوں کی سزا بھی دے سکتے ہیں اور کبائر سے درگزر بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن میں فرمایا:

إِنَّ لِلَّهِ لَا يَخْفَىٰ أُنْثَىٰ شَيْءٌ وَلَا يَخْفَىٰ
مَا هُوَ مِنْ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ
بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا۔

اللہ تعالیٰ اس بات کو محاف نہیں کرتے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اگر چاہیں تو درجہ گناہ بخش دیں اور جس نے خدا کیساتھ کسی کو شریک کیا تو اس نے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا۔

۱۱۔ یہ ہیں امام ترمذی کے اوکار و آراء ان مسائل میں جن میں تفسیری اور چوتھی صدی ہجری بلکہ بحث کے علماء مشغول و منہمک رہے اور ان کے مابین معرکہ آرائیوں کا باقاعدہ گرم رہا۔ تاہم علماء اس بات پر متفق ہیں کہ ان اختلافات کی بناء پر اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔ ان مسائل میں جو صنوع بحث اور نقطہ اختلاف مسلک صحابہ و تابعین سے قریب تر اقرب الی النجات اور ان شکوک و شبہات سے پاک تھا جن کو ہوادیتہ و السوہ لوگ تھے جنہیں دین اسلام کا عز و وقار ایک نگہ نہ بھاتا تھا۔ امام ترمذی کے اقوال و آثار معتزلہ کے نظریات سے قریب تر تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے عقل اقوال کی تفصیل بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۵۔ اتباع سلف صالحین

سلفیہ کون تھے؟ | ۱۱۲۔ اتباع سلف سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سلفی المشرک کہتے تھے اگرچہ ہم ان کے بعض عقائد و افکار کی نسبت اسلاف

کی جانب صحیح نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ جنابہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منصفہ شہر و دیوبند گم ہوئے ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے تمام اقوال و آراء امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں جنہوں نے عقائد سلف کو حیاتِ نو بخشی اور ان کی نشاۃِ ثانیہ کیلئے مخالفین کے سامنے سینہ سپر ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں یہ لوگ ایک مرتبہ پھر عرضِ ظہور میں آئے۔ یہ حیاتِ نو ان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے باعث حاصل ہوئی جو سلفیت کے سرگرم داعی تھے۔ ابن تیمیہ نے بعض دیگر مسائل کی دعوت و تبلیغ کا بھی اہٹایا جو آپ کے عصر و عہد کی پیداوار تھے۔

سلفی عقائد پھر بارہویں صدی ہجری میں جزیرہ عرب میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس دور میں ان کا اجیاء محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں انجام پایا۔ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے رفقاء کرام ان عقائد کی نشر و اشاعت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ دیگر علماء اسلام بھی اس کا میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے بھی وہ جہ سے کہ وہ اپنی تحریک پر روشنی ڈالنا بھی ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ یہ جنابہ مسئلہ تو حید اور قبروں سے اس کے رابطہ و تعلق پر گفتگو کرتے تھے۔ آیاتِ تاویل و تشبیہ کا مسئلہ بھی ان کے یہاں اکثر زیر بحث آتا۔ ان کا آغاز ظہور چوتھی صدی ہجری میں ہوا یہ اپنے عقائد و افکار کو امام احمد بن حنبل کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ بعض جنابہ ان عقائد کی نسبت امام احمد کی جانب درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں ان سے بدل آتا ہوتے تھے۔

ان سلفی المشرک لوگوں اور شاعرہ کے مابین اکثر تبدل آتائی اور معرکہ آرائی کا بازار گرم رہتا۔ سلفی قصداً ایسے مقامات میں جا کر نکالتے جہاں شاعرہ کا بڑا زور ہوتا پھر وہاں بڑے زور کا رن پڑتا اور باہم نبرد آتائی جاری رہتی۔ دونوں فریقین طریق سلف کے داعی تھے ہم شاعرہ کا مذہب و مسلک بیان کر چکے ہیں اگرچہ ہم نے یہ نہیں بتایا کہ عقائد سلف کے ساتھ انہیں کس قدر وابستگی تھی۔ اب ہم بیان کریں گے کہ عقیدہ سلفیہ سے کیا مراد ہے؟ یہ نام نہاد سلفی کیا عقائد رکھتے تھے؟ اور ان کے نام اور حقیقت میں کس نوع کا ربط و تعلق پایا جاتا ہے؟

۳۶۔ اتباع سلف کا مسلک و منہاج

عقائدِ اسلامیہ کے فہم و ادراک کے چار طریقے | ۱۱۳۔ ہم جان چکے ہیں کہ معتزلہ یونانی منطق و فلسفہ کے طریقِ جدل و بحث سے متاثر ہو کر اسلامی عقائد میں فلسفیانہ ڈگری پر گامزن تھے۔ اتباعِ فلسفہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ دفاعِ اسلام کے پیش نظر اعداءِ دین کے سامنے سینہ سپر تھے۔ اس لئے دورانِ خطرہ منطق و فلسفہ سے استفادہ کرتے تھے۔ بعد ازاں اشاعرہ و ماتریدیہ بھی معتزلہ کی راہ گردہ شاہراہ پر چل نکلے۔ اشاعرہ و ماتریدیہ تاسخ و آثار میں معتزلہ کے قریب تھے۔ بعض امور میں اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔

سلفی علماء اگر اس طرزِ فکر کے سامنے ڈٹ گئے۔ ان کا منشا مقصود یہ تھا کہ ساتِ عقائد کا طرز و انداز وہی ہونا چاہئے جو عصرِ صحابہ و تابعین میں رائج تھا اور وہ تھا کہ عقائد وہی معتبر ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور ہوں۔ عقائد بھی قرآن سے ماخوذ و قیود ہونے چاہئیں اور وہ براہین و دلائل بھی جو عقائد کے لئے مبنی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اہل علم کو ان دلائل میں غور و خوض کرنے سے روکتے تھے جو قرآن کے چشمہٴ صافی سے ماخوذ نہ ہوں۔ ان کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ جب علامہ باقلانی لوگوں کو اللامِ شعری کے دلائل کے دائرہ میں محصور رکھتے ہیں تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں کو قرآنی دلائل پابند بنایا جائے اور ان سے خروج کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے سلفی علماء کے مسلک و منہاج کو ترتیب نوئی اور اسے منضبط و مرتب کیا۔ عقائدِ اسلامیہ کے فہم و ادراک میں علماء کے طور طریقوں

چار قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔
 اول۔ پہلی قسم کے لوگ فلاسفہ میں جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ قرآن طریقِ خطابی اور مقدّماتِ یقینیہ کے مطابق نازل ہوا ہے جو جمہور کے لئے یقین و اطمینان کے موجب ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اہل برہان و یقین تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معرفت عقائد کا طریق برہان و یقین ہے۔

قسم دوم۔ عقائد میں غور و خوض کرنے والوں کی دوسری جماعت متشکلین یعنی معتزلہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ معرفت عقائد کے لئے آیات قرآنیہ سے قبل عقلی دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ عقلی و نقلی دونوں طرح کے دلائل سے اکتوا و احتجاج کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عقائد و دلائل کا مرتبہ و مقام نقلی دلائل سے پہلے ہے۔ یہ قرآن کی عقلی تاویل کرتے ہیں اور بزعم خود قرآنی عقائد کے دائرہ سے باہر نہیں نکلتے۔

قسم سوم۔ تیسری قسم میں علماء کا وہ گروہ داخل ہے جو قرآنی عقائد و دلائل پر ایمان لاتے اور ان سے احتجاج کرتا ہے مگر اس بناء پر نہیں کہ وہ دلائل عقلی انسانی کے لئے مردی کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ ان میں سے مقدمات جن کے بلکہ ان پر ایمان لاتا ہے لئے ضروری ہے کہ یہ آیات اختیار میں البتہ ان کے مضمون کو عقلی استنباط کا مقدمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ امام ماتریدی بھی کہہ چکے ہیں کہ یہ قسم میں داخل ہیں۔ اس لئے کہ وہ قرآنی عقائد کو عقلی دلائل سے مبرہن و مدلل کرتے ہیں۔

قسم چہارم۔ چوتھی قسم کے علماء قرآن کے عقائد و دلائل سے استناد کرتے ہیں مگر ان کے دلائل عقلی دلائل سے بھی مدد لیتے ہیں۔ یہ لوگ اشاعری ہیں۔ درسالہ معارج الوصول ان کے فہم عقائد کی اقسام چہارگانہ بیان کرنے کے بعد ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ سلف کا مسلک و منہاج ان اقسام میں شامل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقائد اور ان کے دلائل کا ماخذ صرف نصوص شرعیہ ہیں۔ علماء سلف عقل پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اس لئے کہ عقل جاوہ مستقیم سے بھٹک سکتی ہے۔ ان کا ایمان و اعتقاد نصوص اور ان دلائل پر ہوتا ہے جن کی جانب نصوص پیشکشوں کیونکہ نصوص کی اصل و اساس وحی الہی ہے جو رسول مقبول کی جانب سے ہے۔ علماء سلف کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ عقلی و منطقی اسالیب بیان دین اسلام میں بدعت و شنیعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن سے صحابہ و تابعین آشنائے تھے۔ اگر فہم عقائد کے لئے ان کو ضروری قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پچھلے گزشتہ اکابر صحیح طور پر عقائد آشنائے تھے اور نہ عقلی طور پر ان کے دلائل سے آگاہ تھے۔

امام ابن تیمیہ اس ضمن میں فرماتے ہیں :-

”ان لوگوں کا قول ہے کہ نبی کریم اپنے اوپر نازل شدہ آیات کے معنی و مفہوم سے آشنائے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام کی بھی یہی حالت تھی۔ اس سے بڑھ کر وہ یہ بھی کہتے

ہیں کہ آپ نے صفات باری سے متعلق جو احادیث بیان فرمائیں آپ ان کا مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ گویا آپ اپنے کلام کے مفہوم سے بھی واقف نہ تھے۔ والعیاذ باللہ

۱۱۴۴۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح سلفیہ کی نگاہ میں عقل کا مقام سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ سلفی المشرب

دگوں کے نزدیک عقائد و احکام اور ہر وہ بات جو اجمالاً و تفصیلاً اعتقاداً و استدلالاً ان سے وابستہ ہو اس کی معرفت قرآن کریم سے حاصل کی جاسکتی ہے اور یا حدیث سے جو قرآن کی شارح و ترجمان ہے۔ قرآن میں جو بات مذکور ہو اور حدیث سے اس کی جو وضاحت ہوتی ہو وہ مقبول اور ناقابل تردید ہے جو شخص اسے ترک کرتا ہے وہ اسلام کا جو اپنی گردن سے اتار پھینکتا ہے۔ عقل قرآن کریم کی تفسیر و تاویل یا تشریح احکام میں حاکم قرار نہیں دی جاسکتی۔ اس کی ضرورت صرف اسی حد تک ہوتی ہے جس کی عبارت متقاضی ہو اور اخبار و آثار سے جس کی تائید ہوتی ہو۔ عقل کو جو علیہ حاصل ہے وہ صرف تصدیق و اذعان عقل و نقل کا ربط بیان کرنے اور دونوں میں اظہار تطابق و توافق کی بنا پر ہے۔ خلاصہ یہ کہ عقل شرعی دلائل کی شاہد ہو سکتی ہے مگر ان پر حاکم نہیں بن سکتی عقل سے تائید و توثیق تو ہو سکتی ہے۔ مگر شرعی احکام کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ عقل سے قرآنی دلائل کی تشریح و توضیح کا کام بھی لیا جاسکتا ہے۔

یہ ہے سلفی حضرات کا مسلک و منہاج! اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقل نقل کے پیچھے چلتی اور اس کو تائید و تقویت بخشتی ہے۔ براہ راست عقل سے استدلال نہیں کر سکتے البتہ نصوص کے معانی و مفہام میں ربط و تعلق پیدا کیا جاسکتا ہے۔

سلفی حضرات کے مخصوص مسائل یہ تھے جن کے درس و مطالعہ میں وہ مشغول رہتے تھے۔
(۱) مسئلہ توحید (۲) صفات باری تعالیٰ (۳) افعال العباد کا مسئلہ (۴) قرآن کا مخلوق یا غیر مخلوق ہونا (۵) موہم تشبیہ آیات کی تاویل و توجیہ۔

۳۔ مسئلہ توحید

سلفیہ کے منفرد مسائل | ۱۱۵۔ سلفیہ کی رائے میں مسئلہ توحید اساس اسلام ہے یہ بات سچی ہے۔ جس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں سلفیہ مسئلہ توحید کی جو تشریح و توضیح کرتے ہیں وہ جمہور اہل اسلام کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہے مگر وہ چند امور کو منافی توحید سمجھتے ہیں جو جمہور مسلمانوں کے نزدیک توحید سے متعارض و متضاد نہیں۔

سلفیہ کے وہ مخصوص مسائل یہ ہیں۔

- (۱) فوت شدگان سے توسل کرنا و حدائیت خداوندی کے منافی ہے۔
- (۲) روضہ نبوی کے روبرو ہو کر اس کی زیارت کرنا توحید کے خلاف ہے۔
- (۳) روضہ نبوی کے اردگرد دینی شعائر و احکام (مثلاً طواف) کا بجالانا توحید کے منافی ہے۔

(۴) کسی نبی یا ولی کی قبر کے اوپر خدا سے دعا مانگنا خلاف توحید ہے۔

(۵) سلف صالحین کا مذہب یہی تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے بدعات کے مرتکب اور توحید کے مخالف ہیں۔

جمہور علماء اسلام کے نزدیک توحید کی تین شاخیں ہیں۔

۱۔ وحدت ذات و صفات

۲۔ وحدت خلق و تکوین

۳۔ وحدت معبود

۳۸۔ وحدت ذات و صفات

وحدت ذات و صفات میں اختلاف | ۱۱۶۔ جمہور اہل اسلام اللہ تعالیٰ کو
واحد اور یگانہ سمجھتے ہیں جس کا کوئی نظیر و

مثیل نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:-

”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-

”توحید تنزیہہ تشبیہ اور تجسیم کے الفاظ متکلمین کی مختلف اصطلاحات کی بناء پر
مشترک المعنی ہیں۔ ہر فرقہ ان سے جو مفہوم اخذ کرتا ہے وہ دوسروں کے نزدیک
معتبر نہیں بلکہ وہ اور معنی مراد لیتے ہیں۔“

تعتزلہ کی رائے:- معتزلہ کی رائے میں توحید و تنزیہہ کا مفہوم جمیع صفات کی نفی ہے۔
تجسیم و تشبیہ سے وہ بعض صفات کا اثبات مراد لیتے ہیں جو شخص یہ کہتا ہے
کہ خدا دیکھتا یا بولتا ہے۔ وہ معتزلہ کے نزدیک تجسیم کا قائل ہے۔
متکلمین کی رائے:- متکلمین کے متعدد فرقہ جات توحید و تنزیہہ سے صفات خبریہ کی نفی
مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تجسیم و تشبیہ کا مقصد صفات خبریہ یا بعض صفات
خبریہ کا اثبات ہے۔

فلاسفہ کا نقطہ نظر:- فلاسفہ توحید سے وہی مفہوم مراد لیتے ہیں جو معتزلہ نے لیا۔ البتہ
اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ خدا کی صفات یا سلبی ہوتی ہیں یا اضافی اور یا دونوں
سے مرکب۔“ (نقص المنطق از ابن تیمیہ ص ۲۰۶)

صفات سلبیہ:- صفات سلبیہ سے مراد صفتِ قدامت و بقاء ہے کیوں کہ ان کے معنی
یہ ہیں کہ خدا کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء۔

صفات اضافیہ:- صفات اضافیہ سے ”رَبُّ الْعَالَمِينَ“ ”خَالِقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ ”ظَاہِرُ السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ“ ”مَوْلَى الْمُؤْمِنِينَ“ ”مَوْلَى الْمُؤْمِنِينَ“ ”مَوْلَى الْمُؤْمِنِينَ“ ”مَوْلَى الْمُؤْمِنِينَ“ ”مَوْلَى الْمُؤْمِنِينَ“
یہ جو ان خاص احوال پر دلالت کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہیں اور قرآن میں مذکور ہیں۔

والارض" وغیرہ مراد ہے۔

صفات مرکبہ = صفات مرکبہ وہ ہیں جو حوادث کے خلاف ہوں۔

ان معانی میں علماء کے اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے فریق کی تکفیر کی جائے اس لئے کہ یہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ نظری قسم کا ہے۔ سلفیہ پتے مخالفین کی تکفیر نہیں کرتے بلکہ ان کو اہل زلیخ قرار دیتے ہیں۔ سلفیہ کے نزدیک فلاسفہ معتزلہ اور صوفیہ جو اتحاد و فناء فی الذات کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ سب اہل زلیخ میں سے ہیں۔

سلفیہ اشاعرہ | ۱۱۷۔ جب ابن تیمیہ کے بیان کے مطابق سلفیہ کی نگاہ میں متذکرۃ الصلوٰۃ قسم کے لوگ کج رو اور جاہلہ مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں تو اب سوال یہ ہے کہ ان کے نزدیک صائب الرائے کون ہے جس کے طرز فکر و نظر میں کوئی تولیدگی اور پیچیدگی نہیں ہے؟

امام ابن تیمیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ سلف صالحین ان تمام اسماء و صفات اور اخبار و اسما کا اثبات کرتے ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں۔ **فَلَا تُدْعَىٰ لِي بِهِنَّ فِي حَقِّهِمْ** قرآن میں مذکور ہیں۔۔۔ **«اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ»**

پوری سورہ اخلاص صفات الہی پر مشتمل ہے۔ نیز فرمایا۔

«هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ» «هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ» «هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ» «هُوَ الْعَلِيمُ الْقَدِيرُ»
 «هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ» «هُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ» «ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ»
 «فَعَالٌ لِّمَآ يُرِيدُ» «هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ» «هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ»

اس ضمن میں کثرت سے آیات وارد ہیں۔

سلفیہ کے یہاں صفات یاری میں عدم تاویل | ۱۱۸۔ خلاصہ کلام کتاب سنت میں ذات یاری کے جو اوصاف و

شئون بیان ہوئے ہیں۔ سلفیہ ان سب کا اثبات کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ غضب و محبت، سخط و رضا، نداء و کلام، بادلوں کے سایہ میں اترنے اور استقرار علی العرش کو خدا کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ خدا کے ہاتھ اور چہرہ کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس

کی تاویل نہیں کرتے۔ ہاں! اتنا ضرور کہتے ہیں کہ خدا کے یہ اوصاف مخلوقات جیسے نہیں
تینتہ خدا کا ہاتھ اس کا چہرہ اس کا نزول مخلوقات کی مشابہت سے پاک ہے سلف
سالم کا بیج و مسلک ہی تھا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اس کی توضیح میں فرماتے ہیں۔

”جادۃ مستقیم وہی ہے جس پر ائمہ ہدایت گام زن تھے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی
وہی صفات ذکر کی جائیں جو کتاب و سنت میں وارد ہوئی ہیں۔ نہ کتاب و سنت
سے تجاوز کیا جائے اور نہ گذشتہ اہل علم و ایمان کی پیروی کا دامن ہاتھ سے
چھوٹنے پائے۔ کتاب و سنت سے جو معانی بھی مستفاد ہوں ان کا اتباع کیا جائے
اور شکوک و شبہات کے پیش نظر ان کو ترک نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ ان سے صرف
نظر کرنا تحریف کلمات میں داخل ہے اور ان لوگوں کا شیوہ ہے جو آیات الہی کو
سن کر ہرے اندھے بن جاتے ہیں۔ قرآن میں غور و فکر کرنے کو کسی قیمت پر نظر انداز نہ
کیا جائے ورنہ ہم بھی ان لوگوں کے زمرہ میں شامل ہونگے جن کی ندمت میں ارشاد ہوتا ہے۔
”وَلَا يَجْلِسُونَ الْكِتَابَ إِلَّا آمَانِي“ | انہیں تو صرف اپنی خواہشات سے واسطہ
ہے۔ وہ کتاب سے آشنا نہیں ہیں۔

امام ابن تیمیہ کے اس اقتباس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ سلفیہ بلا کیف خدا
کے لئے چہرہ اور ہاتھ کا اثبات کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ فوقیت نزول اور دیگر خواہر نعوص
پر ایمان لاتے ہیں اور ان کو خواہر مجازی کے طور سے نہیں بلکہ خواہر حقیقی کی حد تک تسلیم کرتے
ہیں۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اس طرز فکر کو نہ تجسیم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور نہ تعطیل سے۔
ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-

”سلف صالحین کا مذہب تعطیل و تمثیل کے بین بین ہے۔ نہ وہ صفات بارہی کو
صفات مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور نہ اس کی ذات کو ذوات مخلوقات کے مماثل
ٹھہراتے ہیں۔ خدا و تدکریم نے اپنی جو صفت بیان فرمائی یا اس کے رسول نے اس
کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کہا وہ اس کی نقی نہیں کرتے۔ کیوں کہ اس سے خدا کے
اسماء حسنیٰ اور صفات علیا کا بے کار ہونا لازم آتا ہے اسی کا نام تشریف کلمات
اور الحاد فی اسماء النہیہ سے تعطیل و تمثیل کا عقیدہ رکھنے والے دونوں گمراہوں میں

سے ہر ایک درحقیقت تعطیل و تمثیل کو بیجا کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہ اس کی تائید مزید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اترتے بھی ہیں اور وہ فوق (اوپر) تخت (نیچے) بھی آتے جاتے ہیں۔ مگر ہم اس کی کیفیت نہیں بیان کر سکتے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

”کتاب خداوندی سنت رسول صحابہ و تابعین سلف صالحین اور ائمہ متقدمین کسی سے ایک حرف بھی اس کے خلاف منقول نہیں نہ نصاً اور نہ ظاہراً۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں نہیں۔ عرش پر نہیں۔ وہ ہر جگہ ہے اور جمیع ازمینہ و امکانہ اس کے لئے مساوی ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ نہ عالم ارضی میں داخل ہے نہ خارج۔ نہ متصل ہے نہ متصل۔ نیز یہ کہ اس کی جانب انگلی سے اشارہ نہیں کیا جاسکتا۔ وغیر ذالک۔“

(المجموعۃ الکبریٰ فی مجموعۃ الرسائل الکبریٰ ص ۱۶۱۹)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصریح پر نقد و نظر | ۱۱۹ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی

تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ کتاب و سنت میں ذات باری تعالیٰ کے متعلق جو کچھ بھی مذکور ہے مثلاً فوق (اوپر) تخت (نیچے) استوی اعلیٰ العرش یا اس کا چہرہ اور ہاتھ خدا کی محبت و بغض اسے بلا تاویل جوں کا توں حرف بحرف مان لیا جائے۔ یہاں پہنچ کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سلف صالحین کا نقطہ نظر یہی تھا؟

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حنا بلہ نے پوچھی صدی، بحری میں بعینہ انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور انہیں سلف کی جانب منسوب کیا۔ علماء ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس سے خدا کی تجسیم و تشبیہ (خدا کا مخلوقات کی طرح جسم دار ہونا) لازم آتی ہے۔ وجہ لزوم یہ ہے کہ جب خدا کی جانب حسی اشارہ کیا جاسکتا ہے تو وہ ضرور تجسیم ہوگا۔ حنا بلہ کے انہی نظریات کی بناء پر مشہور حنبلی فقہ و خطیب ابن جوزی ان کی مخالفت پر مل گئے۔ انہوں نے کہا امام احمد بن حنبل یہ افکار و آراء نہیں رکھتے تھے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں :-

”میں نے اپنے اصحاب میں سے بعض کو دیکھا کہ وہ علم الاصول پر مدلل تھے۔ انہوں نے بعض ایسی کتب تصنیف کیں جن سے اپنے مسلک کو ہی بدنام کر دیا۔ ان کی سطحیت کا یہ عالم ہے کہ عوام معلوم ہوتے ہیں

وہ صفاتِ الہی کو محسوسات کے قبیل سے شمار کرتے ہیں وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی شکل و صورت کے مطابق پیدا کیا۔ وہ خدا کے لئے سپرہ منہ۔ جڑے۔ دانت۔ ہاتھ۔ انگلیاں۔ پتھلی۔ چھوٹی انگلی۔ انگوٹھا۔ سینہ۔ ران۔ دونوں پنڈلیاں۔ دونوں پاؤں وغیرہ اعضاء کا اثبات کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سر کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ وہ خدا کے اسماء و صفات کو ظاہر پر محمول کرتے اور ان کو صفات کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو بدعت ہے۔ اس کی نہ کوئی نقلی دلیل ہے اور نہ عقلی۔ وہ ایسی نصوص کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دیتے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صفات کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر ان سے ایسا مفہوم اخذ کرنا چاہئے جو ذاتِ باری کے شایانِ شان ہو۔ وہ ایسے دلائل کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے استفاد ہوتا ہے کہ صفاتِ حدوث کو معتبر نہیں سمجھنا چاہئے۔

وہ اسماءِ الہی کو صفاتِ فعل کہنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کو صفاتِ ذات بھی قرار دیتے ہیں۔ مزید براں ان کو صفات کہہ کر وہ ان کی لغوی توجیہ نہیں کرتے مثلاً "ید" سے نعمت و قدرت مراد لی جائے یا خدا کے محیی و ایتیان "آنا" سے اس کا لطف و کرم اور "ساق" (پنڈلی) سے اس کی شدت مراد لی جائے بخلاف ازیں وہ ان کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں جو صفاتِ انسانی میں سے ہے۔ اصل قاعدہ یہ ہے کہ امکانی حد تک کسی لفظ کا حقیقی مفہوم مراد لیتا چاہئے اگر کوئی دلیل صاف موجود نہ ہو تو مجازی معنی پر چلنا کیا جائے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی جانب تشبیہ کی نسبت بھی انہیں گوارا نہیں بلکہ اپنے آپ کو اہل سنت قرار دیتے ہیں حالانکہ ان کے اقوال و افکار صراحتاً مساکینہ تشبیہ کے آئینہ دار ہیں۔ عوام کا لالعام بھی ان کی پیروی کا دم بھرتے لگے ہیں نے تابع و متبوع دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔

"اے میرے رفقاء کرام! آپ اصحابِ لقل اور سلف صالحین کے اتباع میں سے ہیں۔ آپ کے امام اکبر امام احمد بن حنبل تھے جو کوڑوں کے سایہ تلے بھی یہ کہتے تھے کہ تم نہ کہتے کہ میں صرف وہی بات کہوں گا جو خدا و رسول نے کہی۔ امام احمد کے پیروں و مساکین میں افترا پر دازی کو چھوڑ دیجئے۔ احاد بیتہ نبوی کو تم ظاہر پر محمول کرتے

ہو۔ جہاں "قدم" کا ذکر آیا ہے تم اس سے پاؤں مراد لیتے ہو۔ استواء علی العرش سے جو شخص ظاہری مفہوم مراد لیتا ہے وہ خدا کو محسوس و محسوس تسلیم کرتا ہے۔ یاد رکھئے عقل کا دامن ہاتھ سے چھوٹے نہ پائے۔ ہم نے اسی سے خدا کو پہچانا اور اس کی قدامت کا اقرار کیا۔ اگر تم یہ کہو "کہ ہم احادیث نبویہ کو پڑھتے اور خاموش رہتے ہیں" تو کسی کو تم پر مجال تنقید نہ ہو۔ تمہارے رویہ کا قابل مذمت پہلو یہ ہے کہ تم احادیث کو ظاہر پر محمول کرتے ہو۔ خدا را اس سلفی المشرک شخص (امام احمد) کے مسلک میں وہ باتیں داخل نہ کیجئے جو انہوں نے نہیں کیں۔

(دفع تشبہ التشبیہ از ابن الجوزی)

ابن الجوزی نے اقوال حنابلہ کے ابطال میں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ابن جوزی نے جن اقوال کی تردید پر قلم اٹھایا ان کے قائل مشہور حنبلی فقیہ قاضی ابو یعلیٰ المتوفی ^{۳۸۰ھ} قاضی موصوف اس دور میں شدید نقد و جرح کا نشانہ بنے تھے یہاں تک کہ بعض حنابلہ کو اپنا پڑا "وَقَدْ شَاتَ ابُو یَعْلَى الحَنَابِلَةَ" ابو یعلیٰ نے حنابلہ کو اس قدر داغدار کر دیا ہے "شَيْنًا لَا یَحْسِدُهُ مَاءُ البَحَارِ" کہ سمندروں کا پانی بھی ان دھبوں کو دور نہیں کر سکتا۔ فقیہ ابن زاعونی حنبلی المتوفی ^{۵۲۷ھ} سے بھی قاضی ابو یعلیٰ کے بارے میں اسی قسم کا قول منقول ہے: بعض حنابلہ کا قول ہے:

"إِنَّ قَوْلَهُ غَرَابُ التَّشْبِیْهِ مَا یَحَارِفُهُ السَّبِیْهُ" ابو یعلیٰ کے اقوال میں تشبیہ و تجسیم کے اس قدر نواہ پائے جاتے ہیں کہ ایک دانشمند آدمی ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

اپنی وجوہات کی بناء پر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں حنابلہ نے ان رجحانات کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی وجہ سے حنبلی مسلک نظروں سے اوجھل ہو گیا جب ابن تیمیہ کا دور آیا تو آپ نے اس کی نشر و اشاعت میں بڑی جرات و جلاوت کا ثبوت دیا۔ مزید براں ان افکار کے صلہ میں ابن تیمیہ کی منظوری سے مسلک حنبلی کو چار چاند لگ گئے۔ جو روتشدد کا یہ خاں ہے کہ اس سے عقائد و آراء کو مزید تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ابن تیمیہ کے عصر و عہد میں بھی یونہی ہو گیا جب آپ جو روتشدد کی آماجگاہ بنے تو آپ کے اقوال و آثار کو بھی بڑی قبولیت حاصل ہوئی اور وہ بلاد و امصار میں ہر طرف پھیل گئے۔

۱۲۰۔ یہ اقتباسات اس امر کے آئینہ دار ہیں | لغوی اعتبار سے مجازی مفہوم کا ہوا

کہ ان نظریات کو مسلک سلف قرار دینا محفل فکر و
ناقل ہے۔ ہم ابن جوزی کا تبصرہ قبل ازین تفصیلاً نقل کر چکے ہیں۔ یہ نقد و جرح انہوں نے
اس وقت کی جب یہ عقائد ان کے زمانہ میں ہر طرف پھیل گئے۔

ہم لغوی اعتبار سے بھی ان نظریات کو جانچنا پرکھنا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم میں وارد ہے۔
”يَدُ اللّٰهِ شَوْقٌ اَيُّدِيْهِمْ“ ”كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهًا“

اب سوال یہ ہے کہ ان آیات میں ”ید“ اور ”وجہ“ سے ظاہری اعضاء مراد ہیں یا کچھ اور
امور و معانی؟ ہمارے خیال میں ”ید“ سے قوت و نعمت اور ”وجہ“ سے ذات مراد لینا درست
ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے آسمان اول پر نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کا محاسبہ قریب
آجاتا ہے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے قریب آجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت عرب ان
معانی کی تحمل ہے اور الفاظ ان معانی کو قبول کر سکتے ہیں۔

اکثر علماء کلام اور فقہاء و علماء نے ان الفاظ سے متذکرۃ الصدور معانی مراد لئے ہیں
بلاشبہ یہ معانی ان حرفی و لفظی مفہوم کی نسبت اولیٰ و افضل ہیں جن کی کیفیت سے بھی کوئی
شخص آشنا نہیں۔ مثلاً سلفیہ کا یہ کہنا کہ خدا کا ہاتھ ہے جو مخلوقات کی طرح کاہنیں اور ہم اس
کی کیفیت سے بھی واقف نہیں۔ اسی طرح ان کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ آسمان اول پر اترتا ہے
مگر ہم اس کی کیفیت نزول سے آگاہ نہیں۔ یہ طرز فکر مجہولات کا لامتناہی سلسلہ ہے جس کے
مقصد و غایت کی ہمیں کوئی خبر نہیں۔ اگر ان الفاظ سے وہ معانی مراد لئے جائیں جو لغت کے
اعتبار سے قابل قبول ہیں اور اس سے اجنبی نہیں تو ہم ایسے معانی قریبہ تک پہنچ سکتے ہیں
جن سے خدا کا عیوب و نقائص سے مبرا ہونا ثابت ہوتا ہے اور مجہولات سے بھی واسطہ نہیں
پڑتا۔

۱۲۱۔ ان نظریات کی روشنی میں ابن تیمیہ اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں۔ کہ
تاویل و تفویض | ان امور کی کیفیت کو خدا کے سپرد کرنا مبنی بر صحت و سلامت ہے۔ سلف

صالحین ہی نظر یہ رکھتے تھے۔ نظر میں ابن تیمیہ الفاظ کو لے کر ان کے ظاہری حرفی معانی پر
محول کرتے ہیں اور اس کے دوش بدوش کہتے ہیں کہ یہ صفات خداوندی حوادث کے مماثل نہیں
بعد ازاں ان کی کیفیت خدا کو تفویض کر دیتے ہیں اور ان کی تفسیر و تاویل سے گریز کرتے ہیں

ان کا قول ہے کہ ان صفات و امور کی تشریح کے درپے ہونا کج روی کی علامت ہے۔ امام ابن تیمیہ کا اہتمام قرآن کریم کی اس آیت پر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ
 مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ | جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل تلاش
 شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس طرح ان آیات کی توضیح
 بھی ہو جاتی ہے اور ان کی کیفیت کو خدا کے سپرد بھی کر دیا جاتا ہے۔ گویا یہ طرز تفسیر ایک
 پختہ دو کاج کا مصداق ہے۔

ابن تیمیہ آیات کی ظاہری تفسیر کر کے خدا کے حوادث کی مماثلت سے منترہ قرار دیتے اور
 کیف و وصف کا علم خدا کو تفویض کر دیتے ہیں۔ ان کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ صحابہ کرام ان آیات
 متشابہات کی تاویل و تفسیر سے آگاہ تھے جن میں خدا کے ہاتھ پاؤں چہرہ اور استواء و نزول
 کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ان آیات کے ظاہری معانی سے آگاہ تھے اور ان کی کیفیت و حقیقت
 جاننے کے درپے نہ ہوتے تھے جس طرح وہ ذات خداوندی کی کئی کئی پہلوؤں کے متلاشی تھے
 یہ ہے امام ابن تیمیہ کی رائے میں مسلک سلف!

مگر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس کے خلاف ہیں وہ اپنی کتاب الجامع العوام عن علم الکلام
 میں فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت میں اس قسم کے جو الفاظ مذکور ہیں ان کے ظاہری معانی
 بھی ہیں جو باری تعالیٰ کی نسبت محال ہیں اور مشہور حجازی مطالب بھی ہیں جن سے ایک
 عربی تڑا شخص تاویل کے بغیر ہی آشنا ہوتا ہے اور نہ اسے ان کی تفسیر کی ضرورت
 لاحق ہوتی ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں:-

”تقدس کا مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کے ہاتھ یا انگلی کا ذکر سنے یا آنحضرت
 کی یہ حدیث گوشت گزار کرے کہ ”اللہ نے اپنے ہاتھ سے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر گوندھا“ یا یہ کہ
 ”مومن کا دل خدا کی دو انگلیوں کے درمیان ہے“

تو اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ ایسے الفاظ کا اطلاق و قسم کے معانی پر کیا جاتا ہے۔
 (۱) اصل وضع کے اعتبار سے ہاتھ اور انگلی کا اطلاق اس عضو پر ہوتا ہے جو گوشت پوست
 ہڈی اور رگ و ریشہ سے مرکب ہو۔ گوشت ہڈی اور اعصاب کا ایک مخصوص جسم ہوتا
 ہے اور چند منفرد صفات ہوتی ہیں۔

جسم کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو طول عرض اور عمق رکھتی ہو۔ جسم کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جب تک وہ ایک جگہ میں رہتا ہو اس کو الگ کئے بغیر دوسری چیز اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔

لفظ "ید" (ہاتھ) بعض دفعہ حجازاً ایسی چیز پر بھی بولا جاتا ہے جو جسم دار نہیں ہوتی۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں "المیلدة فی ید الامیر" (دشہر امیر کے ہاتھ میں ہے) اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ امیر شہر پر قابض ہے۔ یہ فقرہ اس صورت میں بھی بولا جاسکتا ہے جب امیر مقطوع الید ہو اور سر سے سے ہاتھ ہی عائب ہو بنا بریں ہر عالم و عالمی کے لئے یہ بات جاننا ضروری ہے کہ آنحضرت کی مراد "ید" سے وہ ہاتھ ہرگز نہ تھا جو گوشت پوست اور ہڈی سے مرکب ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے حق میں یہ محال ہے اور وہ اس سے مترہ ہے۔ اگر انسان کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ ذات باری اعضاء سے مرکب ہے تو اسے بتوں کا پجاری قرار دیا جائے گا۔ اس لئے کہ جب خدا کا جسم ہوا تو جسم مخلوق ہوتا ہے اور مخلوقات کی عبادت موجب کفر ہے۔ بتوں کی پرستش کو اسی لئے موجب کفر قرار دیا گیا تھا کہ وہ مخلوق ہوتے ہیں۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ ان سے مشہور مجازی معانی مراد لیتے ہیں جو عام و خاص میں مشہور و چلے تھے۔ بلاشبہ علمائے سلف جو حقیقی و مجازی معانی کے پروردان تھے وہ ان لفاظ کو بول کر مجازی معنی مراد لیا کرتے تھے۔ ذرا سوچئے! کسی شخص کے ذہن میں یہ بات سما سکتی ہے کہ جب صحابہ کرام نے سلاح حدیبیہ کے موقع پر ببول کے درخت کے نیچے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی اور یہ آیت تھی۔

”اِنَّ الدِّیْنَ یَبِیْعُوْنَ لَكَ اِنَّمَا یَبِیْعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ“

جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں وہ خدا کی بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر خدا کا ہاتھ ہے۔

تو کسی کے ذہن میں یہ خیال گزرا ہو کہ "ید" سے مراد خدا کا ہاتھ ہے جو انسانی ہاتھ کے مماثل نہیں۔ نیز یہ کہ اس سے خدا کا غلبہ و قدرت مراد نہیں۔

بجلاوت ازیں سب صحابہ اس سے قدرتِ خداوندی اور اس کا غلبہ ہی سمجھے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں بطریق زجر یہ وعید قرآنی تھی کہ جو شخص بیعت نہیں کرتا وہ کافر ہوگا اس کا وبال اسی پر ہوگا (یہ وعید اس حقیقت کو استنکار کرتی ہے کہ یہ سے ہاتھ نہیں بلکہ قدرتِ ربانی مقصود ہے)

اپنی دلائل کی روشنی میں ہمارے نزدیک امام ماتریدی محدث ابن جوزی اور امام غزالی کا نظریہ راجح ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ صحابہ جہاں الفاظ کا حقیقی معنی مراد لیتے تھے وہاں تعددِ حقیقت کی صورت میں ان سے وہ مجازی معانی مراد لیتے جو لوگوں میں عام طور سے معروف ہوتے تھے۔

۹۔ سلفیہ اور مسئلہ خلقِ قرآن

خلقِ قرآن کے مسئلہ میں سلفیہ کا نقطہ نگاہ | ۱۲۲۔ صفاتِ باری میں جدل و بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلقِ قرآن کا مسئلہ اٹھ لکھڑا ہوا۔ سلفی المشترب لوگ۔ جو اب اور تب اپنے آپ کو اس نام سے موسوم کرتے تھے۔ اس مسئلہ کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئے۔ ان کے زاویہ نگاہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس نے بذریعہ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بھیجا۔ فارسی میں وقت قرآن کی تلاوت کرتا ہے اور جو آواز آتی ہے وہ قرآن نہیں بلکہ تلاوت قرآن ہے۔ قرآن اللہ کے کلام کو کہتے ہیں (اور قاری کی صوت کلام اللہ نہیں) قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

”وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ“ | اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیجئے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ“ (قرآن کو اپنی آوازوں سے آراستہ کیجئے)

حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو قرآن پڑھتے سنا تو ابو موسیٰ کہنے لگے ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں خوش الحانی سے قرآن پڑھتا۔“

امام ابن تیمیہ امام احمد کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”سلف صالحین کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتے ہیں عربی میں کلام کرتے ہیں قرآن بھی

خدا کا عربی کلام ہے۔ خدا کا کلام اس کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ نہ یہ مخلوق ہے اور نہ ذات سے

منفصل۔ لہذا خدا کے ناموں اور اس کی کتابوں میں جو حروف ہیں وہ مخلوق نہیں۔ اس لئے

کہ وہ خدا کا کلام ہیں۔“

امام ابن تیمیہ کے نزدیک قرآن کے غیر مخلوق ہونے اور اس کے قدیم ہونے میں کوئی تلامذہ نہیں

پایا جاتا۔ اس کے برعکس وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے مگر قدیم نہیں۔ فرماتے ہیں:

اس امر پر سلف کا اتفاق ہے کہ قرآن خدا کا نازل کردہ اور غیر مخلوق ہے۔ بعض

لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ قرآن قدیم بھی ہے۔“

ابن تیمیہ نے خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ قرآن اس صفت کلام کو نہیں کہتے جو قدیم اور قائم بالذات ہے۔ فرماتے ہیں۔

واللہ تعالیٰ انہی مشیت و قدرت کے مطابق کلام کرتے ہیں تاہم ان کا کلام قدیم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی تداء و کلام میں آواز بھی پائی جاتی ہے تو اس سے آواز کی قدامت لازم نہیں آتی۔ اگرچہ قرآن اور تورات و انجیل خدا کا کلام ہے۔ مگر علماء نے نزدیک یہ ممکنات میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سین (س) کا لفظ ادا کرنے سے پیشتر یا بعد کہ دیں۔“

(رسائل و مسائل ابن تیمیہ طبع المنارج ۳ ص ۲۱، ۲۲، ۲۵، ۲۶، ۲۷)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے یہ اقتباسات اس امر کے شاہدِ عدل ہیں کہ صفت کلام قدیم ہے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جس کلام سے اللہ تعالیٰ نے محاورات کو خطاب کیا ہے مثلاً قرآن و تورات و انجیل نہ اسے مخلوق کہا جاسکتا ہے اور نہ قدیم۔

تخصیص مطالب ۱۲۳۔ یہ ان لوگوں کے افکار و معتقدات کا بیان تھا جو سلف صالحین کے نام سے موسوم ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ سلف صالحین کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کے یہ نظریات و تفریعات و عداوت ذات سے والبتہ تھے۔ نے یہ حقیقت و اشکاف الفاظ میں بیان کر دی ہے کہ سلف کے عقائد کا اتساب سلف صالحین کی جانب کہاں تک درست ہے۔ اب ہم اپنی توجہ ان کے دیگر افکار و آراء کی طرف مبذول کریں گے اور اس کے بعد وحدت تکوین کے مسئلہ میں ان کے زاویہ نگاہ پر روشنی ڈالیں گے۔

۴۰۔ وحدتِ تکوین

جبر و اختیار کا مسئلہ اور سلفیہ | ۱۲۴۔ اس شعبہ تو کا مبنی یہ ہے کہ خداوند عالم
اس کائناتِ ارضی کا خالق ہے۔ تکوین و تخلیق میں
نہ کوئی اس کا شریک ہے نہ سہم مخلوقات میں کوئی ایسا ارادہ نہیں پایا جاسکتا جو خداوند
ارادہ کے متنافی ہو یا کسی شے کی تکوین میں اس کا شریک ہو۔ بلکہ جملہ اشیاء و افعال
خدا سے صادر ہوتے ہیں اور اسی کی جانب لوٹتے ہیں۔

وحدتِ تکوین پر بحث و جدل کے دوران پھر جبر و اختیار کا مسئلہ سامنے آتا ہے
ہم قبل ازیں اس مسئلہ میں جہمیہ معتزلہ اور ماتریدیہ کے آراء بیان کر چکے ہیں باب دیکھنا
چاہتے ہیں کہ سلفیہ کا نقطہ نظر اس ضمن میں کیا ہے جن کی ترجمانی امام ابن تیمیہ کرتے ہیں اور
آج کل کے سلفیہ بھی انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

امام ابن تیمیہ اعلانیہ اشاعرہ کی مخالفت کرتے اور انہیں جبر یہ قرار دیتے ہیں ابن تیمیہ نے
ان پر یہ گرفت کی ہے کہ وہ ذاتِ فعل اور کسب میں فرق کرتے ہیں۔ اشاعرہ کی رائے میں
فعل خدا کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور کسب کا فاعل و خالق بندہ خود ہوتا ہے۔ ابن تیمیہ اس
پر نقد و جرح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسب سے مراد اگر صرف اقتراںِ فعل ہے جو بے اثر ہوتا
ہے تو اسے مسئولیت اور استحقاقِ ثواب و عقاب کا مدار و مناط قرار نہیں دیا جاسکتا اور
اگر تاثیر و توجیہ ایجاد و احداث اور صنع و عمل پر مشتمل ہوتا ہے تو بلاشبہ یہ بندے کا
ہے اور اس کی قدرت سے صادر ہوتا ہے۔

اگر تم یہ کہو کہ کسب خاصہ خداوندی ہے تو جبر یہ بھی یہی کہتے ہیں اور اگر کہو کہ یہ بندے
سے صادر ہوتا ہے تو یہ مسلکِ اعتزال ہے۔ ابن تیمیہ معتزلہ کے نقطہ نگاہ کو بھی تنقید
کے تیروں سے پھلتی کر دیتے ہیں۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ معتزلہ کا مسلک اشاعرہ کی
نسبت اقرب الی العقل ہے۔

۱۲۵۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ | سلفی عقائد کی تفصیلات اور امام ابن تیمیہ
عقیدہ سلف کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے



ہیں۔ کہ سلف صالحین کے نزدیک تقدیر پر ایمان لانا خیر ہو یا شکر حمد و ایمان ہے۔ سلف کے نزدیک خدا کی قدرت اور اس کا ارادہ ہر چیز پر محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندے اور اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو پیدا کیا۔ بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے خدا کی قدرت اور اس کے ارادے کرتا ہے۔ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں :

” یہ حقیقت پیش نظر رہتی چاہئے کہ سلف اہمیت کا عقیدہ ان کا یہ قول ہے : ” اللہ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ” وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے کو حریص و طماع پیدا کیا ہے۔ جب تکلیف پہنچتی ہے تو قلق و ملال کا اظہار کرتے لگتا ہے اور جب خوشحال ہوتا ہے تو مغل پر اتر آتا ہے۔ ان کا قول ہے کہ بندہ فاعل حقیقی ہے وہ صاحب مشیت و قدرت اور ارادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

” وَمَا لَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ” (تم جب چاہتے ہو کہ اللہ چاہے)

ابن تیمیہ قدرت خداوندی کے عموم و شمول پر زور دیتے ہیں۔ وہ بندے کی قدرت اور اس کے احسان عذاب و عقاب کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں قدرت خداوندی ثابت بالنص اسی طرح بندے کی قدرت اور ارادہ نصوص سے بھی ثابت ہے اور اس کے احساس و اختیار سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ابن تیمیہ کے نزدیک تین باتیں عقائد سلفیہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔
 ۱۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ عالم کون و مکان میں کوئی چیز اس کے ارادہ کے بغیر ظہور میں نہیں آئی۔ اس کے ارادہ میں کوئی اس کا سہیم و شریک نہیں۔ جبر یہ بھی اسی کے قائل ہیں۔
 ۲۔ بندہ فاعل حقیقی ہے۔ چونکہ وہ کامل مشیت و ارادہ رکھتا ہے لہذا وہ بڑے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ معتزلہ کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نیکیوں کے انجام دینے میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں انہیں چاہتے اور ان خوش ہوتے ہیں۔ بخلات ازیں نہ بڑے کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور نہ ان میں سہولت پیدا کرتے ہیں۔ سلفیہ کا یہ نظریہ معتزلہ کے برعکس ہے۔

ثواب و عقاب کی وجہ جواز ۱۳۶۔ یہاں پہنچ کر یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ ابن کے نزدیک ان متعارض و متضادم حقائق میں جمع و تطبیق کی صورت کیا ہے؟ جب خالق الاحوال ذات خداوندی ہے تو نیکیوں کو ثواب اور بدکاروں

امتیاز عطا کرنے کی وجہ سے کیا ہے؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ امام ابن تیمیہ کی رائے میں بندے کے افعال بتا بر قدرت اس کی
 جنب منسوب کئے جاتے ہیں یا ان کو خدا کی جانب منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بندے کی
 قدرت اسی کی پیدا کردہ ہے اس لئے کہ وہی مسبب الاسباب حقیقی ہے۔ امام ابن تیمیہ
 فرماتے ہیں۔

”اللہ تعالیٰ اسباب کو پیدا کر کے ان کے ذریعہ سب اشیاء کو عالم وجود میں لاتے ہیں
 اللہ تعالیٰ نے بندے کو پیدا کیا اور اس میں اس قدرت کو جتم دیا جس کے بل بوتے پر
 وہ افعال کو انجام دیتا ہے۔ گویا بندہ ایسے افعال کا اصلی قائل ہے۔ بتا برین
 اہل سنت کا یہ کہنا کہ بندہ خدا کی دی ہوئی قدرت اور ارادہ سے اپنے افعال کو
 معرض ظہور میں لاتا ہے اسی طرح ہے جیسے وہ یہ کہتے ہیں کہ ذات یاری نے تمام
 حوادث و اشیاء کو ان کے اسباب کے ساتھ خلق فرمایا۔“

یہ اقتباس اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ افعال العباد کو خدا کی جانب منسوب
 کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے سبب کا خالق ہے اور افعال کا سبب بندے کی قدرت ہے
 خدا کی پیدا کردہ ہے۔ امام ہمام کا یہ نظریہ بڑی حد تک معتزلہ کے نظریات سے ہم آہنگ
 علوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ معتزلہ کو اشاعرہ کی نسبت اقرب الی الحق قرار
 دیتے ہیں۔ ابن تیمیہ اور معتزلہ میں دو باتیں وجہ امتیاز ہیں۔

اولیٰ = ابن تیمیہ کے نزدیک امر اور ارادہ کے باہم تلازم نہیں پایا جاتا۔ بخلاف ازیں
 معتزلہ ان کے باہم تلازم و ملزوم ہونے کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب تک اللہ تعالیٰ
 کسی بات کا ارادہ نہیں کرتے۔ اس کا حکم ہی نہیں دیتے۔ اور کسی بات سے منع اس وقت
 کرتے ہیں جب اس کا ارادہ نہیں کرتے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ گناہوں کا ارادہ نہیں کرتے
 اسی لئے ان کا حکم بھی نہیں دیتے۔

بخلاف ازیں ابن تیمیہ کے نزدیک امر و ارادہ میں تلازم نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ اللہ
 تعالیٰ عبادات کا ارادہ کرتے اور ان کا حکم دیتے ہیں جو گناہ بندوں سے صادر ہوتے ہیں
 اللہ تعالیٰ ان کا ارادہ نہیں کرتے مگر اس سے بندوں کو منع کر دیتے ہیں۔ گناہوں کا ارادہ
 کرنے سے مراد ان کے اسباب کا ارادہ کرنا ہے۔

دوم = امام ابن تیمیہ اور معتزلہ کے درمیان دوسری وجہ امتیاز یہ ہے کہ ابن تیمیہ رضاء و محبت اور ارادہ میں فرق کرتے ہیں۔ ارادہ بعض اوقات ایسے امور کا بھی کر لیا جاتا ہے جو اوامر و نواہی خداوندی کے خلاف ہوں۔ مگر محبت و رضا کا خدا کے اوامر و نواہی سے متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ معاصی کو نہ پسند کرتے ہیں اور نہ چاہتے ہیں مگر ان کا ارادہ کرتے ہیں۔ بعض اشاعرہ کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”جمہور اہل سنت اور بہت سے اشاعرہ محبت و رضا اور ارادہ کا فرق و امتیاز بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ معاصی کا ارادہ تو کرتے ہیں مگر نہ انہیں چاہتے ہیں اور نہ ان پر اظہارِ شوخنودی کرتے ہیں۔ بخلاف انہیں ان سے ناراض ہوتے اور منع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کی مشیت اور محبت بھی ایک چیز نہیں بلکہ ان میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ جمہور سلف کا نقطہ خیال ہے۔“

دمنہاج السنہ ج ۱ ص ۲۶۶ نیز الرسائل والمسائل ج ۵ ص ۶۷ طبع المنار

ان اقتباسات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مسک و منہج افکارِ معتزلہ و اشاعرہ کی نسبت مبنی بر اعتدال ہے۔ بحیثیت مجموعی آپ کا نقطہ نظر ماتریدیہ کے نظریات سے قریب تر ہے۔ امام ابن تیمیہ اور ماتریدیہ اس امر میں متفق الخیال ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے میں ایسی قدرت کو جنم دیا ہے جو موثر فی الاشیاء ہے۔ البتہ دونوں کے نظریات میں فرق یہ ہے کہ ابن تیمیہ کے نزدیک اشیاء میں تاثیر ان کے فعل سے پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ ماتریدی کی رائے میں یہ تاثیر اس ودیعت کردہ قوت کی بناء پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جو تاثیر فی الکسب سے تجاوز نہیں کرتی۔

تعلیل افعال | ۱۲۷۔ علماء نے یہاں تعلیل افعال کی بحث چھیڑ دی ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ آیا افعالِ خداوندی کے پس منظر میں کوئی باعث و محرک بھی ہے یا نہیں۔

۱۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو کسی علت و باعث کی بناء پر پیدا نہیں کیا کیونکہ اس سے ارادہ باری تعالیٰ کا مقید و محدود ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جمیع اشیاء کا خالق اور سب پر فائق ہے۔ اس سے یہ پوچھا نہیں جاسکتا کہ یہ کام اس نے کیوں کیا۔ البتہ دوسروں سے دریافت کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خدا کی تخلیقِ اشیاء اور اس کے اوامر و نواہی گہرے مصالِح پر

مبتنی ہیں۔ مآثر یہی اسی کے قائل ہیں۔ ابن تیمیہ اسے سلف کا قول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”مسئلہ و غیر مسلم سب اسی کے قائل ہیں۔ اصحاب ابی حنیفہ مالک شافعی، احمد اور شافعیین کا ایک گروہ بھی یہی عقیدہ رکھتا ہے۔“

اس قول کے قائلین یہ نہیں کہتے کہ حکمت و مصلحت کے تحت خدا کا ارادہ تبدیل دجاتا ہے۔ اس لئے کہ حکمت و مصلحت خدا کو مجبور نہیں کر سکتی البتہ اس نے اپنا نام خود حکیم رکھا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ اس کے افعال خالی از حکمت نہیں ہوتے اس سے خدا کے کمال خلق اور اس کے اوامر و نواہی کے مبتنی بر مصلح ہونے کا اظہار مقصود ہے کہ اس کے مجبور و مقہور ہونے کا۔

ابن تیمیہ اس نظریہ کو بنظر استحسان دیکھتے اور اسے سلف کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ ۳۔ اس ضمن میں دوسرے قول کے قائل معتزلہ ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خدا کے افعال اور اوامر و نواہی سب حسن ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اچھے کام کرتا۔ اچھی باتوں کا حکم دیتا اور قبیح سے اجتناب کرتا اور ان کا حکم نہیں دیتا۔ معتزلہ کے اس نظریہ کی اساس یہ ہے کہ ان کے یہاں اشیاء میں ذاتی حسن و قبح پایا جاتا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ خدا صرف اچھی باتوں کا حکم دیتا اور افعال ذمہ سے روکتا ہے۔

ابن تیمیہ اس نظریہ کی تردید کرتے اور اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا قول سلف صالحین کے نظریہ کی ضد ہے۔ امام ابن تیمیہ ارقام فرماتے ہیں:-

”معتزلہ خدا کے افعال کو بھی بندوں کے پیمانہ حسن و قبح سے ناپتے ہیں۔ چنانچہ جو امور بندوں پر واجب ہیں انہیں خدا پر واجب ٹھہراتے اور بندوں کے محرمات کو خدا پر بھی حرام قرار دیتے ہیں اور اپنی ناقص عقل کے باوجود اس کا نام عدل و حکمت رکھتے ہیں۔ معتزلہ نہ خدا کے لئے منسبت عامہ کا اثبات کرتے ہیں اور نہ قدرت تامہ کا۔ وہ خدا کو جملہ اشیاء پر قادر بھی نہیں مانتے۔ اور نہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔“

(مجموعۃ الرسائل والمسائل ج ۵ ص ۱۲۱)

ابن تیمیہ کی صحابہ تابعین سے عقیدت | ۱۲۸۔ یہ ہیں مسئلہ جبر و اختیار اور افعال اللہ کے محلل ہونے کے بارے میں امام ابن تیمیہ کے نظریات!

آپ اپنے افکار و آراء کو ہمیشہ صحابہ و تابعین کی جانب منسوب کیا کرتے تھے۔

۴۱- توحید فی العبادت

توحید فی العبادت | ۱۲۹- توحید فی العبادت سے مقصود یہ ہے کہ ذات واحد کی مقتضی ہے۔

امراول :- ذات واحد کے سوا کسی کی عبادت کی جائے اور نہ کسی کی الوہیت کا اعتراف کیا جائے جس نے عبادات خداوندی میں کسی شخص کو یا کسی چیز کو شریک ٹھہرایا تو وہ شرک کا مرتکب ہوا اور جس نے کسی عبادت میں خالق و مخلوق کو مساوی قرار دیا تو اس نے خدا کے سوا اور بھی معبود ٹھہرائے۔ اگرچہ وہ خدا کی وحدانیت کا معقد ہو۔ اس لئے کہ مشرکین عرب بھی خدائے واحد کو خالق السموات والارض مانتے تھے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے

«وَلَكُنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ»

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے اللہ نے۔

امردوم :- دوسری بات یہ ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح بجالاتی جائے جیسے اس نے انبیاء و رسل کو مامور فرمایا۔ صرف انہی واجبات، مستحبات اور مباحات سے کام لیا جائے جو اس نے اپنی عبادت کے لئے مشروع فرمائے۔ اس ضمن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

«دعا عبادات میں شامل ہے جو شخص مردہ یا زندہ مخلوقات سے دعا کرتا اور ان سے فریاد رسی کرتا ہے وہ مبتدع فی الدین اور مشرک ہے۔ وہ مومنوں کی راہ پر گامزن نہیں ہے۔ جو شخص کسی مخلوق کے واسطے سے خدا کو پکارتا یا اسے مخلوقات کی قسم دیتا ہے وہ ایسی بدعت کا ارتکاب کرتا ہے جس کی خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔»

(القاعدة الجلیلة از ابن تیمیہ)

مسک سلفیت کی خصوصیات | ۱۳۰- شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جو علم بردار سلفیت تھے تین امور سے منع فرمایا کرتے تھے۔

- ۱- اولیاء و صلحاء کے ذریعہ تقرب خداوندی کا حاصل کرنا ناروا ہے۔
- ۲- فوت شدگان کو وسیلہ بنانا اور ان سے فریاد رسی چاہنا حرام ہے۔

۳۔ برکت و تقدس کے حصول کے لئے انبیاء و صلحاء کی قبروں کی زیارت کرنا جائز نہیں۔

اب ہم باری باری ان پر اظہار خیال کرتے ہیں۔

صلحاء کے توسط سے | امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کے ہاتھوں کرامات کا صدور ہوتا ہے۔ بعض کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ خوارق عادات تحصیل تقرب کی حرمت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے لوگ معصوم

عن الخطاء ہوتے ہیں۔ بخلاف ازیں وہ عام انسانوں کی طرح شرعی احکام کے متکلف و مامور ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کرامت استقامت سے افضل نہیں ہو سکتی۔ بعض صلحاء خدا سے

دعا مانگا کرتے تھے کہ انہیں کرامت کی بجائے استقامت سے نوازے۔ امام ابن تیمیہ اس ضمن میں ابو علی جوزجانی کا پُر از حکمت و مصلحت قول نقل فرماتے ہیں۔

ابو علی جوزجانی کا قول ہے۔

کرامت کے بجائے استقامت کا طالب
ہن تیرا نفس پیدا نشی طور پر کرامت
کا شائق ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تجھ سے
استقامت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

مَنْ طَالِبٌ لِلاِسْتِقَامَةِ لاطالِبًا
لِلْكَرَامَةِ فَإِنَّ نَفْسَكَ مُنْجِلَةٌ
عَلَى الْكِرَامَةِ بَعْدَ وَذَلِكَ يَنْطَلِبُ
مِنْكَ الْاِسْتِقَامَةَ

(مجموعۃ الرسائل ج ۱ ص ۲)

کرامات کے صدور سے اس بات کا پورا ثبوت نہیں ہو جاتا کہ کسی نیک آدمی کو خدا کے سامنے وسیلہ بنا لیا جائے اس لئے کہ بارگاہ ایزدی میں بندوں سے توسل کرنا درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین کی بخشش طلب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

”نبی کریم اور اہل ایمان کے لئے یہ روزوں نہیں کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں وہ ان کے اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ جب ان پر واضح ہو چکا ہے کہ وہ

روزِ حقی ہیں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقارب و اعزہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”اے گروہ قریش! خدا کے عذاب سے محفوظ رہنے کا سامان کرو میں تمہیں اللہ کے

عذاب سے بچانہ سکوں گا۔

اے اولاد عبد المطلب! میں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔

اے عباس بن عبدالمطلب! میں آپ کا کچھ نہیں سنواروں گا۔
 اے میری پھوپھی صفیہ! میں آپ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔
 اے فاطمہ بنت رسول! جتنا مال چاہو لے لو مگر آخرت میں میں تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا
 سکتا۔

صحابہ کرام آپ کے عین حیات آپ کے طفیل بارش طلب کیا کرتے تھے۔ جب آپ
 نے انتقال فرمایا تو حضرت عباس کے طفیل بارش مانگی۔ جب تک آنحضرت بقید حیات رہے
 کسی شخص نے صحابی سے تو سئل کر کے بارش طلب نہ کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے دل
 سے تقرب ربانی کا حصول دین اسلام میں جائز نہیں۔ البتہ زندہ شخص سے دعائے رحمت
 کرانا جائز ہے۔

غیر اللہ سے فریادرسی چاہنا شرک ہے | ۱۳۲۔ سلفیہ کے نزدیک غیر اللہ سے فریاد
 مطلقاً ممنوع ہے۔ سلفیہ کا بیان ہے کہ اگر

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا تھا کہ آپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے فریاد
 جائے۔ سلفیہ امام طبرانی کی یہ روایت بیان کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی کتاب معجم کبیر میں ذکر کی
 روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک منافق نبی کریم کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے
 ایسے آنحضرت سے فریاد کریں۔ جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا
 «إِنَّهُ لَا يَسْتَفَاءُ بِي وَإِنَّمَا يَسْتَفَاءُ بِاللَّهِ» فریاد مجھ سے نہیں چاہی جاتی بلکہ اللہ سے طلب کی
 بات صاف ہے۔ اس لئے کہ جس سے فریاد چاہی جاتی ہے وہ تبدیلی پر قدرت رکھتا
 ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بات پر قادر ہونا اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے۔

جس طرح غیر اللہ سے فریادرسی کا مطالبہ درست نہیں اسی طرح کسی سے معرفت
 طلب نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ غیر اللہ سے یہ التجا کرتا تا روا ہے کہ مجھے بخش دے یا میری
 فریادرسی کر۔

امام ابن تیمیہ ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے۔
 مخلوقات سے فریاد طلب کرنا اسی طرح
 ہے جیسے ڈوبا ہوا شخص دوسرے ڈوبا
 ہوئے آدمی سے مدد مانگے۔

«الْمَسْتَفَاءُ مِنَ الْمَخْلُوقِ كَالْمَسْتَفَاءِ مِنَ
 الْغَرِيقِ بِالْغَرِيقِ»

ابو عبد اللہ قرشی کا قول ہے :

”مخلوق کا استغاثہ مخلوق سے یونہی ہے جیسے ایک قیدی دوسرے قیدی سے مدد طلب کرے۔“
 جس طرح زندوں کے توسط سے خدا کا تقرب حاصل نہیں کیا جاسکتا اور نہ فریاد
 طلب کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح فوت شدگان کے طفیل خدا کا تقرب حاصل کیا جاسکتا
 ورنہ ان سے مدد چاہی جاسکتی ہے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

”اگرچہ انبیاء علیہم السلام قبروں میں زندہ ہوتے ہیں تاہم ان کی موت کے بعد ہم ان
 سے کچھ طلب نہیں کر سکتے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ وہ زندوں کے لئے دعائے
 خیر کرتے ہیں تو بھی ان سے اس بات کا مطالبہ کرنا جائز نہیں۔ سلف صالحین میں
 سے کسی نے بھی ایسا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے مشرک کی راہ کھلتی اور عبادت
 من دون اللہ کا باب وا ہوتا ہے۔ البتہ جب انبیاء بعید حیات ہوں تو ان سے
 دعائے خیر طلب کرنا مفسی فی الی المشرک نہیں ہے۔“

جب صلی اللہ علیہ وسلم سے تقرب یا استغاثہ نہ زندگی میں جائز ہے اور بعد از موت اور دعاء
 زندگی میں جائز ہے بعد از موت جائز نہیں تو اس سے استفاد ہوتا ہے کہ قبور یا مسکن قبور
 کے لئے نذر ماننا حرام ہے۔ جو لوگ قبروں پر مجاور کی حیثیت سے بیٹھتے ہیں ان کا بھی یہی
 حکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اور بتوں کی نذر و نیاز میں کوئی فرق نہیں۔ خواہ یہ
 نذر بتوں کے تیل کی ہو یا کسی اور چیز کی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں :

”جس شخص کا یہ اعتقاد ہو کہ قبر سے نفع یا اجر کا حصول ممکن ہے وہ گمراہ اور
 جاہل ہے۔“

(مجموعۃ الرسائل والمسائل ج ۱ ص ۵۵)

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ قبروں کی نذر داخل معصیت ہے جس کا ایفاء ضروری نہیں۔ ابن تیمیہ
 ارشاد فرماتے ہیں :-

”جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قبروں کی منتیں قضا کے حاجات کا ذریعہ ہیں ان سے
 ازالہ تکلیفات ہوتا، رزق کے دروازے کھلتے اور شہر باموں و محفوظ رہتا ہے وہ
 مشرک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہے۔“

روضة بنوی اور قبور صلیا کی زیارت

۱۳۳۳ - ان اقتباسات کا مطالعہ کرتے ہوئے منطقی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ

دبیرک کے نقطہ خیال سے قبور صلیا کی زیارت ناز واپس ہے۔ البتہ نصیحت گیری و عبرت پذیری کے پیش نظر نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے۔

ابن تیمیہ اسی لئے فرماتے ہیں کہ ازلیہ ترک روضہ بنوی کی زیارت جائز نہیں۔ اس لئے آنحضرت نے اپنی قبر کو مسجد بنانے سے روک دیا تھا جس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ آپ کی زیارت گاہ خلافت نہ بن جائے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی مرضی و وفات میں

لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى | اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام طریقہ کے خلاف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سکونتی مکان میں دن کئے گئے تاکہ آپ کی قبر زیارت گاہ مخلوقات سے محفوظ رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے :
" بار خدایا میری قبر کو بت نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے۔ بلاشبہ وہ قوم غضب الہی کی مورد ہوگی جنہوں نے قبور انبیاء کو مسجد بٹھرا لیا۔"

صحابہ کا معمول تھا کہ آنحضرت کی وفات کے بعد جب آپ پر سلام بھیجتے اور ارادہ یہ ہوتا کہ اپنے لئے دعا کریں تو قبیلہ روم کو دعا کرتے۔ صحابہ جب عازم سفر ہوتے یا سے لوٹتے تو روضہ بنوی کی جانب متوجہ ہوتے۔

۱۳۳۴ - مسئلہ زیر نظر میں امام ابن تیمیہ کا مسلک بن تیمیہ و تبصرہ کی نگاہ میں | جہور اہل اسلام کے خلاف ہے بلکہ ان

مصنف کا یہ قول مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے حدیث بنوی لاشد الرجل کے پیش نظر محدثین کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ہمنوا ہے اور تبصرک و تبصر کے نقطہ نظر سے روضہ بنوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔ امام بہام نے اپنی کتاب فی الرد علی الاخوانی و تبصری " میں تفصیلاً اس کے دلائل ذکر کئے ہیں۔ (غلام احمد حریری مرتب)

ریات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ قبور صلحاء اور ان کی منت و زیارت
مسئلہ میں ہم کسی حد تک ابن تیمیہ کے ہمنوا ہیں مگر دو ضمنی ثبوتی کی زیارت کے مسئلہ میں ہم
ان کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔

امام ابن تیمیہ نے جس اساس پر بقصد تیرک روضہ نبوی کی زیارت کو ممنوع قرار دیا ہے
وہ صتم پرستی کا خوف ہے۔ ہمارے نزدیک یہ خوف بے محل ہے اس لئے کہ روضہ نبوی کی
زیارت مبلغ توحید (نبی کریم) کے لئے باعث تقدیس ہے۔ ظاہر ہے کہ جو امر نبوی وحدت کے
لئے تقدیس کا باعث ہوگا اس سے توحید کا اجراء ہوگا۔ کیونکہ آپ کی تمزیہ و تقدیس ان
آیات و مقاصد کی تقدیس ہے جن کے لئے آپ کی بعثت عمل میں آئی۔

میرا اس لئے کہ روضہ نبوی کی زیارت سے آنحضرت کی مساعی جمیلیہ کا نقشہ آنکھوں کے
سامنے پھر جاتا ہے جو آپ نے صنبر و جہاد اور اعلاء کلمۃ التوحید کے سلسلہ میں انجام دیں
جن کا ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ صتم پرستی کی جگہ عبادت خداوندی نے لے لی اور کائنات عالم
میں توحید کا غلبہ بلند ہوا۔

امام ابن تیمیہ خود یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ سلف صالحین کا گذر جب روضہ اقدس
پر ہوتا تو آپ پر سلام بھیجتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام نافع جو ان کی بیان کردہ روایات
کے عالم بھی تھے ذکر کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر روضہ نبوی پر سلام بھیجا کرتے تھے میں نے سو مرتبہ بلکہ
اس سے زیادہ دفعہ آپ کو قبر نبوی کی جانب آتے دیکھا تھا۔ منبر نبوی جہاں آپ جلوہ افروز
ہوا کرتے تھے عبداللہ بن عمر آپ کی نشست گاہ پر بلا تکرار کہہ دیتے اور پھر اسے اپنے چہرہ پر
مل لیا کرتے تھے۔ ائمہ اربعہ کا یہ معمول تھا کہ جب مدینہ آتے تو روضہ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوتے۔

ابن تیمیہ حرمت زیارت میں جو حدیث پیش کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے۔

”زین کس کہ صرف تین مساجد کی جانب سفر کیا جائے۔ مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ“

اس حدیث سے مسجد نبوی کی فضیلت ثابت ہوتی ہے جس کے پڑوس میں آپ مدفون ہوئے
حضرت عائشہ کے حجرہ میں مدفون ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہ حجرہ مسجد نبوی سے قریب تر تھا اگرچہ
مسجد میں داخل نہ تھا۔ اگر قبر کی زیارت سے منع کرنا مقصود ہوتا تو آپ مسجد سے دور قریع کے
قبرستان میں مدفون ہوتے۔ مقام ہیرت و استنجاب ہے کہ ابن تیمیہ یہ روایت بیان کرنے کے باوجود

کہ ائمہ اعلام قبر نبوی سے گذرتے رات سلام کہا کرتے تھے کیونکہ بقصد برکت و تمین روضہ نبوی کی زیارت سے منع کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ یہ روایت بھی ذکر کرتے ہیں کہ ائمہ کبار سفر سے آتے جاتے وقت روضہ اقدس پر حاضر ہوا کرتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ روضہ نبوی کی زیارت کے ذریعہ تبرک و تمین کا حصول ایک پسندیدہ بات ہے اس تبرک کو عبادت سے کوئی علقہ نہیں بلکہ یہ نصیحت گیری و عبرت پذیری کی ایک قسم ہے۔ ایسا کون سا کون ہو سکتا ہے جو حیات نبوی آپ کی سیرت و سوانح اور غزوات و جہاد سے آگاہ ہو۔ پھر وہ مدنیہ پہنچے اور اس کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہو کہ یہ وہی مقدس مقام ہے جہاں آپ جلتے پھرتے۔ دعائیں کرتے اور جہاد کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اس کے دل میں نہ عبرت پذیری کا جذبہ ابھرے۔ نہ آنکھوں کے مقام رفیع کا احساس پیدا ہو اور نہ آپ کے اوامر و منہیات کی تعمیل و اطاعت کے جذبات و احساسات دل میں ابھریں۔ اس شخص نے اگر ذکر خداوندی سے اعراض و انحراف کا شیوہ اختیار کر رکھا ہو تو وہ الگ بات ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ روضہ نبوی کی زیارت عبرت و مواعظت اور رشد و ہدایت کی آئینہ دار ہے۔ جب روضہ اقدس کے جوار رحمت میں دعا کی جاتی ہے تو دل ہمہ تن متوجہ عقل پسند عجز و انکسار نفس انسانی خلوص سے لبریز اور وجدان جاگ رہا ہوتا ہے۔ لہذا اس دعا سے زیادہ بابرکت دعا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

جلد سوم

جلد ہیڈنگ

۳۲ - جدید فرقے

باب اجتہاد و تبدل کرنے کے نقصانات | ۱۔ قبل ازیں ہم ان فرقہ جات پر روشنی ڈال چکے ہیں جو اموی خلافت تک منصفہ شہوت

پر آئے اگرچہ ان کی تخم کاری اموی دورِ خلافت سے قبل ہو چکی تھی، ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ ایک فرقہ کس طرح مختلف فرقوں میں تقسیم ہو جاتا اور ان میں معرکہ آرائی شروع ہو جاتی تھی۔ یہ مناقشات زیادہ تر عقائدی مسائل میں ہوا کرتے تھے اگرچہ اختلاف سطحی قسم کا ہوتا تھا اور اس کی حیثیت جو سہری و اساسی نہیں ہو کر تھی یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ حادہ مستقیم سے بھٹک گئے اور اس قدر مبالغہ آمیزی سے کام لیا کہ دائرہ اسلام ہی سے تجاوز کر گئے۔ مثلاً فرقہ سببہ کے لوگ جو اہمیت علی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اسی طرح حاکمیت کا اعتقاد تھا کہ ذات باری خلیفہ حاکم بامر اللہ فاطمی میں حلول کر آئی ہے اور اس قسم کے دیگر فرقے جن میں سے کچھ لوگ ابھی تک افریقہ، بھارت اور پاکستان میں موجود ہیں فقہ اسلامی میں معاشرہ میں رونما ہونے والے تمام امراض کا علاج مہتمم تھا مگر یہ قسمتی یہ بنوئی کہ منصفہ ہمت کے باعث اجتہاد کا دروازہ مسدود کر دیا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ علماء کسی قیمت پر متقدمین کی مخالفت نہیں کرتے تھے اور ان کے آراء و افکار کو تقدیس و طہارت کا درجہ دیتے تھے جب تک یہ مسائل ہیں اجتہاد کا دروازہ مقفل ہو چکا تھا تو عقائدی مسائل میں بالادستی سے تبدل ہو جانا چاہئے تھا۔ اہل سنت کے اکثر علمائے امام اشعری کے اقوال کو بڑھتے بڑھاتے رہتے تھے اور ان سے ایک قدم آگے بڑھنا انہیں گوارا نہ تھا۔ اکثر علماء تاثر بیدی کے اقوال کو فراموش کر چکے تھے۔ علامہ باقلانی نے مسلک اشعری کے اصول و ضوابط وضع کر دیئے تھے۔ باقلانی امام اشعری کی رائے اور ان کے دلائل و براہین پر عمل پیرا ہونے کو واجب خیال کرتے تھے مبادا عقل انسانی کسی ناپسندیدہ بات کا شکار ہو۔

انہی وجوہات کی بناء پر آٹھویں صدی ہجری سے لیکر بارہویں صدی تک کوئی جدید فرقہ رونما نہ ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات قدیم فرقوں کے اقوال و آراء سے اسناد کرتے

اور افکار اشعری کو ترک کرنے کی تحریک پیدا ہوتی جیسا کہ شیخ اسلام ابن تیمیہ اور ان کے
تلمیذ رشید کے عہد میں ہوئے اور جس طرح بعض علماء و محدثین نے رائے کو اشاعرہ پر ترجیح دیتے
یا ماتریدی کی رائے پر عمل کر کے اشعری کی رائے کو ترک کر دیتے۔ خلاصہ کلام فکری زندگی
پر جمود طاری تھا جس کا اثر یہ برآمد ہوا کہ فتاویٰ میں کسی خاص انام کی تقلید کی جائے
لگی اور اعتقادی مذاہب میں استدلال کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا اور ان میں تقلید سے
کام لیا جانے لگا۔

۴۔ نویں صدی ہجری سے لیکر تیرھویں صدی کے اکثر
تقلید ائمہ سے ظہور کفر و شرک

حصہ تک زندگی بسر کرنے والے اگرچہ ذہنی جمود میں
مبتلا تھے۔ تاہم یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اسلامی فکر و نظر ایک خاص رائے اور چند دلائل
کی چار دیواری میں گھر کر رہ جاتے جن کو افضل البراہین سمجھ لیا گیا تھا۔
دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مسلمانوں اور اہل یورپ کے مابین جس کشمکش کا آغاز ہوا تھا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی۔ تمکون کے یورپین اقوام سے بڑے
گہرے روابط تھے اور وہ ان کے مالی معاملات سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ بعض ترک
علماء قرصہ میں جیل ہوئی کہ کے سود کی وجہ سے تلاش کرنے لگے۔ اگرچہ آستانہ کے علماء نے
یہ فتویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے باقی اقوال کو بھی رد کر دیا تھا۔
تاریخ اسلام کے دور میں فکری جمود کا دور دورہ تھا ان کا طرہ امتیاز یہ تھا
کہ ائمہ مجتہدین کے اقوال کو تقلید کا مرتبہ دے دیا گیا۔ جس کا اثر یہ برآمد ہوا کہ صلحاء و علماء
کو حین حیات اور بعد از موت مقدس سمجھا جانے لگا۔ ان کی قبروں کی زیارت کی جاتی اور
ان کے گرد خانہ کعبہ کی طرح طواف کیا جاتا۔

اس کا رد عمل یہ ہوا کہ ایک گروہ بڑی سختی سے ان کے خلاف معرکہ آراء ہوا اور اس
ضمن میں اقوال ابن تیمیہ کی پیروی کو اپنا شعار بنایا۔ ابن تیمیہ کے افکار و عقائد عرصہ دراز
سے مٹ چکے تھے۔ ان لوگوں نے انہیں حیاتِ نو بخشی اور از سر نو ان کی توسیع و اشاعت
کا اہتمام کیا۔

۴۳- وہابیہ

۳- جب اشخاص ورجال کو تقدس و طہارت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ان کی زیارت کو تقرب خداوندی کا موجب تصور کیا گیا تو اس افراط و غلو کے رد عمل کے طور پر صحرائے عرب میں مسلک وہابیت نے سر نکالا۔

اس زمانہ میں ہر طرف بدعات کا دور دورہ تھا جو اسلام سے یکسر بے تعلق تھیں۔ یہ بدعتیں دینی تقریبات اور دنیوی اعمال پر چھائی ہوئی تھیں۔

وہابی تحریک اٹھی اور ان بدعات کے خلاف نبرد آزما ہو گئی۔ اتباع محمد بن عبد الوہاب نے مسلک ابن تیمیہ کو از سر نو زندگی بخشی۔ اس تحریک کے بانی و سرسٹس محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی وفات ۷۶۸ھ میں ہوئی۔ محمد بن عبد الوہاب تصانیف ابن تیمیہ سے مستفید ہو چکے تھے انہوں نے بنظر غائر ان کتب کا مطالعہ کیا اور ان کو فکر و نظر کی حدود سے نکال کر عمل کے دائرہ میں داخل کیا۔ جہاں تک عقائد کا تعلق ہے انہوں نے عقائد ابن تیمیہ پر ذرا بھرا اضافہ نہ کیا اور ان کو جوں کا توں اپنا لیا۔ البتہ انہوں نے امام ابن تیمیہ کی نسبت زیادہ تشدد سے کام لیا اور ایسے عملی امور کو ترتیب دیا جن سے ابن تیمیہ نے تعارض نہیں کیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امور ان کے عصر و عہد میں مشہور نہ تھے۔ ہم ذیل میں ان کے نظریات بیان کرتے ہیں۔

افکار وہابیہ :-

۱- تمباکو نوشی کی حرمت۔ وہابیہ کی رائے میں عبادت کا مقصد صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں چند ارکان ادا کئے جائیں۔ جیسا کہ ابن تیمیہ کا خیال ہے بخلاف ازیں اسلامی اخلاق و عادات کا اپنانا بھی ایک مسلمان کے لئے از بس ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمباکو نوشی کو حرام تصور کرتے اور اس میں تشدد سے کام لیتے تھے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر عام وہابیہ تمباکو نوش اور مشرک میں کوئی فرق نہیں سمجھتے گویا وہ ان خوارج کی طرح تھے جو مرتکب کبائر کی تکفیر کرتے تھے۔

۲- قہوہ کی حرمت :- آغاز کار میں وہابیہ قہوہ اور اس قسم کی دیگر اشیاء کو حرام سمجھتے تھے

پھر اس میں تساہل برتنے لگے۔

۳۔ بزور شمشیر امر بالمعروف :- یہ لوگ صرف تبلیغ و دعوت پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ تلوار لیکر مخالفین کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے مان کا تصور یہ تھا کہ وہ بدعات کے مقابلہ میں برد آزا ہیں جن کے خلاف جنگ آزمانی ایک دینی فریضہ ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب قرار دیتے تھے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرتے تھے :-

لَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ

تم بہترین جماعت ہو جسے لوگوں کے لئے
بروئے کار لایا گیا ہے کہ تم نیکی کا حکم
دو اور برائی سے روکو۔

سعودی عرب پر جو خاندان ان دنوں حکومت کر رہا ہے اس کے مورث اعلیٰ محمد بن سعود ان دنوں میدان حربہ قتال میں ولایت کی قیادت کر رہے تھے۔ محمد بن سعود شیخ محمد بن عبدالوہاب کے داماد اور ان کے مسلک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ محمد بن سعود نے بڑی جدت سے کام لیا اور بزور شمشیر ولایت کی دعوت دینے لگے۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ یہ سب کچھ وہ بدعات کو مٹانے اور سنت کو زندہ کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ عثمانی ترکوں کی مخالفت بھی اس دینی تحریک میں شدت و حدت کے جذبات پیدا کرنے کی موجب ہوئی۔ بہر کیف اولیاء بیہ نے قوت و شوکت کے بل بوتے پر دعوت و ارشاد کا سلسلہ بہاری رکھا۔ عثمانی ترکوں کے لئے میدان جنگ میں اترتے مگر ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ آخر کار محمد علی پاشا والی مصر اتباع شیخ کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آیا اور کئی معرکوں میں ان کو شکستیں دیں۔ جس سے ان کا زور ٹوٹ گیا اور یہ تحریک چند عربی قبائل میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اب علاقہ نجد کا شہر ریاض اعداس کا قرب و جوار اس تحریک کا مرکز قرار پایا اس کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ جب قوت و شوکت سے بہرہ ور ہوتی تو تشدد پر اتر آتی اور اگر حریف مقابل زور آور ہوتا تو سبک کر رہ جاتی۔

۴۔ قبہ ششکئی :- شہر سو یاد بہات جہاں ان لوگوں کا بس جلتا وہاں پہنچتے اور قبتے گرا دیتے۔ اس کی حد یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ مہنفین ان کو معبد شکن کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لقب مہالہ پر محمول ہے۔ اس لئے کہ قبہ جات کو معبد کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ غالباً یہ لوگ ان مساجد کو مساجد کہہ دیتے تھے جن میں قبہ ہوا کرتے تھے۔ ان کا یہ

عمل اس حدیث نبوی کی تعمیل میں تھا جس میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ
نبی اسرائیل پر نعمت کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔

۵۔ مقبرہ شکنی = وہابیہ کے تشدد کی یہ آخری سہرہ نہ تھی بلکہ اس سے ایک قدم آگے
بڑھ کر انہوں نے مقبروں کو مسمار کر دیا۔ جب دیارِ عرب میں وہ برسرِ اقتدار ہوئے تو صحابہ
مقبرے گرا کر ان کو زمین کے برابر کر دیا۔ اس صرف اشارات باقی رہ گئے جن کی مدد سے
چلتا ہے کہ یہ فلاں صحابی کی قبر ہے۔ قبروں کو زمین سے ہموار کرنے کے بعد انہوں نے اس
پابندی کے ساتھ ان کی زیارت کی اجازت دے دی کہ زائر صرف السلام علیکم کہے اور بس۔

۶۔ تصویر کشی کی محکومت = وہ چھوٹے چھوٹے امور کو بڑی اہمیت دیتے اور ان
کو صنم پرستی قرار دیتے تھے۔ حالانکہ ان میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ مثلاً فوٹو وغیرہ
ان کے علماء کی تحریرات اور فتاویٰ میں یہ باتیں ملتی ہیں۔ تاہم ان کے امراء ایسی باتوں
کو قابل التفات نہیں سمجھتے تھے اور ان کو نظر انداز کر دیتے تھے۔

۷۔ غلاف بدعت ہے = اتباعِ شیخ نے بدعت کے مفہوم میں بڑی حیرت انگیز
وسعت پیدا کر دی تھی۔ اس کی حد یہ ہے کہ روضہ نبوی پر پردہ لٹکانے کو بھی وہ بدعت
قرار دیتے تھے۔ اس کے پیش نظر وہ روضہ اطہر پر غلاف نہیں ڈالا کرتے تھے۔ اس
نتیجہ یہ ہوا کہ پرانا غلاف مروجہ زمان سے چلتا نظر آتا رہ گیا جس سے دیکھنے والے کو کلیف
ہوتی اور وہ نور نبوت کی شعاعوں سے قلبی تسکین حاصل کرتا یا اس کے دل میں بدعت
کو روک لیتا کہ یہ وہی مقدس مقام ہے جہاں آنحضرت پر وحی نازل ہوئی تھی۔

وہابیہ میں سے بعض لوگ "سیدنا محمد" کے الفاظ کو بدعت قرار دیتے اور اس میں غلاف
سے کام لیتے تھے۔ ان کی شدت و حدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ ان کو نفرت کی نگاہ
سے دیکھنے لگے۔

حی بات یہ ہے کہ اتباعِ شیخ محمد نے آراء امام ابن تیمیہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور
اور بڑی جرأت سے ان کو منظر عام پر لائے۔ سلفیہ کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے جن
افکار ابن تیمیہ پر روشنی ڈالی ہے وہ لوگ ان باتوں کو جانتے اور مانتے تھے البتہ
بدعت کے معنی و مفہوم میں وسعت پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ان امور کو بھی بدعت کے
نام سے موسوم کرتے جن کا عبادات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ حالانکہ عندا تحقیق بدعت

اس فعل کا نام ہے جسے عبادت سمجھ کر انجام دیا جائے اور اس سے تقرب ربانی کا
 اصول مقصود ہو مگر کسی نص میں اس کا ذکر نہ ملتا ہو۔ روضہ نبوی پر جو غلاف ڈالا جاتا
 ہے اسے کوئی شخص بھی عبادت تصور نہیں کرتا بلکہ یہ تزیین و آرائش کی ایک کوشش ہے
 کہ روضہ اطہر دیکھنے میں بھلا معلوم ہو جس طرح مسجد نبوی کو آراستہ کیا جاتا ہے۔
 مقام تعجب ہے کہ اتباع شیخ غلاف کو ناروا قرار دیتے اور مسجد نبوی کی زیب و زینت
 و جائز سمجھتے تھے حالانکہ دو مماثل اشیاء کا شرعی حکم مساوی ہونا چاہئے۔

اس فرقہ کے علماء اپنے آراء و افکار کو مبنی بر صحت و صواب و دور از خطاء تصور
 کرتے ہیں بخلاف ازیں دوسروں کے افکار ان کی نگاہ میں مجموعہ اغلاط اور ناقابل صحت
 ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ قبۃ سازی اور ان کے ارد گرد طواف کرنا صدمہ پرستی
 کے مترادف ہے۔ ان کے یہ نظریات افکار و خواج سے ہم آہنگ ہیں جو اپنے مخالفین کی
 کھیر کرتے اور ان سے تبرہ آذنا ہوتے تھے۔ جن دنوں وہاں یہ صحراء نشین تھے۔ ان کی
 تبلیغ و دعوت سے چنداں خطر نہ تھا۔ جب سعودی خاندان بلاد عرب میں برسر اقتدار ہوا
 تو ان کو دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے جس سے خطرہ برپا ہوا۔

یہی وجہ تھی جس کی بناء پر سلطان عبدالعزیز آل سعود مرحوم نے یہ کوشش کی کہ وہاں کے
 آراء کو دوسروں پر نہ ٹھونساجائے اور صرف انہی تک محدود رکھا جائے اس ضمن میں انہوں نے
 بڑی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ انہوں نے روضہ اطہر کے لئے نیا غلاف تیار کرایا
 تھا مگر اسے روضہ نبوی پر چڑھانہ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ مسجد نبوی کی توسیع و تجدید کے بعد
 یہ خدمت انجام دیں گے مگر اس سے قبل ہی موت نے ان کو آیا۔ امید و اتق ہے کہ ان کے جانشین
 ان کے ارادہ کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

طرح پاکستان میں جن لوگوں نے غلاف کعبہ کا جلاس دیکھا اور اس پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالی ہے وہ اس امر کے
 شاہد عدل ہیں کہ مصنف کا یہ بیان درست نہیں۔ غلاف کعبہ کا طواف کیا گیا اس کے ٹکڑوں کو حوزہ جان بنا کر رکھا
 گیا اس پر دوپٹے پھینک کر مچے کے اور ستورات نے اپنی بے پردگی کا بھی خیال نہ رکھا غلاف کعبہ کے جلیسوں میں یہ
 اثر و بام احساس عبادت کا آئینہ دار ہے مصنف اتباع شیخ کو غالی اور متشدد کہتے ہیں خود غلو کا شکار ہو گئے اتباع
 شیخ نے جو تشدد بھی روا رکھا وہ شرک و بدعت کے استیصال کیلئے تھا۔ ظاہر ہے کہ شرک و بدعت کی مخالفت
 میں یہ تشدد کسی طرح مذہب نہیں۔ اتباع شیخ اور ان کے عقائد معلوم کرنے کے لئے مولانا سعود عالم ندوی مرحوم کی
 کتاب ایک بدنام مصنف قابل مطالعہ اور بلند پایہ تحقیق کا شاہکار ہے۔ (غلام احمد حریری، صفحہ ۶۷)
 لے آئندہ نوز میں فرقہ ہی کیا ہے؟ (غلام احمد حریری)

۳۲ - بہائی فرقہ

بہائی فرقہ کو کونسا عالم و پور میں آیا | ۳۳ - بہائی فرقہ نے شیعہ اثنا عشریہ سے جنم لیا

اس کتاب میں بہائی فرقہ کا ذکر کرنے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ اسلامی فرقہ ہے چونکہ یہ فرقہ مسلمانوں میں پروان چڑھا اور اس کا بانی و مؤسس بھی ایک اسلامی فرقہ کی جانب منسوب تھا لہذا ہم نے اس کے ذکر و بیان کو ضروری تصور کیا یہ حقیقت ہے کہ بہائی فرقہ ان اصول و مبادی کو تسلیم نہیں کرتا جن پر مسلمانوں کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور جن کی حیثیت اسلام میں اساسی و بنیادی ہے۔

بہائی فرقہ کا بانی مرزا علی محمد شیرازی ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء ایران میں پیدا ہوا۔ یہ اثنا عشری شیعہ سے تعلق رکھتا تھا مگر اثنا عشریوں کی حدود سے تجاوز کر گیا۔ اس نے اسماعیلی فرقہ کے عقائد باطلہ اور فرقہ سبہ کے عقیدہ حلول کا ایک ایسا مجموعہ مرکب تیار کیا جسے اسلامی عقائد سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ امام مستور کا عقیدہ اثنا عشری شیعہ کے اساسی عقائد میں سے ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق بارہواں امام مسیح من دای کے شہر میں غائب ہو گیا تھا اور ابھی تک وہ اس کے منتظر ہیں مرزا علی محمد بھی دیگر اثنا عشریہ کی طرح یہی عقیدہ رکھتا تھا۔ اکثر اہل فارس جن میں یہ نوجوان (مرزا علی محمد) پروان چڑھا اسی نظر یہ کے حامل تھے اس نے اثنا عشری فرقہ کی حمایت میں بڑی غیرت کا ثبوت دیا جس کے نتیجہ میں یہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا جن نفسیات سے اسے گہرا لگاؤ تھا یہ فلسفیانہ نظریات کے درس و مطالعہ میں بھی لگا رہتا تھا لوگوں کی جوصلہ افزائی کے صلہ میں مرزا علی محمد نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ امام مستور کے علوم و فنون کا واحد عالم ہے بدلے اور اس کی طرف رخ کئے بغیر وہ علوم حاصل نہیں کئے جاسکتے اس لئے کہ شیعہ فرقہ کے قول کے مطابق دیگر امامہ اثنا عشریہ کی طرح امام مستور امامہ سابقین کی وصیت کی بناء پر قابل اتباع علوم کا جامع اور مصدر ہدایت و معرفت ہوتا ہے۔

اس مفروضہ کی بناء پر کہ مرزا علی محمد امامہ سابقین کے علوم کا حامل ہے اسے حجت سمجھا

مانے لگا اور بلا چون و چرا اس کی اطاعت کی جانے لگی۔ ایک کاظم امام کی حیثیت حاصل
 جانے پر مرزا علی محمد ایک متبوع عام قرار پائے اور بلا استثناء ان کے جملہ اقوال کو
 ولایت عامہ حاصل ہوئی۔

کچھ عرصہ گزرنے پر مرزا علی محمد غلو سے کام لینے لگا اور اس نظر یہ کو مطلقاً نظر انداز
 دیا کہ وہ امام مستور کے علوم کا ناقص ہے۔ اس نے مستقل جہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا
 ان کا ظہور و خوبت امام کے ایک ہزار سال بعد ہونے والا تھا۔ امام غائب ۱۲۶۰ھ میں
 طروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ مرزا نے اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی داغ دیا کہ ذات
 خداوندی اس میں حلول کرائی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے توسط سے مخلوقات کے
 سامنے جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آخری زمانہ میں موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام
 ظہور اس کے ذریعہ ہوگا۔ اس نے نزول عیسیٰ کے عام عقیدہ سے بچاؤ کر کے اس پر رجوع
 عیسیٰ کا اصرار کیا اور کہنے لگا کہ ان دونوں انبیاء کا ظہور اس کے توسط سے ہوگا۔

مرزا علی محمد کی شخصیت میں اتنی جاذبیت پائی جاتی تھی کہ لوگ اس کے بلند بانگ دعوای کو
 چون و چرا مان لیتے تھے۔ مگر علماء نے انا میہ ہوں یا غیر انا میہ یک زبان ہو کر اس کے خلاف
 از بلند کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے مزعومات و دعویٰ قرآن کے پیش کردہ حقائق
 عقائد کے سراسر متنافی تھے۔ مرزا نے علماء کی مخالفت کی پرواہ نہ کی بلکہ انہیں متناقض
 لہجی اور مطلق پسند کہہ کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتے لگا۔ یابں ہمہ لوگ اس کی باتوں کو
 سنتے اور بلا حجت و برہان اس کی پیروی کا دم بھرتے رہے۔

بانی پہا بیت کے عقائد و اعمال | ۵۔ ان دعویٰ باطلہ کے بعد مرزا علی محمد چند
 عقائد و اعمال کا اعلان کرنے لگا۔ ہم ذیل میں

وہ امور ذکر کرتے ہیں۔ اعتقادی امور یہ تھے۔

۱۔ مرزا علی محمد روز آخرت اور بعد از حساب و ثواب جہنم پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔
 اس کا دعویٰ تھا کہ بعد آخرت سے ایک جدید روحانی زندگی کی جانب اشارہ کرنا
 مقصود ہے۔

۲۔ وہ بالفعل ذات خداوندی کے اس میں حلول کہتا ہے اعتقاد رکھتا تھا۔
 ۳۔ رسالت محمدی اس کے نزدیک آخری رسالت نہ تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ذات باری

مجھ میں حال ہے اور میرے بعد آنے والوں میں بھی حلول کرتی رہے گی۔ گویا حلول الوہیت کو وہ اپنے لئے مخصوص نہیں ٹھہراتا تھا۔

۴۔ وہ کچھ مرکب حروف ذکر کر کے ہر حرف کے عدد نکالتا اور اعداد کے مجموعہ سے عجیب و غریب نتائج اخذ کرتا تھا۔ وہ ہندسوں کی تاثیر کا قائل تھا۔ انیس کا ہندسہ اس کے نزدیک خصوصی مرتبہ کا حامل تھا۔

۵۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام انبیاء سابقین کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ مجموعہ رسالات ہے اور اس اقتیاد سے مجموعہ ادیان بھی۔

نبا بریں بہائی فرقہ یہودیت نصرانیت اور اسلام کا مجموعہ مرکب ہے اور ان میں کوئی حدِ قائل نہیں پائی جاتی۔
مرزا نے اسلامی احکام میں تبدیلی پیدا کر کے عجیب و غریب قسم کے عملی امور مرتب کئے تھے۔ وہ عملی امور حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عورت میراث اور دیگر امور میں مرد کے برابر ہے۔ یہ آیت قرآنی کا صریح انکار ہے جو موجب کفر ہے۔

۲۔ وہ بنی نوع انسان کی مساواتِ مطلقہ کا قائل تھا۔ اس کی نگاہ میں جنس و نسل وین و مذہب اور جسمانی رنگت موجب امتیاز نہیں ہے۔ یہ بات اسلامی حقائق سے میل کھاتی ہے اور ان کے متناقض نہیں۔

۳۔ یہ افکار و آراء مرزا نے اپنی تحریر کردہ تصانیف علی محمد باب کے اتباع و تلامذہ میں جمع کر دیئے تھے۔ جس کا نام البیان ہے۔ بحیثیت

مجموعی ان کے جملہ افکار عقائد اسلام سے اعراض و انحراف بلکہ انکار پر مبنی تھے۔ اس نے حلول کے نظریہ کو از سر نو زندہ کیا۔ عیسیٰ عبد اللہ بن سبائے حضرت علیؑ کے لئے ٹھہرا تھا اور جو صریح کفر ہے۔ اسے نہی و جوہات کے پیش نظر حکومت اس کے خلاف ہو گئی اور مرزا علی محمد اور اس کے اتباع کو ادھر ادھر بھیجا دیا۔ مرزا ۱۵۷۵ء میں صرف تین سال کی عمر میں رہا ہی ملک عدم ہوا۔
مرزا علی محمد نے اپنی نیابت کے لئے اپنے دو مریدان باصفا کو منتخب کیا تھا ایک صبح ازل

نامی اور دوسرا بہاء اللہ۔ ان دونوں کو قدس سے نکال دیا گیا تھا۔ صبح ازل قبر میں سکونت پذیر ہوا اور بہاء اللہ نے اقدتہ کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ صبح ازل کے پیرو بہت کم تھے۔ اس کے

مقابلہ میں بہاء اللہ کا حلقہ ارادت خاصا وسیع تھا۔ بعد ازاں اس مذہب کو بہاء اللہ کی طرف منسوب کر کے بہائی کہنے لگے اس فرقہ کو بانی و موجد مسیح کی جانب منسوب کر کے بانی بھی کہا جاتا ہے۔ مرزا علی محمد نے اپنے لئے "باب" کا لقب تجویز کیا تھا۔

صبح ازل اور بہاء اللہ میں نقطہ اختلاف یہ تھا کہ اول الذکر بانی و بہائی مذہب کو اسی طرح چھوڑ دینا چاہتا تھا جیسے اس کے بانی نے اسے منظم کیا تھا۔ اس کا کام صرف تبلیغ و اشاعت تھا۔ بخلاف ان میں بہاء اللہ نے مرزا کی طرح بہت سی اختراعات کیں۔ وہ بھی مرزا کی طرح حلول کا قائل تھا اور اپنے آپ کو مظہر الوہیت قرار دیتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مرزا علی محمد نے میرے متعلق بشارت دی تھی۔ مرزا کا وجود میرے لئے ہمید کا حکم رکھتا تھا جس طرح نصاریٰ کی نظر میں حضرت یحییٰ علیہ السلام ظہور مسیح کا پیش خیمہ تھے۔

مشہور مستشرق گولڈ میئر اپنی کتاب "العقیدۃ والشریعہ" میں لکھتے ہیں بہاء اللہ کی شخصیت میں روح الہی کا ظہور ہوا تا کہ اس عظیم کام کی تکمیل کی جائے جسے بہائیت کا بانی تشنہ تکمیل چھوڑ گیا تھا۔ تاہم یہیں بہاء اللہ کا منصب و مقام باب کی نسبت رفیع تر ہے اس لئے کہ باب بہاء اللہ کی ذات سے قائم ہے اور بہاء اللہ اس کو قائم رکھنے والا ہے بہاء اللہ اپنے آپ کو ذات الہی کا مظہر قرار دیتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ وہ ذات باری کے حسن و جمال کا جلوہ گاہ ہے اور اس کے محاسن شیشہ کی طرح ذات بہاء اللہ میں ضوئیں ہیں۔ بہاء اللہ کی شخصیت بنات خودہ جمال اللہ ہے جو ارض و سماوات میں یوں تاباں و درخشاں ہے جیسے عمدہ قسم کے پتھر کو بالمش کیا جائے تو وہ تابانی کے جوہر دکھاتا ہے۔ بہاء اللہ وہ عظیم شخصیت ہے جس کا ظہور اس جوہر (مرزا علی محمد) سے ہوا۔ اس جوہر کی معرفت بہاء اللہ کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ بہاء اللہ کے پیروں سے فوق البشر تصور کرتے اور اسے اکثر صفات الہی کا مجموعہ قرار دیتے تھے۔

(العقیدۃ والشریعہ ص ۲۲۲ ترجمہ محمد یوسف عبد العزیز عبدالرحمن بن عبدالقادر)

بہاء اللہ کے افکار و عقائد | جس طرح عوام کا لالچام شخص پرستی کے حادی ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہاء اللہ کے پیرو بھی اسی جرم کے مرتکب تھے۔ بعد ازاں بہاء اللہ اور صبح ازل کے اختلافات کی تبلیغ وسیع وسیع تر ہوتی چلی

گئی۔ یہ دونوں قریب قریب رہتے تھے۔ ایک آدرنہ میں قیام پذیر تھا اور دوسرا قبرستان
 میں۔ چنانچہ دولت ترکہ نے بہاء اللہ کو عسکائی طرف ملک بدر کر دیا جہاں اس نے اپنے
 مشرکانہ عقائد کو مدون کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے قرآن کریم کے خلاف بہت کچھ
 لکھا اور اپنے استاد کی مرتب کردہ کتاب البیان کی تردید پر قلم اٹھایا۔ بہاء اللہ نے
 عربی و فارسی دونوں زبانوں کو تعبیر و بیان کا ذریعہ بنایا۔ اس کی مشہور ترین تصنیف
 الاقدس ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ وہ وحی الہی پر مبنی اور ذات خداوندی
 کی طرح قدیم ہے۔ وہ اعلانیہ کہا کرتا تھا کہ اس کی تصنیفات جملہ علوم کی جامع ہیں
 بلکہ اس نے بہت سے علوم کو اپنے برگزیدہ اصحاب کے لئے الگ محفوظ کر رکھا ہے
 اس لئے کہ دوسرے لوگ ان باطنی علوم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

بہاء اللہ کا دعویٰ تھا کہ جس مذہب کی وہ دعوت دے رہا ہے وہ اسلام ہے
 الگ ایک جداگانہ مسلک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات بہاء اللہ اور اس کے استاد
 میں مابہ الامتیاز ہے۔ اس کے استاد مرزا علی محمد کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے افکار سے
 اسلام کی تجدید و احیاء کر رہا ہے اور وہ اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہے
 بزعم خود اسلام کو ایک جدید مذہب قرار دیتا تھا اور اس کی اصلاح کا مدعی تھا۔
 بخلاف انہیں بہاء اللہ اپنے مذہب کو دین اسلام سے ایک الگ مذہب تصور کر
 تھا۔ یہ کہہ کر اس نے دین اسلام پر بڑا احسان کیا اور اسے اپنے مزخومات یاطلہ
 آلودگی سے پاک رکھا۔ بہاء اللہ اپنے مذہب کو بین الاقوامی حیثیت دیتا اور اس بانہ
 کا دعویٰ دار تھا کہ یہ مذہب جمیع ادیان و مذاہب کا جامع اور سب اقوام کے
 یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ وہ وطن پرستی کے خلاف تھا اور کہا کرتا تھا کہ زمین
 سب کی ہے اور وطن سب کا ہے۔

چونکہ بہاء اللہ اپنے مذہب کو بین الاقوامی مذہب سمجھتا اور مظہر الہی ہونے
 دعویٰ دار تھا اس لئے اس نے مشرق و مغرب کے سلاطین و حکام کو تبلیغی خطوں
 ارسال کئے اور ان میں یہ دعویٰ کیا کہ ذات الہی اس میں حلول کر آتی ہے وہ قرآن
 اجراء کی طرح اپنی شریعوں کو سمور (سورت کی جمع) کہا کرتا تھا جسے غیب دانی
 بھی دعویٰ تھا۔ وہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والی پیش گوئیاں بھی کیا کرتا تھا۔

اتفاق سے بعض باتیں درست ثابت ہو جاتیں۔ مثلاً اس نے پیشگوئی کی تھی کہ نولین سوم کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ چار سال کے بعد یہ پیشگوئی پوری ہو گئی۔ اس پیشگوئی کے ظہور سے اس کے پیروں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ بہاء اللہ نے ہوشیاری سے کام لے کر زوالِ حکومت کی کوئی تاریخ متعین نہیں کی تھی۔ ممکن ہے اس نے سیاسی بصیرت کی بناء پر یہ پھانپ لیا ہو کہ یہ حکومت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مگر یہ دعویٰ کسی شخص نے بھی نہیں کیا کہ بہاء اللہ کی سب پیشگوئیاں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ اس کے بڑے سرگرم پیرو بھی یہ دعویٰ نہ کر سکے۔

بہاء اللہ اپنی دعوت کو پھیلانے کے لئے اپنے اتباع کو ترغیب دلایا کرتا تھا کہ وہ دوسری زبانیں سیکھیں۔

بہاء اللہ کی دعوت کے خصوصی حدود و خال | ۸۔ بہاء اللہ کی دعوت کے خصوصی نکات یہ تھے :-

- ۱۔ بہاء اللہ نے تمام اسلامی قواعد و ضوابط کو ترک کر دیا تھا۔ بنا بریں اس کا مذہب اسلام سے قطعی طور پر بے تعلق تھا۔ یہ بات بہاء اللہ اور اس کے استاد مرزا علی محمد میں ماہ الامتیاز ہے۔
- ۲۔ وہ انسانوں کے رنگ و نسل اور ادیان و مذاہب کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود ان کی مساوات کا قائل تھا۔ مساوات بنی آدم کا نظریہ اس کی تعلیمات میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ تعصب و اختلافات سے پرکائناات عالم میں بہاء اللہ کا یہ نظریہ بڑا جاذب نظر تھا۔
- ۳۔ بہاء اللہ نے عائلی نظام مرتب کیا اور اس میں اسلام کے بنیادی قوانین کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ وہ تعددِ اذواج سے روکتا تھا اور شاذ و نادر حالات میں اس کی اجازت دیتا تھا۔ بصورتِ اجازت بھی وہ دو بیویوں سے تجاوز نہیں کر سکتا تھا۔ طلاق کی اجازت وہ تاگزیرہ حالات میں دیتا تھا۔ اس کے یہاں مطلقہ کے لئے کوئی عدت مقرر نہ تھی بلکہ طلاق کے بعد وہ فی الفور نکاح کر سکتی تھی۔
- ۴۔ نماز باجماعت منسوخ کر دی۔ صرف نماز جنازہ میں جماعت کی اجازت تھی۔
- ۵۔ وہ خانہ کعبہ کو قید قرار نہیں دیتا تھا بلکہ اس کا اپنا سکونتی مکان قبلہ کی حیثیت رکھتا

تھا۔ چونکہ وہ حلولِ باری تعالیٰ کا عقیدہ رکھتا تھا لہذا قبلہ وہی جگہ ہونی چاہئے
 جہاں خدا کی ذات حال ہو اور وہ بزعم خویش بہاء اللہ کا مکان تھا جب بہاء اللہ
 اپنی سکونت تبدیل کر لیتا تو بہائی بھی اپنا قبلہ تبدیل کر لیا کرتے تھے۔
 ۶۔ بہاء اللہ نے اسلام کی پیش کردہ طہارتِ جسمانی و روحانی کو بحال رکھا تھا۔ بنا بریں
 وہ وضو اور غسلِ جنابت کا قائل تھا۔

۷۔ بہاء اللہ نے حلال و حرام سے متعلق جملہ احکامِ اسلامی کو نظر انداز کر دیا اور اس ضمن
 میں عقلِ انسانی کو حاکم تصور کرتے دکھا۔ اگر حق کی توفیق شامل حال ہوتی تو اسے
 معلوم ہوتا کہ اسلام کی حلال کردہ اشیاء عقل کے نزدیک بھی حلال ہیں اور حرمت
 کے حق میں عقل بھی حرمت کا فیصلہ صادر کرتی ہے۔ اس ضمن میں ایک اعرابی کا واقعہ
 ذکر کرتے کے قائل ہے اس سے جب پوچھا گیا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں کر
 ایمان لائے؟

اس نے جواباً کہا میں نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 اس کو انجام دینے کا حکم صادر کریں اور عقلِ انسانی کہے کہ ایسا نہ کر۔ اور نہ کوئی
 ایسا معاملہ میری نگاہ سے گذرا کہ عقلی منع کرے اور آپ وہ کام کرتے کا حکم دیں۔
 اگر بہاء اللہ اس اعرابی کی بات پر غور کرتا تو حقیقت کو پالیتا۔ مگر اس کا مقصد
 صرف تخریب تھا۔ ظاہر ہے کہ تخریب کے لئے صرف بھاؤ و طرام مطلوب ہے جو ہر چیز
 کو ہس نہیں کر کے رکھ دیتا ہے۔

۸۔ اگرچہ بہاء اللہ اور اس کا استاد صرزا علی محمد انسانی مساوات کے قائل تھے۔ مگر
 جمہوریت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ کو معزول کرنا ان کے نزدیک جائز نہ
 تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کو معزول کرنا ان کے نظریات سے میل نہیں
 کھاتا تھا۔ ان کے مذہبی نظریات کی اساس یہ تھی کہ ذاتِ باری انسانوں میں حلول
 کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اندریں صورت انسانوں کی تقدیس کا قائل ہونا پڑتا ہے
 اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان میں حال نہ بھی ہو اس لئے کہ ان میں حلول کا امکان
 ہوتا ہے۔ بنا بریں تقدیسِ سلاطین کا نظریہ ان کی عقل و منطق کیساتھ ہم آہنگ تھا
 تقدیسِ سلطان کے باوجود بہاء اللہ علماء کی فصیلت و عظمت کو تسلیم نہیں کرتا

تھا۔ بلکہ اس کا استاد مرزا علی محمد ان علماء کے خلاف جنگ آزما رہا جو اس کے نظریات کا ابطال کرتے تھے۔ اسی طرح بہاء اللہؑ کی علمی اجادہ داری کے خلاف معرکہ آراء رہا خواہ وہ مسلمانوں میں پائی جاتی ہو یا یہود و نصاریٰ میں۔

بہاء اللہ کا جانشین عباس آفندی | ۹۔ بہاء اللہ کا اقتدار ۶ ارمی ۱۸۹۲ء کو

بعد اس کا بیٹا عباس آفندی جسے عبدالبہاء یا محسن اعظم (بڑی شاخ) بھی کہتے تھے اس کا نائب قرار پایا۔ چونکہ سب عقیدت مند بہاء اللہ سے خلوص رکھتے تھے اس لئے کوئی بھی بہاء اللہ کا حلیف بننے میں اس کا مزاج نہ ہوا۔ عباس آفندی مغربی تہذیب و تمدن سے پوری طرح باخبر تھا اس لئے اس نے اپنے والد کے افکار کو مغربی طریق فکر و نظر میں ڈھال دیا۔ اس نے علول کے عقیدہ کو اپنے مذہب سے خارج کر دیا۔ اس کا والد جن عوارق عادت کا مدعی تھا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی ترک کر دیا۔ مغربی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر اس نے یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

دہائی مذہب کی تدبیر کی ترقی کی داستان بڑی عجیب ہے (اس مذہب کے اولین بانی نے اسلام کی تجدید و اصلاح کے نام سے اس کی تعلیمات کی تخریب کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جب اس کا نائب بہاء اللہ متدینین اقتدار ہوا تو اس نے جملہ تعلیمات اسلامیہ کا انکار کر کے اپنے استاد کے مشن کی تکمیل کر دی۔ جب تیسرے گدی نشین نے مسند سنبھالی تو اس نے اصول اسلامی کے انکار پر ہی بس نہ کی بلکہ قرآن کریم کی بجائے کتب یہود و نصاریٰ کی جانب متوجہ ہوا اور ان سے اخذ و استفادہ کرنے لگا۔

یہود و نصاریٰ میں بہائیت کی شاعت | ۱۰۔ اسی کے زیر اثر یہ مذہب یہود و نصاریٰ اور مجوس میں پھیلنے لگا اور ان

مذہب کے لوگ جو درجہ بہائیت میں داخل ہونے لگے۔ دوسری وجہ یہ تھی۔ کہ جب عباس آفندی اور اس کا والد بہاء اللہ مسلمانوں سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اپنی توجہ دیگر مذاہب و اولوں کی طرف منقطع کرنا شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سر زمین فارس اور اس کے قریب و جوار میں یہود و نصاریٰ کثرت سے بہائیت کے حلقہ بگوش ہو گئے انہوں نے بلاد ترکستان میں عمارتیں تعمیر کر رکھی تھیں جہاں اجلاس منعقد کیا کرتے تھے۔ یہ مذہب

یورپ و امریکہ میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگا اور بہت سے لوگ ان کے دائمی ترویج میں بھٹس گئے۔ مشہور کتاب "العقیدۃ والشریعتہ" کا مصنف لکھتا ہے:-

"شہر عسکا کے نبی (بہاء اللہ) نے محسوس کیا کہ یورپ و امریکہ کے بعض لوگ بڑے جوش و خروش سے بہائیت کو قبول کرتے جا رہے تھے یہاں تک کہ عیسائیوں میں بھی ان کے حلقہ بگوش پیدا ہو گئے۔ امریکہ میں جن ادبی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا وہ بہائیت کے اصول و ضوابط کے استحکام میں مدد و معاون ہوئی تھیں امریکہ سے ۱۹۱۰ء میں ایک مجلہ "نجم الغرب" نامی نکلنا شروع ہوا جس کے سال بھر میں انیس ہزار سے شائع ہوا کرتے تھے۔ انیس کے عدد کی وجہ تخصیص یہ تھی کہ یہ ہند ان کے یہاں بڑا موثر تھا۔ بہائی یوں بھی اعداد کی قوت تاثیر کے قائل تھے جیسا کہ ہم مرزا علی محمد کا حال بیان کرتے وقت تحریر کرتے ہیں:-

مصنف مذکور مزید لکھتا ہے:-

"بہائیت اضلاع متحدہ امریکہ کے درافتادہ علاقوں میں پھیل گئی اور شکاگو میں ایک مرکز بھی قائم کر لیا۔"

(العقیدۃ والشریعتہ ص ۲۵۰)

بہائی فرقہ والوں نے عیسائیوں کو ورغلانے کے لئے ان کی کتابوں سے استدلال کرنا شروع کیا اور یہ دعویٰ کھڑا کر دیا کہ عہد قدیم و جدید میں بہاء اللہ اور اس کے پیٹے کی بشارت موجود ہے۔ گولڈ سپر اس ضمن میں لکھتا ہے:-

"ہم اس آفندی کے ظہور سے بہائی مذہب کے تورات و انجیل سے مدد لے کر ایک نیا قالب اختیار کیا۔ تورات و انجیل میں عیاس آفندی کے ظہور کی خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ امیر و رئیس ہوگا اور عجیب و غریب القاب سے مزین ہوگا۔ یہ ذکر کتاب اشعیاء کے انیسویں باب کی آیت میں مذکور ہے۔ ہمیں مرقوم ہے

"ہمارے یہاں ایک لڑکا (بہاء اللہ) پیدا ہوگا جس کے گھر میں ایک بچہ جنم لے گا۔ جو بڑا نام پائے گا۔ اسے بڑے القاب و آداب سے یاد کیا جائیگا اور رئیس السلام کے نام سے پکارا جائے گا۔"

(العقیدۃ والشریعتہ)

یورپی ممالک میں شیوع بہائیت کا راز | - یہ ہے بہائیت کی اصلی تصویر، ان کے اپنے اعلانات اور بیانات کی روشنی

ہیں! ہم نے اس کے اصول و عقائد کو بلا تحریف و تاویل من و عن بیان کر دیا ہے۔ ہمارا
 ارادہ یہ ہے کہ اس کتاب میں مختلف فرق و مذاہب کے معتقدات ان کے اپنے خیال کے
 مطابق درج کر دیئے جائیں یا جس طرح اس کے حامی اس کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ یورپین
 لوگوں نے بہائیت کی حمایت اس لئے کی تھی کہ اس سے اسلامی اصول و قواعد کی تحریف
 ہوتی ہے اور انہیں ہر اس بات سے دلچسپی ہوتی ہے جو اسلام کے خلاف ہو۔

سابقہ بیانات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ فرقہ مجموعہ اولیٰ م ہے۔ یہ مذہب
 امریکہ و یورپ اور ان مسلمانوں میں پھیلا تھا جو دین برحق سے برگشتہ ہو گئے تھے۔ یا اس ہنرمند
 یورپین لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمانوں میں بہائیت کے سیر و کثیر التعداد ہیں۔ مگر وہ ہڈ
 لیم و ستم بنتے کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ ان کا یہ دعویٰ دلائل سے عاری ہے
 اس لئے کہ اسرارِ بہائی کا علم صرف خدا کی ذات کو ہے۔ یورپین لوگ بھی غیب دانی کے مدعی
 ہیں۔ شاید ان کے یہ اقوال ان کے جذبات و احساسات کے ترجمان ہیں۔ اس لئے کہ
 ان کا آخری مقصد اسلامی تعلیمات کی تضحیک اور ان کا استخفاف ہے۔ مگر دین حق کے مقابلہ
 میں ان کی یہ مساعی پر گاہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ غصہ سے جان بحق ہو سکتے ہیں۔ مگر
 ان کی آرزو بر نہیں آسکتی۔ یہ چہرے بھیا نہ جائے گا۔

بہائی مذہب کے متعلق مصری حکومت کا فیصلہ | ۱۲۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مصر کے

بہائیت آسمانی مذہب نہیں بلکہ سرے سے کوئی مذہب ہی نہیں۔ خلاف ازیں یہ چند افکار
 پریشان کا مجموعہ ہے جس کا مقصد اسلام کو نقصان پہنچانا۔ انار کی پیدا کرنا اور مسلمانوں
 میں الحاد و دہریت کو پھیلانا ہے۔

انہی وجوہات کی بناء پر مصری حکومت کے اس محکمہ نے جو نکاح کی رجسٹریشن کے سلسلہ
 میں قائم کیا گیا ہے۔ بہائی مذہب سے متعلق تین اشخاص کے بارے میں یہ فتویٰ دیا تھا کہ وہ
 اسلامی اصولوں کے منکر ہیں۔ یہ فتویٰ دینے سے قبل مصری قانون کی اس دفعہ کا مطالعہ
 کر لیا گیا تھا جو رہائی انجمنوں اور اجتماعی سوسائٹیوں سے متعلق ہے اس بات کی تحقیق بھی
 کر لی گئی تھی کہ بہائی مذہب کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیمات عقائد فاسدہ پر
 مشتمل اصول دین کے مناقض اور مسلمانوں کے انبیاء و کتب مقدسہ میں شکوک و شبہات پیدا

کرتے کی موجب ہیں۔ مصری حکومت کے محکمہ قضاء کے اراکین قبل ازیں پارلیمنٹ میں ان خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا تھا کہ بہائیت آسمانی مذاہب کے منافی ہے۔

جس ملک (مصر) کا سرکاری مذہب اسلام ہو اور اس میں ایسے عقائد فاسدہ اور ان پر مشتمل کتب کی تشریح و اشاعت جن نقصانات کی موجب ہو سکتی ہے۔ ان سے اس سلطنت کی غایت تشکیل ہی قوت ہو جاتی ہے۔ ایسے عقائد کی اشاعت کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امن عام تباہ ہو جاتا۔ لوگوں کے جذبات پر انگھٹتہ ہوتے اور انتشار عام پیدا ہو جاتا ہے۔ مزید برآں جو مذاہب ملک میں قبل ازیں رائج ہوتے ہیں ان کی تضعیف ہوتی ہے جس کی بناء پر ان پر ایمان رکھنے والے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اس فتویٰ میں وزارت داخلہ کے اس بیان سے بھی استدلال کیا گیا تھا کہ وزارت داخلہ کی تحقیق میں یہاں ٹولہ کوئی مذہبی گروہ نہیں ہے۔

ان وجوہ و اسباب کی روشنی میں مصری پارلیمنٹ کے اوارہ افتاء نے یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ ان تین اشخاص کے نکاح کی توثیق نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ نکاح باطل ہے۔ اس لئے کہ بہائیت کا قیام مصر کی سرکاری حکومت کے منشاء کے خلاف ہے (یہ تینوں اشخاص بہائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے)

اس افتاء کی عبارت سے جو حقیقت اجاگر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مصر کا ایک وکیل بہائی مذہب کے چند اشخاص کے نکاح کی توثیق کرانے کے لئے متعلقہ محکمہ میں حاضر ہوا۔ تصدیق کنندہ کو یہ معلوم کرنے کے لئے تامل ہوا کہ آیا مصری قانون میں بہائی فرقہ کا وجود بھی ہے اور اس کے شخصی حالات اس میں مذکور ہیں یا نہیں؟ چنانچہ وزارت داخلہ نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ محکمہ توثیق نکاح نے جب مزید تحسس سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ بہائیت دین اسلام کو ضرر پہنچانے والا مذہب ہے اور مصری حکومت ایک مذہب کی حیثیت سے اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ نظر میں اس کی حمایت سے معذور ہے اور نکاح کی توثیق نہیں کر سکتی۔ الا یہ کہ بہائیت پر ایک مذہبی گروہ کے علامات واضح ہوں جو توثیق نکاح کے موید ہوں۔

تسجيل نکاح سے متعلقہ محکمہ کا اشارہ اس جانب تھا کہ جن فرقوں کے یہاں عقد نکاح کی مجالس ہوتی ہیں ان کے نکاح کی توثیق شرعی عدالت میں کی جاتی ہے اور محکمہ بڈا یہ خدمت بجالانے سے معذور ہے۔ جب اس طریق سے بھی مقصد حاصل نہ ہو سکا تو بہائی فرقہ والے یہ دعویٰ لے کر کھڑے ہو گئے کہ وہ ایک رفاہی اور روحانی انجمن سے

متعلق میں لہذا نکاح کی توثیق ناگزیر ہے۔ مگر قوی نے یہ واڈ بھی نہ چلنے دیا۔

۱۳۰۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اعداؤں کی بہائی مذہب کی عظیم خاصیت

مساعی سے دینی دعوت رُو باخطاط ہوتی ہے تو اسلامی دیار و امصار میں بہائیت زور پکڑ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد بہائی مذہب نے بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ بہائیت اب بھی کہیں کہیں سر نکال رہی ہے۔ دینی غیرت کا تقاضا ہے کہ اس کو بلیا میٹ کر دیا جائے یا اس کے مرکز شکاگو کی طرف لوٹا دیا جائے جہاں سے اس کا ظہور ہوا تھا۔

۱۳۱۔ بہائی مذہب پاکستان میں تبلیغی جال پھیلا رہا ہے۔ بہائیوں نے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں تبلیغی مراکز قائم کر رکھے ہیں جہاں سے لٹریچر شائع کر کے عوام میں بلا قیمت تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کے مبلغ ہر وقت مرکز میں موجود رہتے اور تبلیغی ہتھکنڈے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کے گھروں پر لٹریچر بھیج دیا جاتا ہے۔ لاپرواہ اور لاہور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے خصوصی مرکز ہیں۔ ضرورت ہے کہ دینی غیرت سے بہرہ مند نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور اس شجرہٴ خبیثہ کو برگ و بار لائے۔ پہلے ہی ملک بدر کر دیں۔ ہمارے یہاں پہلے ہی بے دینی کیا کم ہے کہ اس پر ایک اور دینی فتنہ کا اصنافہ کیا جائے۔ (غلام احمد حیدری مدظلہ العالی)

۴۵۔ قادیانی فرقہ

قادیانیت کا پس منظر | ۱۴۔ سلطان محمود غزنوی نے جب ہندوستان کو فتح کیا تو

مسلمان فاتحانہ شان سے ہند میں داخل ہوئے۔ تاہم اسلامی

رواداری کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو ان کے مذہب پر ہی رہنے دیا۔

ہندوستان میں ان دنوں بدھ مت اور برہمنوں کا زیادہ چرچا تھا۔ برہمنوں کی تعداد

بہت زیادہ تھی۔ اسلامی عقائد نے ہندو مذہب کو بھی متاثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔ چنانچہ

اہل ہند میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اسلام اور ہندو مت کا ایک معجون مرکب

تیار کرنا شروع کیا۔ گورو بابا نانک نے جن کی وفات ۱۵۳۸ء میں ہوئی اسلامی عقائد اور

ہندی اصولوں کو مخلوط کر کے سکھ مذہب کی طرح ڈالی جو شمالی ہند میں بودو پاش رکھتے

گوٹھ صہرا پنی کتاب العقیدہ والشریعیہ میں لکھتا ہے۔

”اسلام اور ہندو مت کی آمیزش کا اہم عنصر یہ تھا کہ صنم پرستی کو مٹا کر

مسلمان صوفیاء کی طرح توحید حقیقی پر ایمان لایا جائے“ (العقیدہ والشریعیہ ص ۲۵۷)

جب اسلام ان صنم پرستانہ مذاہب پر اثر انداز ہو چکا تھا تو یہ ضروری تھا کہ بعض

مسلمان بھی ان تعلیمات سے متاثر ہونے یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ مسلمانوں میں وہ افکار

پھیلنا شروع ہوئے جو اسلام سے لیشل گیر ہونے والے بعض افراد کے سر میں سمائے ہوئے

تھے اور اسلامی تعلیمات ان کے قلوب و اذہان میں راسخ نہیں ہوئی تھیں۔

جب انگریز ہندوستان پر مسلط ہوئے تو اسلامی سلطنت کی جگہ انگریزی حکومت نے

لے لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان سیاسی کمزوری کے باعث پورے ہندوستان پر قابض

نہ ہو سکے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین ہند میں یورپی و عیسائی تہذیب و حضارت

کا عمل و نفل شروع ہوا۔ اگرچہ بعض ہندوؤں نے عیسائی مذہب کو قبول کر لیا تھا تاہم ان

کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے دو بڑے گروہوں کے ہوتے ہوئے

ان کو تیسری جماعت شمار کیا جاتا۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں سکھ بھی بودو پاش رکھتے تھے

جو لوگ نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان میں مغربی تہذیب داخل ہوتی چلی گئی اس کے علاوہ

وہ ابھی تک ہندوانہ نظریات سے کلیتہً پاک نہ ہو سکتے تھے۔ یا یوں کہئے کہ وہ اسلامی حقائق پر ایمان تولائے تھے مگر ان کا ایمان وایقان ان لوگوں کی طرح نہ تھا جو دل سے اسلامی اصول و مبادی کو چاہتے اور ان کی حقانیت پر ایمان رکھتے تھے۔ بلکہ یہ ان بدوؤں کی طرح تھے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

وَقَالَتِ الْآخْرَاءُ آمَنَّا قُلْ لَمْ نُؤْمِنُوا
وَلَكِنْ قَوْلُوا اسْلَمْنَا وَكَلَّمَا يَدْخُلُ
الْإِيمَانَ فِي قُلُوبِكُمْ

دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ان سے کہئے کہ تم ایمان نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ اسلام میں داخل ہو گئے اس لئے کہ ایمان ابھی تک تمہارے سینہ میں داخل نہیں ہوا۔

یورپین تعلیمات جن میں نصرانی تہذیب کی آمیزش ہوتی تھی ان ضعیف الایمان مسلمانوں پر ان اسلامی حقائق کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوئیں۔ جن کا سرسری ادراک انہیں حاصل تھا مگر ان کی صداقت ان کے قلب و ذہن پر نہیں چھائی تھی۔ انگریز جو مغربی تہذیبی ثقافت کو دیار ہند میں لائے تھے۔ مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں سے بڑا انکاؤر کھتے انہیں تقرب بارگاہ سے مشرف کرتے اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازتے تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم ان دیار میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔

۱۵۔ یہی وجوہات تھے جن کی بناء پر سرزمین ہند گمراہ فرقوں کی قرار گاہ بن گئی غالباً قلت

مرزا غلام احمد قادیانی کے مختصر سوانح

تعداد کے علی الرغم ان فرقوں میں زیادہ نمایاں قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اس کے بانی و مؤسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔

اس کی نسبت قادیان کی طرف ہے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ ان کی قبر پر ”مرزا غلام احمد موعود“ کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وہ آکر شریعت کی اجیاء و تجدید کریں گے۔

رفع عیسیٰ الی السماء :- جب مرزا غلام احمد کو پتہ چلا کہ کشمیر کے شہر سری نگر میں یوسف اساف نامی ولی اللہ کی قبر موجود ہے تو انہوں نے ہندوؤں میں مشرف باسلام ہونے

والوں میں یہ خیال پھیلانا شروع کیا کہ یہ عیسیٰ بن مریم کی قبر ہے یہودی جب حضرت عیسیٰ کے درپے آزار ہوئے تھے اور ایک شخص کو ان کا ہم شکل بنا دیا گیا تھا تو آپ سولی سے نجات پا کر سری نگر میں اقامت گزریں ہوئے یہاں وفات پائی اور اس قبر میں مدفون ہوئے۔ مرزا صاحب نے تاریخ کی روشنی میں اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کا مقصد اس سے قرآن کی بیان کردہ حقیقت مسلمہ کا اثبات تھا کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے منصوبہ میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ مگر اس پر وہ یہ اصرار کرتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے نہیں گئے تھے بلکہ اس قبر میں مدفون ہوئے۔ مرزا صاحب کا یہ نظریہ جمہور اہل اسلام کے خلاف ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ **بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ** (بلکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو اپنی طرف اٹھالیا)

نیز فرمایا:۔ **وَسَرَفَعْنَاكَ إِلَيْنَا** (اور تجھے اپنی طرف اٹھانے والا ہوں)

معدودے چند علماء رفع عیسیٰ کے خلاف ہیں۔ ان کا قول ہے کہ یہ رفع جسمانی نہ تھا بلکہ روحانی تھا۔

بنا بریں ہم کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے سب سے پہلے اسی عقیدہ کا اظہار کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ کا رفع روحانی تھا جسمانی نہ تھا۔ نیز یہ کہ آپ سری نگر کی اس قبر میں مدفون ہیں۔

مرزا صاحب کے دعاوی | ۱۶۔ قبر عیسیٰ کے مزعومہ انکشاف کے بعد اس جدید ہم کا آغاز کیا کہ وہ چودھویں صدی کے مجدد ہیں۔ امام احمد

رحمۃ اللہ علیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:
«اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر ایک شخص کو بھیجا کریں گے جو تجدید دین کا فریضہ انجام دے گا»

مرزا صاحب کا دعویٰ تھا کہ وہ اس آخری صدی کے مجدد ہیں۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں یہ اعتقادات رکھتے تھے:-

۱۔ انہیں کشف کے ذریعہ حضرت عیسیٰ کی قبر سے آگاہ کیا گیا۔ اس انکشاف سے ان میں حضرت عیسیٰ کی روح عود کر آئی لہذا مہدی منتظر وہی ہیں۔ وہ روح عیسیٰ اور اپنے مہدی ہونے کی بناء پر دین کی تجدید کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ بنا بریں ان

کی ہر بات حق و صدق کی مظہر ہے جس سے کسی شخص کو مجال انکار نہیں۔ اس لئے کہ ان کی ہر بات خدا کی بات ہوتی ہے۔

۲۔ مرزا صاحب صرف ہدی ہونے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ذاتِ خداوندی ان میں حلول کر آئی ہے۔ شاید ان کا یہ قول ان کے دوسرے دعویٰ سے ہم آہنگ ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کی قوت ان میں لوٹ آئی ہے۔ آپ کا یہ دعویٰ موجودہ نصرانیت سے ماخوذ ہے اس لئے کہ نصاریٰ کا دعویٰ بھی یہی ہے کہ حضرت مسیح لاہوت و ناسوت کا مجموعہ تھے۔

۳۔ مرزا صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کے معجزات ان کے دعاوی کا اثبات کرتے ہیں۔ ماہ رمضان ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۲ء بھوج اور چاند کو گرہن لگا تھا۔ مرزا صاحب نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ کسوف و خسوف ان کے عجزہ کے طور پر ظہور پذیر ہوا ہے اور اس سے ان کے دعویٰ رسالت کی تصدیق ہوتی ہے۔

مرزا صاحب اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں :-

”آنحضرت کے لئے چاند کو گرہن لگا تھا اور میرے لئے چاند اور سورج دونوں کو“

مرزا صاحب کے ایک مرید باصفا اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

”خسوف قمر جب آنحضرت کی نبوت کی صداقت کی دلیل ہے تو میری نبوت سے

کیونکر مجال انکار ہوگی جب کہ میرے لئے آفتاب و ماہتاب دونوں کو گرہن لگا۔“

(الرد علی کتاب المسائل القادیانیہ ص ۱۲۱)

۴۔ مرزا صاحب رسالت کا دعویٰ کرتے اور کہتے ہیں کہ ان کی رسالت نبی کریم کے خاتم الانبیاء

ہونے کے منافی نہیں اس لئے کہ ان کے نزدیک ”خاتم النبیین“ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ

کے بعد جتنے نبی آئیں گے ان کی نبوت پر آنحضرت کی ہر ہوگی اور وہ آپ کی شریعت کی

تجدید و اصلاح کے لئے آئیں گے۔ چنانچہ اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں لکھتے ہیں :-

”نبی کریم کے خاتم الانبیاء ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہی صاحب الختم ہیں اور

کوئی شخص آپ کی انگوٹھی (خاتم) سے کسب فیض کے بغیر نعمتِ وحی سے مستفید

نہیں ہو سکتا۔ امت محمدی مکالمہ و مخاطبہ ربانی کے مشرف سے کبھی محروم نہ

ہوگی کیوں کہ ختم کرنے والے صرف آپ ہیں آپ کی انگوٹھی ہی سے حصولِ نبوت

ممکن ہے۔ اس لئے کہ ہونے والے نبی کا امت محمدی میں سے ہونا ضروری ہے۔
(حقیقۃ الوحی ص ۲۶)

مرزا صاحب کتاب التعلیم میں لکھتے ہیں:-

«اللہ تعالیٰ من حیث الاعتقاد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی وحدانیت پر ایمان لایا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ نبی کریم خدا کے رسول افضل الانبیاء اور خاتم الرسل تھے۔ آپ کے بعد صرف وہی نبی آسکے گا جو آپ کا تابع ہو اور ظل کی حیثیت رکھتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خادم مخدوم کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اور فرغ اصل سے جدا نہیں ہو سکتی»
(التعلیم ص ۱۵)

مرزا صاحب مزید لکھتے ہیں:-

«اگر میں آپ کی امت سے نہ ہوتا اور آپ کے طریقہ کی پیروی نہ کرتا تو مکالمہ ربانی سے مشرف نہ ہو پاتا۔ اگرچہ میرے اعمال پہاڑوں کے برابر ہوتے اس لئے کہ نبوت محمدی کے سوا سب نبوتیں منقطع ہو چکی ہیں لہذا آپ کے بعد کوئی صاحب شریعت نبی نہ ہوگا۔ البتہ غیر تشریحی نبی آسکتے ہیں۔ مگر ان کا آپ کی امت میں سے ہونا ضروری ہے»
(التجلیات الاظہیہ ص ۲۳)

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلا۔

(۱) مرزا صاحب نبی تھے۔

(۲) کسوف و خسوف آپ کا معجزہ ہے اور آپ نے قبل از وقت ان کی خبر دی تھی۔

(۳) خاتم النبیین کا لفظ انبیاء کی آمد کے منافی نہیں کیونکہ خاتم بمعنی آخر نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آنے والے انبیاء پر آپ کی مہر ثبت کی جائے گی اور وہ آپ کی نبوت کی اشاعت کے لئے تشریف لائیں گے۔

مرزا صاحب کے دعوائی متضاد قسم کے تھے۔

۱۔ ان کا پہلا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ کا بروتر ہیں۔

۲۔ پھر یہ دعویٰ کرتے گئے کہ ذاتِ خداوندی ان میں حلول کرائی ہے۔

۳۔ بعد ازاں ظلی نبی ہونے کے مدعی ہوئے۔

مرزا صاحب نے کسوف و خسوف کو اپنے دعویٰ کی دلیل بٹھرایا جالانکہ علم الافلاک

ان سے پہلے بھی موجود تھا اور اس علم میں ہجرت رکھنے والے ہستیوں پہلے اس کی اطلاع دے دیا کرتے تھے۔ بنا بریں اس کی اطلاع دینے میں اعجاز کی کوئی بات نہ تھی۔ اس لئے کہ اعجاز کی اساس یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کام سے عاجز ہوں اور ان کو چیلنج کر دیا جائے۔ اندر میں صورت لوگ عاجز نہ تھے اور نہ یہ چیلنج کا مقام تھا۔

۱۔ مرزا صاحب کے ان بیانات سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں :-

- ۱۔ ان کے دعاوی کا آخری مرحلہ یہ تھا کہ وہ خدا کے رسول اور مخاطب ہیں۔
- ۲۔ وہ شریعت محمدی کے مفسر ہیں۔ اس پر عمل کرتے اور اس کی تجدید و اصلاح کرتے ہیں۔
- ۳۔ آپ بنا بر تفسیر خود خود دھوں صدی کے آغاز میں مبعوث کئے گئے۔

مرزا صاحب کی تفسیر و توضیح کے نکات حسب ذیل ہیں :-

اول :- قرآن کریم نے جن اہل مذاہب کی مدح و ستائش کی ہے وہ اس دور میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں یہود و نصاریٰ کی تعریف کی گئی ہے وہ اوصاف موجودہ یہود و نصاریٰ پر صادق آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی لوگ انگریزوں کی تعریف کرتے اور ان کی فضیلت کے معترف ہیں۔ مرزا صاحب کی رائے میں اسلام انگریزوں کی اطاعت کو واجب قرار دیتا ہے۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں :-

” میں نے بارہا اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ اسلام دو اصولوں پر قائم ہے :-

(۱) پہلا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔

(۲) دوم یہ کہ اس حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ نہ ہوں جس کے عہد حکومت

میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو اور ہماری جانیں ظالموں سے محفوظ ہوں

اور یہ برطانوی حکومت ہے۔“

مرزا صاحب مزید فرماتے ہیں :-

” انگریزوں کی ناشکری حرام ہے جب تک کہ وہ مذہب میں بنیادی تبدیلی

نہ کریں کسی مومن مرد و عورت کے لئے کسی اچھے کام میں ایسے بادشاہ کی

نافرمانی درست نہیں جو اس کے اہل و عیال کی حفاظت کرتا اور اس کی ناموس

مال کو بچاتا ہو۔ احسان پیشہ ہو غم کو دور کرتا اور حسن سلوک سے پیش آتا ہو۔ اے فتویٰ دریافت کرنے والو! یہ فتویٰ یاد رکھو اور ان علماء کی آراء پر عمل نہ کرو جو بلا علم فتویٰ دیتے خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔“
(القبلیغ ص ۲۲)

دوم = جہاد ختم ہو چکا ہے اس لئے کہ اس کے غایات و مقاصد باقی نہیں رہے۔ دین میں فتنہ پروری کا انسداد ہو جانے کے بعد اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مرزا صاحب اپنے متعلق کہتے ہیں کہ میں مقاتل ہوں نہ داعی الی القتال۔ وہ لکھتے ہیں:-
”میرا یہ اعتقاد نہیں کہ میں ہاشمی و قریشی خونریز جہادی ہوں نبی خاطر جس کے لئے مجھ کو انتظار میں اور جو کرہ ارضی کو خون سے بھر دے گا۔ میں ایسی احادیث کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ موضوعات کا طو مار تصور کرتا ہوں۔ مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں جو مسیح ابن مریم کی طرح عاجزانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ میں حرب و قتال سے گریزاں اور بطریق لطف و کرم خدا کی حمد و ثنا میں مصروف ہوں۔ عام لوگوں کی نگاہ سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ میرے اصول و قواعد اور تعلیمات پر حرب و قتال اور ظلم و تعدی کی کوئی چھاپ نہیں۔ میں بڑی تاکید سے یہ بات کہتا ہوں کہ میرے ارادت مندوں کی تعداد جتنی بھی بڑھتی جائے مگر ان میں قائلین جہاد کی تعداد کم ہی ہوگی اس لئے کہ مجھے مسیح و جہادی تسلیم کرنے کا مطلب ہی ترک جہاد ہے۔“

(تسلیغ الرسائل ص ۱۷)

مرزا صاحب لکھتے ہیں:-

”بتائیے آج کفار میں سے کون ہے جو دین اسلام میں مزاحمت کرنے کے لئے تلوار اٹھاتا ہو؟ دینی امور کے سہرا انجام دینے سے آج کون روکتا ہے۔ مسجدوں میں اذان کہنے سے کون مانع ہے؟ فرض کیجئے اگر ایسے پرامن عصر و عہد میں مسیح موعود پیدا ہو جائے اور اس ان کی ناقدری کرتے ہوئے وہ بلاوجہ تلوار اٹھائے تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسا شخص کذاب و مفتری ہوگا اور ہرگز سچا مسیح نہیں۔ سیف و عصا سے ایمان کو دل میں داخل نہیں کیا جاتا یہ دیکھتے

صحیح بخاری میں بڑی واضح حدیث ہے جس میں مسیح موعود کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "يَضَعُ الْحَرْبَ" (وہ لڑائی کو موقوف کر دے گا) یعنی اس کی غرض بعثت ہی جنگ و قتال نہ ہوگی۔

مقام ہجرت و استنجااب ہے کہ ایک طرف تم بخاری کو قرآن کریم کے بعد اصح الکتاب مانتے ہو اور دوسری جانب ان احادیث سے احتجاج کرتے ہو جو صراحتاً احادیث بخاری سے متصادم ہیں۔

چاہئے تو یہ تھا کہ بخاری کے مقابلہ میں ہزار ہا کتابوں کو ٹھکرا دیتے۔ اس لئے کہ ان کا مفہوم صرف حدیث بخاری کے ہی مخالف نہیں بلکہ صراحتاً قرآن کے بھی خلاف ہے۔
(تربیقا اقلوب ص ۱۶، ۱۷)

موم = مرزا صاحب ان لوگوں کو کافر قرار نہیں دیتے جو انکی تکفیر و تذبذب کرتے ہوں، اگر اعلانیہ ان کی تکذیب کرتے ہوں تو وہ کفار ٹھہریں گے۔ گویا ان کے افکار و آراء کے پیش نظر لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔
۱۔ پہلی قسم کے وہ لوگ ہیں جو ان کے اقوال پر ایمان لاتے ہیں۔

۲۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو ایمان و تکذیب کسی سے بھی آشنا نہیں ان کے بارے میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"یہ بات قابل ذکر ہے کہ تکذیبین کی تکفیر صاحب شریعت انبیاء کا کام ہے۔ ان کے علاوہ صاحب مکالمہ و مخاطبہ تقرب ربانی میں کس درجہ تک بھی پہنچ جائیں ان کا انکار کر کے کوئی شخص کافر قرار نہیں پاتا۔ البتہ ایسے مقرب بارگاہ لوگوں کی تکذیب کرنے والا بد بخت ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی عظمت و فضیلت کا انکار کرنے سے ساعت بساعت اس کا دل سخت ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار وہ نور ایمان سے یکپھر محروم ہو جاتا ہے۔"

۳۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو ان کی (مرزا صاحب کی) اعلانیہ تکذیب و تکفیر کرتے ہیں۔ مرزا صاحب معاملہ بالمثل کے طور سے ان کو کافر گردانتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-
"بلاشبہ میں حق و صدق سے انحراف کرنے والے ہر شخص کو گناہ میں آلودہ تصور کرتا ہوں۔ مگر میں اس وقت تک کسی کلمہ گو کی تکفیر نہیں کرتا جب تک وہ میری تکفیر و تکذیب کر کے خود کافر نہ بن جائے۔ اس معاملہ میں ابتداء ہمیشہ مخالفین

کی جانب سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے کافر کہا اور مجھ پر کفر کا فتویٰ عائد کیا
میری تکفیر کے وہ حسب فتویٰ نبی کریم خود کافر بن گئے۔ خلاصہ کلام! میں انہیں
کافر نہیں کہتا بلکہ وہ بذات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فتویٰ میں داخل
ہو جاتے ہیں۔
(تریاق القلوب ص ۱۳۰)

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اتباع کو ان مخالفین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع
کرتے تھے جنہوں نے ان کی تکفیر و تکذیب کی۔ ۱۹۰۲ء میں ایک استفتاء ان کے پاس آیا
تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

”جو شخص ہمیں اعلانیہ گالیاں دیتا کافر کہتا اور شدید قسم کی تکذیب کرتا ہو
اس کی نماز جنازہ ہرگز درست نہیں۔ مگر جس شخص کا معاملہ مشتبہ ہو اس کا جنازہ
پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ نماز جنازہ دراصل دعا ہے قطع تعلق
ہر حال میں بہتر ہے۔“

قطع تعلق سے مرزا صاحب کی مراد یہ ہے کہ مشتبہ شخص کا جنازہ نہ پڑھنا اولیٰ ہے
اس لئے کہ وہ اعلانیہ ان پر ایمان نہیں لایا۔

چہارم :- مرزا صاحب قادیانی عورتوں کا نکاح ان لوگوں سے درست تصور نہیں کرتے
جو ان پر ایمان نہیں لائے۔ البتہ ایک قادیانی مخالف عورت سے نکاح کر سکتا ہے
گویا قادیانی مسلمانوں سے اہل کتاب ایسا سلوک کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
وہ ان کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتے ہیں۔ ورنہ قادیانی عورتوں کو ان
نکاح کرنے سے منع نہ کرتے۔ اس ضمن میں مرزا صاحب کے ایک مرید لکھتے ہیں :-
”دین و مذہب کے اختلاف سے بیوی خاوند ناپاک نہیں ہو جاتے۔ اگر ایسا
ہوتا تو اسلام مسلمانوں کو اہل کتاب عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت نہ دیتا
مسلم کو یہود و نصاریٰ عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے اور مسلم عورت کو
اہل کتاب سے نکاح کی اجازت نہ دینے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ
دین و مذہب کا تباہی بیوی خاوند میں سے کسی کے لئے بھی ناپاکی کا موجب
نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عورت طبعاً کمزور واقع ہوئی ہے۔ لہذا یہ
خطرہ لاحق ہے کہ خاوند جبر و اکراہ سے عورت کو اپنا ہم تو ابنائے گاہ۔ یہ ایسی

بات ہے کہ کسی سلیم العقل آدمی کے لئے اس سے مجال انکار نہیں۔
(الرد علی کتاب المسألة القادیانیة از منیر حمصی الحسینی ص ۳۹)

۱۸۔ یہ ہیں وہ افکار و آراء جن پر مرزا غلام احمد
مولوی نور الدین خلیفہ اول جیکے اور جن پر ان کی وفات ہوئی۔ انہوں نے
۲۶ مئی ۱۹۰۹ء کو اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ احمدی جماعت میں سے ایک
مجلس کی تشکیل عمل میں لائی جائے جو امیر کا انتخاب کرے یہ امیر ان کا روحانی پیشوا ہوگا۔
مرزا صاحب کے بعد مولوی نور الدین خلیفہ اول کی حیثیت سے آپ کے جانشین
قرار پائے۔ صاحب ممدوح مرزا صاحب کی تعلیمات کے پابند رہے اور جماعت بھی
آپ کے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ یہ جماعت فعال ہونے کی حیثیت سے اپنی نظر آپ سے
اس کے اکثر افراد بڑے جذب اور شائستگی ہیں۔ اگر یہ دین حق کی اقامت کا فریضہ ادا
کرتے تو عظیم خدمت انجام دیتے۔ مگر ان کے عقائد سب باطل مسم کے ہیں۔ مرزا صاحب
کی جانشینی کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب جو آپ کے خاوندہ سے وابستہ نہ تھا جو شیعہ
مریدوں کے لئے اس امر کا موجب ہوگا کہ وہ جدید مہدی کا انتظار کرنے لگے۔ جو مرزا
صاحب کی نسل سے ہوگا۔ یہ عقیدہ جماعت کے اکثر افراد پر چھایا ہوا ہے۔

۱۹۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرزا صاحب کی
قادیانی فرقہ میں اختلاف وفات کے بعد قادیانیت میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی یا نہیں؟
ان میں ایک جماعت (اسے لاہوری قادیانی کہا جاتا ہے) یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ
مرزا غلام احمد صاحب معجزات نبی نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت ایک ملہم و محدث کی تھی۔
مرزا صاحب کی تحریروں سے بھی ان کا ملہم ہونا مستفاد ہوتا ہے۔ تاہم قادیانی
جماعت مرزا صاحب کو رسول دینی تسلیم کرتی اور انہی صفات سے مختص تصور کرتی
رہی ہے۔ جو خاصہ انبیاء ہیں۔ مثلاً ان کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" لکھا اور
کہا جاتا ہے۔ ان کے اتباع معجزات سے بھی ان کی نبوت ثابت کرتے ہیں۔

قادیانیوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ مرزا صاحب جس جہاد کے منسوخ ہونے
کے مدعی ہیں وہ مدافعت نہیں بلکہ جارحانہ ہے۔ یہ تاویل معیوب نہیں۔ مگر یہ
حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلامی غزوات میں سے کوئی بھی جارحانہ نہیں، البتہ

دفاع بھی بعض اوقات ابتدائی جملہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
دیگر اصول و مبادی میں قادیانی متحد الخیال ہیں۔ البتہ ان کی انگریز دوستی کا
جذبہ مدغم پڑ گیا اس لئے کہ یہ سلطنت ہی باقی نہ رہی۔

۲۰۔ یہ ہے قادیانیت کی صحیح تصویر جو ان کی کتابوں
کی مدد سے کھینچی گئی۔ ہم نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔

اس کتاب کی ترتیب و تہذیب میں ہمارا یہ دستور رہا ہے کہ مذاہب و ادیان کے افکار
ان کی تصانیف کے مطابق بیان کئے گئے۔ ان کے ذکر و بیان میں افراط و تفریط
سے قطعی طور پر اجتناب کیا گیا۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ آیا قادیانیت اسلامی فرقہ ہے یا نہیں؟

بے شک قادیانیوں کے افکار و آراء مسلمانوں کے اجماعی عقائد کے خلاف ہیں مسلمان
عہد نبوی سے لے کر آج تک اس بات کے معتقد رہے ہیں کہ نبی کریم قصر نبوت کی آخری
اینٹ ہیں۔ آپ نے صراحت فرمایا تھا "لا نبی بعدی" (میرے بعد نبی نہیں آئیں گے)
مزید براں مرزا صاحب کے دعاوی بڑے عجیب و غریب ہیں اور ان میں تضاد پایا جاتا
ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو مسیح کہتے ہیں اور دوسری جانب مثل مسیح ہونے کا دعویٰ
کرتے ہیں۔ اس قسم کے متضاد بیانات ان کی تصانیف میں بہت ہیں اور اس پر طرہ
یہ ہے ان کی کوئی دلیل ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ ان کا سب سے اہم معجزہ یہ
بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قبل از وقوع کسوف سے آگاہ کر دیا۔ حالانکہ کسوف ان
بکثرت ایسا کرتے ہیں اور انہیں نبوت کا دعویٰ ہوتا ہے تو رسالت کا۔ بلکہ یہ ایک
انسانی فن ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مزید براں یہ پہلو قابل ملاحظہ ہے
کہ مرزا صاحب کے عصر و عہد سے قبل یہ فن اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا
آپ کی دعوت کا آغاز گذشتہ صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے آغاز میں ہوا
اور اس وقت یہ فن مدون ہو چکا تھا۔

مرزا صاحب کے اقوال دلائل سے موید ہیں اور نہ اسلامی اصول و مبادی سے
ہم آہنگ ہیں۔ نظر میں ان اقوال کے پیش نظر مرزا صاحب اسلامی حدود سے تجاوز
کر گئے اس لئے کہ نبی کریم ہمیں ایک جادہ روشن پر چھوڑ گئے تھے جس میں شب و روز

کریاں بال سلطان

کی کوئی پتہ نہیں۔

باقی رہا مرزا صاحب کا مجدد والی حدیث سے متشکک! تو اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ مجددین سابقین نے نبوت کا دعویٰ کیا اور نہ معجزات کا۔ پھر آپ ایک مستثنیٰ شخصیت کیونکر ہو سکتے ہیں؟

حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریبی تعلق آئمہ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے آئمہ معصوم و ملہم ہیں اور ان کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے۔ تاہم وہ یہ نہیں کہتے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے یا نہ خدا سے شرف ہم کلامی حاصل کرتے ہیں پھر حال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اللَّهُمَّ اجْمَعْ شَمْلَ الْمُسْلِمِينَ وَوَجِّدْ كَلِمَةَ الْمُؤَقِدِينَ، وَوَقِّفْهُمْ
بِالْحِجْرَةِ وَالْكَرَامَةِ وَالْحَقِّ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ۔



حاکسار مترجم

غلام احمد حریری

ایم۔ اے عربی (J) ایم۔ اے علوم اسلامیہ (I)

ایم۔ او۔ ایل (عربی)

فاضل السنہ شرقیہ

پروفیسر و صدر شعبہ اسلامیات

اسلامیہ کالج لائل پور

۹ محرم الحرام ۱۳۸۲ھ

۲۲ مئی ۱۹۶۳ء

ڈی۔ ۶۱۔ پیپلز کالونی

لائل پور

بمعنا لڑکی تینوں کا فر کافر انہر

تر آہو آہو کہو

سوانح الصحابة

اردو عکسی

— تالیف: —

رئیس التبلیغ حضرت مولانا محمد اویس صاحب کاندھلوی ^{ظلہ}

— ترجمہ: —

حضرت مولانا محمد عثمان خاں صاحب فیض آبادی ^{ظلہ}

حضرات صحابہ کرام کی دعوتِ اسلام کیلئے محنت و جدوجہد ان کے ہر گوشانہ
مجاہدات، مخصوص صفات و کمالات، پاکیزہ حالات و واقعات فقر و صبر
زید و قناعت اور ایمان و یقین سے متعلق احادیث و قصص کا وہ دلکش مجموعہ جس کے
پڑھنے سے عید رسالت و خلافت راشدہ کے چلتے پھرتے عملی نمونے دل و دماغ میں

سما جائے ہیں اس کی درس و تدریس حالات حاضرہ میں بجد ضروری ہے ترجمہ
علمائے حقانی کا پسندیدہ لفظی و معنوی خصوصیات کے ساتھ یا محاورہ عام فہم

کتابت و کاغذ عمدہ، طباعت عکسی بذریعہ آفسٹ مشین سائز ۱۸ × ۲۲

حصہ اول، دوم، سوم، خوشنما مطبوعہ ریگزیں مجلیہ بجا .. ۱۰

حصہ چہارم، پنجم، ششم، ہفتم خوشنما مطبوعہ ریگزیں مجلیہ بجا .. ۱۲

لاہور بازار لاہور اردو بازار لاہور
کارخانہ بازار لاہور

اسلامی مذاہب

(المذاهب الإسلامية)

DATA ENTERED

تصنیف

ابوزھرہ مصری

ترجمہ

غلام احمد حیرانی ایم۔ اے

ملک برادرزاد پبلسٹیز لائل پور
پاکستان

فون: ۲۳۷۵